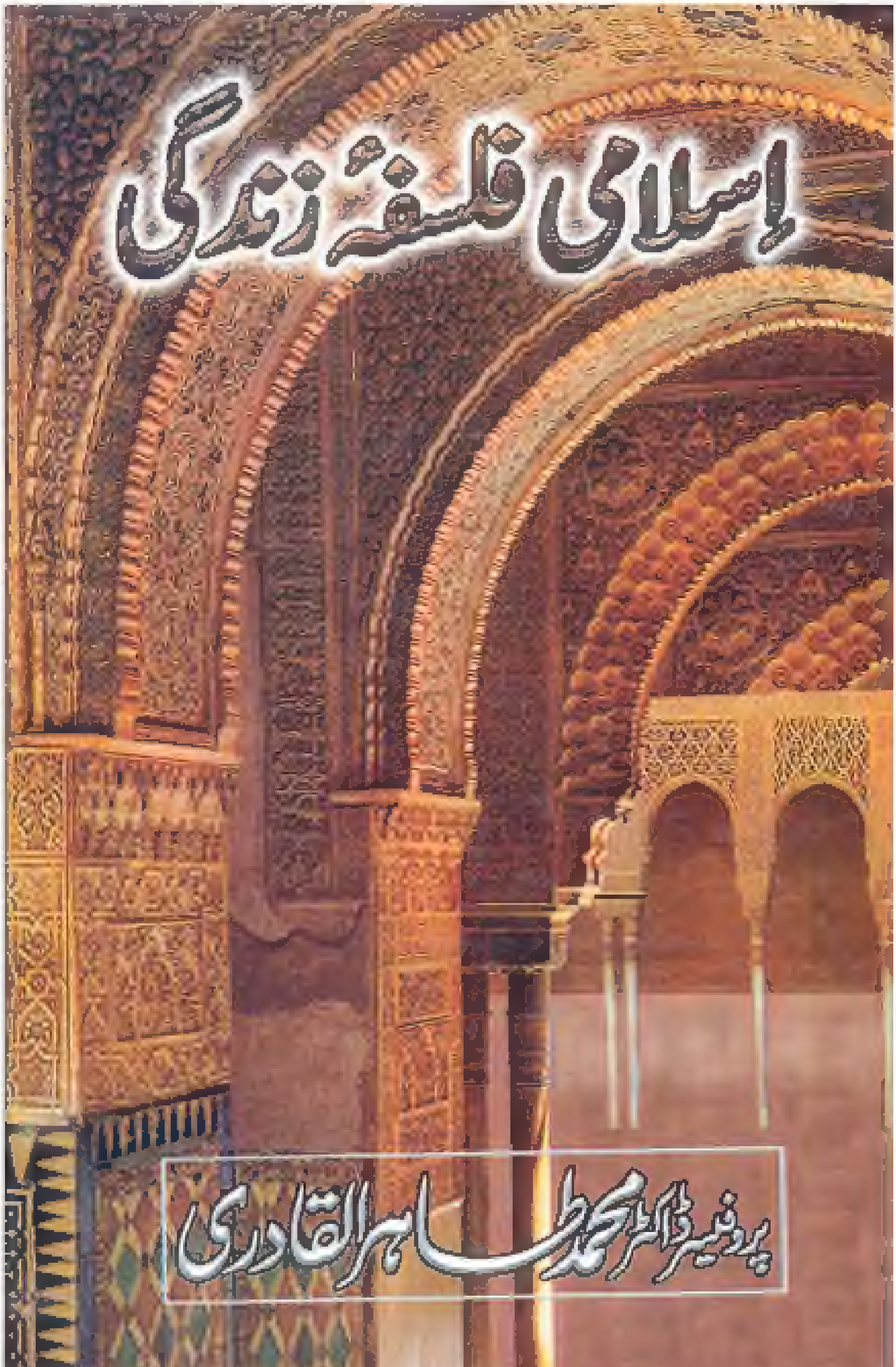
اسلامی فلسفہ زندگی
پروفیسر ڈاکٹر محمد طاہر القادری

قرآن و سُنّت کے عظیم انقلابی فکر پر مبنی

# اِسلامی فلسفۂ زندگی

شیخ الاسلام ڈاکٹر محمد طاہر القادری

منہاجُ القرآن پبلیکیشنز

365-ایم، ماڈل ٹاؤن لاہور، فون: 5168514، 3-5169111

یوسف مارکیٹ، غزنی سٹریٹ، اُردو بازار، لاہور، فون: 7237695

www.Minhaj.org - www.Minhaj.biz

بسم اللہ الرحمن الرحیم

مولای صل وسلم دائما ابدا
علی حبیبک خیر الخلق کلہم
محمد سید الکونین والثقلین
والفریقین من عرب ومن عجم

صلی اللہ تعالیٰ علیہ وعلیٰ آلہ واصحابہ وبارک وسلم

جملہ حقوق بحق تحریک منہاج القرآن محفوظ ہیں


| | | |
|---|---|---|
| نام کتاب | : | اسلامی فلسفہ زندگی |
| تصنیف | : | شیخ الاسلام ڈاکٹر محمد طاہر القادری |
| مطبع | : | منہاج القرآن پرنٹرز، لاہور |
| اشاعت اول تا چہاردہم | : | 15,500 |
| اشاعت پانزدہم | : | جون 2008ء |
| تعداد | : | 1,100 |
| قیمت امپورٹڈ پیپر | : | -/260 روپے |

ISBN # 969-32-0345-3


نوٹ: شیخ الاسلام ڈاکٹر محمد طاہر القادری کی تمام تصانیف اور خطبات و لیکچرز کے آڈیو / ویڈیو کیسٹس، CDs اور DVDs سے حاصل ہونے والی جملہ آمدنی اُن کی طرف سے ہمیشہ کے لئے تحریک منہاج القرآن کے لئے وقف ہے۔

(ڈائریکٹر منہاج القرآن پبلیکیشنز)

fmri@research.com.pk

# فہرست مضامین


| نمبر شمار | عنوانات | صفحہ |
|---|---|---|
| | **باب اوّل** | |
| ۱۔ | **انسانی زندگی اور قرآنی ہدایت** | ۱۳ |
| | ہدایت کے مدارج ثلاثہ | ۱۷ |
| | لفظ صراط استعمال کرنے کی حکمت | ۲۰ |
| | قرآنی علم اور دیگر علمی نظریات میں امتیاز | ۲۳ |
| | قرآنی ہدایت اور مقصد خلق | ۲۶ |
| ۲۔ | **باب دوم** | |
| | **انفرادی زندگی کا نصب العین، اخلاقی کمال** | ۳۱ |
| | ایک شبہ کا ازالہ | ۳۳ |
| | عبادت کا صحیح تصور | ۳۶ |
| | اخلاقی کمال کی اعلیٰ ترین صورت رضائے الٰہی کا حصول ہے | ۳۹ |
| | قرآن اور رضائے الٰہی کا نصب العین | ۴۰ |
| | اہلِ حق کا ہر عمل محض رضائے الٰہی کی خاطر ہوتا ہے | ۴۳ |
| | رضائے الٰہی کی خاطر مباح بدعت بھی عند اللہ مقبول ہوتی ہے۔ | ۴۴ |

| صفحہ | عنوانات | نمبر شمار |
|---|---|---|
| ۴۶ | تصورِ بدعت سے متعلق دو اہم امور | |
| ۴۸ | اہلِ حق کی دوستی اور عداوت کا معیار بھی رضائے الٰہی کا نصب العین ہوتا ہے | |
| ۵۰ | مقصدِ حق میں اتر جائے تو بندہ مقصودِ خلائق بن جاتا ہے۔ | |
| ۵۲ | خلاصۂ کلام | |
| | باب سوم | ۳۔ |
| ۵۷ | حصولِ نصب العین کا محرک | |
| ۶۰ | محرک، تزکیۂ نفس کی آرزو | |
| ۶۱ | تزکیہ کا قرآنی مفہوم | |
| ۶۳ | عملِ تزکیہ کی تشکیل | |
| ۶۵ | عملِ تزکیہ کی تحریک کس طرح ہوتی ہے؟ | |
| ۶۵ | فطرتِ انسانی کا تضاد اور اس کی نوعیت | |
| ۶۶ | فطرت بالقوۃ کے لوازمات | |
| ۶۶ | i۔ اقرارِ الوہیت | |
| ۶۷ | ii۔ فجور و تقویٰ کا امتیاز | |
| ۶۹ | iii۔ بصیرتِ نفس | |
| ۶۸ | iv۔ امانت کی ذمہ داری کا احساس | |
| ۷۰ | فطرت بالفعل کے لوازمات | |
| ۷۰ | تضاد کی نوعیت اور اس کا حل | |

| نمبر شمار | عنوانات | صفحہ |
|---|---|---|
| | پیغمبرانہ تربیت کا اثر | ۷۳ |
| ۴- | باب چہارم<br>حصولِ نصب العین کا طریقِ کار | ۷۷ |
| | طریقِ کار، فعلِ احسان | |
| | احسان کا مفہوم | ۷۹ |
| | حالتِ عدل | |
| | حالتِ احسان | ۸۱ |
| | عدل اور احسان کا موازنہ | ۸۳ |
| | فعلِ احسان اور احکامِ قرآنی | ۸۵ |
| | حدیثِ جبرئیل سے مفہومِ احسان کا تعین اور اس کا ثمرہ | ۸۸ |
| | انبیاء کرام علیہم السلام اور شعارِ احسان | ۹۳ |
| | ایک مغالطے کا ازالہ | ۹۷ |
| ۵- | باب پنجم<br>حصولِ نصب العین کی عملی اساس | ۱۰۱ |
| | فصلِ اول انفاق فی المال کی حقیقت | ۱۰۳ |
| | حکمِ انفاق کی دو شکلیں | ۱۰۳ |
| | انفرادی صورت | ۱۰۴ |
| | اجتماعی صورت | ۱۰۷ |

| نمبر شمار | عنوانات | نمبر شمار |
| --- | --- | --- |
| | انفاقِ واجبہ اور انفاقِ نافلہ میں امتیاز | ١٠٧ |
| | نصابِ انفاق اور حدِ انفاق کا مسئلہ | ١٠٨ |
| | احسان، نصابِ انفاق سے ماوراء ہے۔ | ١٠٩ |
| | غنائے مال اور غنائے نفس کا امتیاز | ١١٦ |
| | فصلِ دوم انفاق فی المال اور عملِ احسان | ١١٩ |
| | عملِ انفاق بنائے تزکیہ ہے | ١٢١ |
| | انفاق تزکیۂ مال کا باعث ہے | ١٢١ |
| | انفاق اجابتِ دُعا کا باعث ہے | ١٢٢ |
| | ہم دعاؤں کی عدمِ قبولیت کا شکوہ کیوں کرتے ہیں؟ | ١٢٣ |
| | انفاق تزکیۂ نفس کا باعث ہے | ١٢٧ |
| | انفاق فی المال ہی اصل نیکی اور تقویٰ ہے | ١٣٨ |
| | انفاق تصدیقِ دین، ترکِ انفاق تکذیبِ دین ہے | ١٣٤ |
| | موضوعِ متذکرہ کا سورۃ الماعون سے استدلال | ١٣٧ |
| | روحِ نماز کیا ہے؟ | ١٤٤ |
| | اصل دین داری کی قرآنی تعبیر | ١٤٦ |
| | عملِ انفاق ہی حصولِ رضائے الٰہی کی حقیقی اساس ہے | ١٤٩ |
| ٦ | **بابِ ششم** | |
| | جدّ وجہد کا نمونۂ کمال | ١٥٢ |

| صفحہ | عنوانات | نمبر شمار |
|---|---|---|
| ۱۵۵ | نمونۂ کمال کا قرآنی تصور | |
| ۱۵۹ | نمونۂ کمال اور اسوۂ انبیاء علیہم السلام وصالحین | |
| ۱۶۱ | اسوۂ مومنین وصالحین کو مثالی نمونۂ ہدایت قرار دینے کی وجہ | |
| ۱۶۳ | ذاتِ مصطفوی صلے اللہ علیہ وسلم نمونۂ کمال کا پیکر اتم | |
| ۱۶۴ | حیاتِ نبوی صلے اللہ علیہ وسلم کا نجی پہلو اور نمونۂ کمال | |
| ۱۶۷ | حیاتِ نبوی صلے اللہ علیہ وسلم کا عائلی پہلو اور نمونۂ کمال | |
| ۱۸۲ | فقرِ محمدی صلے اللہ علیہ وسلم اضطراری نہیں اختیاری تھا | |
| ۱۸۴ | حیاتِ نبوی صلے اللہ علیہ وسلم کا معاشرتی پہلو اور نمونۂ کمال | |
| ۱۸۶ | تعدّدِ ازواج کے حکم کا فلسفہ | |
| | **باب ہفتم** | ۷ |
| ۱۹۲ | **جدّوجہد کا معیارِ عمل** | |
| ۱۹۵ | حصولِ نصب العین کی جدّوجہد کا معیارِ عمل | |
| ۱۹۷ | حیاتِ صحابہ، اتباعِ نمونۂ کمال کی دلیل | |
| ۲۰۰ | اسوۂ صحابہ حصولِ کمال کا معیارِ عمل (قرآن کی روشنی میں) | |
| ۲۰۷ | صحابۂ کرام کا معیاری طرزِ عمل (حدیث کی روشنی میں) | |
| ۲۰۸ | اسوۂ صدیقی رضؓ اور معیارِ عمل | |
| ۲۱۲ | اسوۂ فاروقی رضؓ اور معیارِ عمل | |
| ۲۱۵ | اسوۂ عثمانی رضؓ اور معیارِ عمل | |

| نمبر شمار | عنوانات | صفحہ |
| --- | --- | --- |
| | اسوۂ علیؓ اور معیارِ عمل | ۲۱۶ |
| | دیگر صحابہ کا اسوہ اور معیارِ عمل | ۲۱۸ |
| ۸ | **بابِ ہشتم** | |
| | **قومی زندگی کا نصب العین** | ۲۲۵ |
| | فصلِ اوّل، انفرادی اجتماعی اور قومی زندگی کا باہمی تعلق | ۲۲۷ |
| | قرآنی ہدایت اور حیاتِ انسانی کی قومی سطح | ۲۲۸ |
| | قرآنی ہدایت اور حیاتِ انسانی کی بین الاقوامی سطح | ۲۳۱ |
| | اجتماعیت اور قومیت میں فرق | ۲۳۱ |
| | تشکیلِ قومیت کے دو مراحل | ۲۳۲ |
| | غیر سیاسی مرحلہ | |
| | سیاسی مرحلہ | |
| | تشکیلِ قومیت کا غیر سیاسی مرحلہ | |
| | اجتماعی وحدت کی بنیاد | ۲۳۲ |
| | اجتماعی شعور کی بیداری | ۲۳۳ |
| | اجتماعی جدوجہد کا عزم | ۲۳۳ |
| | تشکیلِ قومیت کا سیاسی مرحلہ | ۲۳۴ |
| | اجتماعی نصب العین کا تعین | ۲۳۵ |
| | باقاعدہ اداراتی تنظیم | ۲۳۶ |

| صفحہ | عنوانات | نمبر شمار |
| --- | --- | --- |
| ۲۲۷ | مفصل لائحہ عمل (تفصیلی پروگرام) | |
| ۲۲۹ | فصلِ دوم، قومی زندگی کا اجتماعی نصب العین | |
| ۲۴۰ | وحدتِ نسلِ انسانی اور شرف و تکریمِ انسانیت | |
| ۲۴۸ | ذاتِ مصطفوی صلے اللہ علیہ وسلم سے غیر مشروط دائمی وفاداری اور شائبۂ شرک فی النبوۃ کا انقطاع۔ | |
| ۲۵۷ | ادائیگیِ فرائض اور ادائے حقوق کا تصور | |
| ۲۶۷ | موجباتِ خوف و غم کا ازالہ | |
| ۲۷۶ | غلبۂ حق کی خاطر باطل قوتوں کے خلاف غیر مصالحانہ انقلابی جنگ | |
| | **بابِ نہم** | ۹ |
| ۲۸۳ | **قومی نصب العین کے حصول کا لائحہ عمل** | |
| ۲۸۵ | عصرِ حاضر کا المیہ | |
| ۲۸۶ | لائحہ عمل کے مسئلے پر قیادتِ وقت کی بے یقینی | |
| ۲۸۹ | انبیاء علیہم السلام پر ناکامی کا الزام | |
| ۲۹۲ | نصب العین اور لائحہ عمل کا لازم و ملزوم ہونا | |
| ۲۹۷ | قومی نصب العین کے حصول کا لائحہ عمل کیا ہے؟ | |
| ۲۹۸ | دورِ جدید کی اصلاحی تحریکات کا فکری المیہ | |
| ۳۰۰ | لائحہ عمل کا قرآنی تصور | |
| ۳۰۲ | ایک مغالطے کا ازالہ | |

| نمبر شمار | عنوانات | صفحہ |
| --- | --- | --- |
| | معیاری دین اور معمول بہ دین میں امتیاز | ۳۰۵ |
| | سیاسی انقلاب کا سماجی انقلاب پر مقدم ہونا | ۳۰۸ |
| | قومی زندگی کے اصلاح طلب پہلو | ۳۱۸ |
| | سیاسی زندگی کا بگاڑ اور اس کی اصلاح (سیاسی لائحہ عمل) | ۳۱۹ |
| | معاشی زندگی کا بگاڑ اور اس کی اصلاح (معاشی لائحہ عمل) | ۳۲۳ |
| | معاشرتی زندگی کا بگاڑ اور اس کی اصلاح (معاشرتی لائحہ عمل) | ۳۲۶ |
| | ۱- حمیۃ الجاہلیہ | |
| | ۲- ظن الجاہلیہ | |
| | ۳- تبرج الجاہلیہ | |
| | ۴- حکم الجاہلیہ | |
| ۱۰ | اشاریہ | ۳۳۶ |

١٣

باب اوّل

# انسانی زندگی اور قرآنی ہدایت

جب انسان دنیوی مشاغل سے بے نیاز ہو کر بارگاہِ ایزدی میں حاضر حالتِ نماز میں دست بستہ کھڑا ہوتا ہے تو ذاتِ حق کی حمد و ثنا اور اس سے نیاز مندانہ تعلق کے بیان کے بعد فطرتِ انسانی کی گہرائیوں سے آواز اٹھتی ہے

اِھْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ — اے رب ہمیں سیدھی راہ دکھا۔

صاف ظاہر ہے کہ کوئی بھی راہ منزل کے بغیر اپنی جگہ کسی اہمیت کی حامل نہیں ہوا کرتی، راہ کی حیثیت صرف منزل کے حوالے سے ہی متعین ہوتی ہے۔ سب سے پہلے انسان اپنی نظر میں کسی منزل کو اپنے مقصد اور نصب العین کے طور پر متعین کرتا ہے۔ پھر اس کے دل میں منزل تک پہنچنے کی آرزو پیدا ہوتی ہے جب وہ آرزو شدت اختیار کرتی ہے اور حصولِ مقصد کا شوق بے چین کرنے لگتا ہے تو وہ شخص اٹھ کھڑا ہوتا ہے اور عازمِ سفر ہو جاتا ہے۔ اس وقت اسے معیّنہ منزل تک پہنچنے کے لیے صحیح راستے کی ضرورت ہوتی ہے کیونکہ سیدھی راہ کو جانے بغیر وہ صحیح سمت میں اپنے سفر کا آغاز نہیں کر سکتا۔ جب بھی کوئی مسافر کسی سے صحیح راستہ دریافت کرتا ہے تو اس کا راستہ دریافت کرنا ہی اس بات کا ثبوت ہے کہ کوئی نہ کوئی منزل اس کے سامنے ضرور موجود ہے جس تک پہنچنا اس کا مطمحِ نظر ہے۔ یہ ممکن ہی نہیں کہ منزل اور نصب العین کے شعور کے بغیر کوئی شخص راستہ پوچھتا پھرے راستے کی تلاش ہمیشہ مقصدیت پر دلالت کرتی ہے۔ سورۃ فاتحہ کی یہ آیت جس

ہیں۔ اللہ تعالیٰ سے صحیح راستہ دکھانے کی استدعا کی گئی ہے۔ حیاتِ انسانی کی مقصدیت کی واضح نشاندہی کر رہی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اے باری تعالیٰ! ہمیں وہ راہ دکھا دے جس پر چل کر ہم اپنی زندگی کے مقصد اور نصب العین کو پاسکیں یہاں یہ نکتہ بھی قابلِ توجہ ہے کہ کیا مقصد اور منزل کے تعین کے بغیر کوئی صاحبِ عقلِ سلیم صراطِ مستقیم یعنی سیدھی کی طلب کر سکتا ہے؟ اگر منزل کا شعور اور اس کا تعین اچھی طرح واضح نہیں ہوگا تو سوال کرنے والے کے ذہن میں خود یہ اُبھاؤ پیدا ہو جائے گا کہ کون سی سیدھی راہ؟ کس مقصد کے لیے؟ اور کہاں پہنچنے کی خاطر؟ اس طرح اس کا سوال خود ایک معمہ بن جائے گا۔ قرآن ایسی غیر واضح اور مبہم بات کرنے سے پاک ہے لہٰذا "اهدنا الصراط المستقيم" کے الفاظ سب سے پہلے بارگاہِ اُلوہیت میں انسان کے ضمیر سے یہ ندا بلند کرواتے ہیں۔ اے رب العلمین! ہمیں بتا دے کہ ہماری زندگی کا مقصد کیا ہے؟ ہمارا وہ نصب العین اور منزلِ حیات کیا ہے۔ جس کے حصول کے لیے ہم زندہ ہیں اور ہمیں تگ و دو کرنے کا حکم دیا گیا ہے! جب مقصد کا شعور بیدار ہو جاتا ہے اور منزلِ حیات معین ہو کر سامنے آجاتی ہے تو انسان کے دل کی اتھاہ گہرائیوں سے پکار اٹھتی ہے۔ اے ہدایت عطا کرنے والے! اب ہمیں اس مقصد کے حصول کی سبیل اور اس منزل تک پہنچنے کا سیدھا راستہ بھی دکھا دے لیکن ہدایت کا مقصد انہی دو تقاضوں سے پورا نہیں ہو جاتا کیونکہ منزل بتا دی جائے اور سیدھی راہ بھی دکھا دی جائے تو کیا اس سے منزلِ مقصود تک پہنچ جانے کی یقینی ضمانت بھی میسر آجائے گی! ہرگز نہیں۔ کارگہِ حیات کا یہ پُرپیچ سفر بڑا پُرخطر ہے۔ کئی قوتیں انسان کو سیدھی راہ سے بھٹکانے پر لگی ہوئی ہیں۔ طاغوتی کا دشمن اسی سیدھی راہ میں انسان پر حملہ آور ہوتی ہیں۔ شیطان کا سب سے بڑا حملہ بھی صراطِ مستقیم پر ہی ہوتا ہے۔ جیسا کہ قرآنِ مجید خود شاہد ہے۔ ابلیس نے بارگہِ اُلوہیت

میں قسم کھا کر کہا :-

لَاَقْعُدَنَّ لَهُمْ صِرَاطَكَ الْمُسْتَقِيْمَ (الاعراف : ۱۶) — میں ضرور بالضرور لوگوں کو گمراہ کرنے کے لیے تیری سیدھی راہ میں تاک لگا کر بیٹھوں گا۔

اس لیے عین ممکن ہے کہ کوئی شخص منزل اور صحیح راستے کی خبر پا کر سفر پر نکلے، لیکن راستے ہی بہک جائے اور باوجود پوری تگ و دو کے منزل مقصود تک نہ پہنچ سکے۔ بدیں وجہ انسان کو یہ ضرورت محسوس ہوتی ہے کہ اسے سیدھی راہ کی ہدایت کے علاوہ منزل مقصود تک خیر و عافیت سے پہنچ جانے کی ضمانت بھی مہیا کی جائے تاکہ راستے میں لٹے بغیر امن و اطمینان کے ساتھ وہ اپنی منزل کو پا سکے۔ یہ انسانی ضمیر کی تیسری آواز ہے جو اهدنا الصراط المستقیم کے روپ میں اس کی زبان سے بلند ہوتی ہے۔

## ہدایت کے مدارجِ ثلاثہ

مذکورہ بالا یہی تین تقاضے ہدایت کے مدارجِ ثلاثہ کہلاتے ہیں جنہیں اصطلاحی زبان میں یوں بیان کیا جا سکتا ہے :-

۱- عرفان الغایہ (مقصد اور نصب العین کا شعور اور معرفت)

۲- ارائۃ الطریق (صحیح راستہ دکھانا جس کے ذریعے منزل تک پہنچنا ممکن ہو)

۳- ایصال الی المطلوب (منزلِ مقصود تک پہنچا دینا تاکہ گمراہی کا کوئی امکان باقی نہ رہے)

ان کی تفصیل "لفظِ قرآن کے دوسرے مادۂ اشتقاق" کے ضمن میں ہدایت

کے قرآنی مفہوم کے عنوان کے تحت گزر چکی ہے۔ اس سلسلے میں "مقدمہ" ملاحظہ فرمائیں سورۂ فاتحہ کی زیرِ مطالعہ آیت انہی تین تقاضوں پر روشنی ڈالتی ہے۔

گویا یہ آیت حیاتِ انسانی کے مقصد اور نصب العین کے شعور سے لے کر اس کے حصول کی حتمی ضمانت تک رہنمائی کر رہی ہے۔ ان تین مدارج کو سامنے رکھتے ہوئے آیت کے الفاظ پر دوبارہ غور فرمائیں تو حقیقتِ حال منکشف ہو جائے گی۔ یہ آیت بھی تین ہی حصوں پر مشتمل ہے۔ اھدنا، الصراط، المستقیم

● **اھدنا** ـــــ کی پکار کے ذریعے انسان بارگاہِ ایزدی سے "شعوری ہدایت" طلب کرتا ہے۔ وہ اپنے خالق و مالک سے ایسا شعور مانگتا ہے۔ جس کے باعث اسے اپنی منزل کی خبر ہو سکے۔ گویا وہ زبان سے اس امر کا اعتراف کر رہا ہے کہ اے شعور عطا کرنے والے! میں بے خبری، جہالت اور ظلمت و تاریکی کے راستوں میں بھٹک رہا ہوں۔ میں اپنی منزلِ حیات سے بے خبر ہوں۔ مجھے اپنے مقصدِ تخلیق کا کوئی علم نہیں۔ میں نہیں جانتا کہ تو کیا چاہتا ہے۔ مجھے وہ ہدایت اور معرفت عطا کر دے جس سے میں اپنی زندگی کے نصب العین کو جان سکوں۔ مجھے اپنی منزلِ حیات کا شعور اور اس کا تعین عطا کر دے۔ مجھے اپنی غایتِ تخلیق اور مقصدِ زیست سے آگاہ کر دے۔ صدقِ دل سے نکلنے والی اس پکار پر ہدایتِ حق متوجہ ہوتی ہے اور انسان کو "شعورِ مقصد" عطا کر دیتی ہے۔ اس کے بعد ایک نئی طلب جنم لیتی ہے اور وہ ہے راستے کے تعین کی ضرورت۔

● **الصراط** ـــــ کی پکار کے ذریعے انسان بارگاہِ ایزدی سے "راستے کے تعین کی ہدایت" طلب کرتا ہے۔ اب وہ اپنے خالق و مالک سے ایسی رہنمائی مانگتا ہے۔ جس کے باعث اسے منزل تک پہنچانے والے راستے کی خبر ہو سکے۔ گویا وہ رب ذوالعطا سے یہ التجا کر رہا ہے کہ اے راستہ دکھانے والے! مجھے معلوم نہیں کونسا

راستہ اس منزل کو پانے کے لیے صحیح ہے اور کونسا غلط۔ مجھے اپنی رحمت سے سیدھی راہ کی ہدایت عطا کر دے۔ میرے لیے اس راہ کو متعین کر دے جس پر چل کر میں اپنی منزلِ حیات کو پا سکوں۔ صدقِ دل سے اٹھنے والی اس پکار پر ہدایتِ حق متوجہ ہوتی ہے اور انسان کو صحیح راستے کے تعین کی توفیق سے نواز دیتی ہے۔ اس کے بعد ایک اور طلب دامن گیر ہو جاتی ہے اور وہ ہے حصولِ مقصد کی ضمانت۔

● **المستقیم** ——— کی پکار کے ذریعے انسان بارگاہِ ایزدی سے استقامت اور حصولِ مقصد کی ضمانت" طلب کرتا ہے۔ اب وہ اپنے خالق و مالک سے اس امر کی یقین دہانی مانگتا ہے کہ وہ صحیح راستے پر استقامت کے ساتھ گامزن رہ سکے۔ کیونکہ استقامت ہی منزلِ مقصود تک پہنچنے کی اصل ضمانت ہے۔ گویا وہ یہ دعا کر رہا ہے کہ اے کامیابی عطا کرنے والے! مجھے دولتِ استقامت سے نواز دے تاکہ میں بالیقین اپنی منزل کو پا سکوں۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ میں صحیح راہ پر چلتے چلتے بھٹک جاؤں اور پھر منزل کا سراغ نہ مل سکے۔ اس لیے مجھے وہ راہ بتا دے جو محفوظ و مامون ہو۔ جس پر راہزن مسافروں کو نہ لوٹ سکیں۔ جس پر شیطان تیرے بندوں کو بہکا نہ سکے اور جس پر چلنے سے ایسی استقامت نصیب ہو کہ مقصد حاصل ہو کر رہے۔ جب یہ ندا دل کی گہرائیوں سے نکلتی ہے تو ہدایتِ حق متوجہ ہو کر انسان کو حفاظت اور استقامت کا مژدۂ جانفزا سنا دیتی ہے اور ارشاد ہوتا ہے :-

" اگر حفاظت و استقامت کے ساتھ منزلِ مقصود تک پہنچنے کی ضمانت چاہتے ہو تو آؤ۔ میرے انعام یافتہ بندوں کے ہمسفر بن جاؤ۔ ان کی معیت و رفاقت اختیار کر لو۔ کیونکہ ان پر نہ کبھی میرا غضب ہوا ہے اور نہ وہ کبھی راہِ ہدایت سے بھٹکے ہیں۔

| | |
|---|---|
| صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ ۙ۬ غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّيْنَ ۝ (الفاتحہ - ۷) | (یہ حفاظت و استقامت کا راستہ) ان لوگوں کا راستہ ہے جن پر تو نے انعام فرمایا۔ نہ ان پر کبھی تیرا غضب ہوا اور نہ وہ کبھی گمراہ ہوئے ۔" |

اس لیے جو طالبِ ہدایت ان مقبولانِ خدا کا ہمسفر ہو جائے گا۔ وہ اپنے مقصدِ حیات میں کامران ہوگا۔ اسے منزلِ مقصود مل کر رہے گی۔ اسے راستے میں کوئی بہکا نہ سکے گا۔ کیونکہ شیطان خود ان لفظوں میں اپنی عاجزی اور بے بسی کا اعتراف کر چکا ہے۔

| | |
|---|---|
| لَاُغْوِيَنَّهُمْ اَجْمَعِيْنَ ۝ اِلَّا عِبَادَكَ مِنْهُمُ الْمُخْلَصِيْنَ (الحجر: ۳۹، ص: ۸۳) | میں ضرور بالضرور تمام لوگوں کو گمراہ کر کے رہوں گا۔ سوائے تیرے ان بندوں کے جو چُنے ہوئے اور برگزیدہ ہیں |

لہٰذا سورۃ فاتحہ نے حیاتِ انسانی کی مقصدیت کو اتنے جامع انداز سے بیان کیا کہ نصب العین کے تعین سے لے کر حفاظت و استقامت کے ساتھ منزلِ مقصود تک پہنچا دینے کی ضمانت تک مہیا کر دی ۔

## لفظِ صراط استعمال کرنے کی حکمت

یہاں یہ سوال ذہن میں پیدا ہو سکتا ہے کہ ہدایت کا آغاز تو شعورِ مقصد سے ہوتا ہے اور نصب العین کے تعین کے بغیر ہدایت اور راہنمائی کا کوئی مفہوم بھی باقی نہیں رہتا۔ لیکن اس آیت میں صراط یعنی راستے کی ہدایت کو نمایاں انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ حالانکہ یہ دوسرا مرحلہ ہے۔ اس کے بجائے مقصد کے شعور اور نصب العین کی ہدایت کو اس قدر واضح انداز میں کیوں نہیں بیان کیا گیا جو کہ ہدایت کا پہلا مرحلہ اور طلب کا تقاضائے اولین تھا۔ چاہیے تو یہ تھا کہ جب

چیز کی ضرورت انسان کو سب سے پہلے تھی۔ اسی کی ہدایت کو نمایاں انداز سے طلب کیا جاتا۔ لیکن یہاں دوسری ضرورت یعنی راستے کے تعین کو زیادہ واضح کیا گیا اور پہلی ضرورت یعنی منزل کے شعور اور تعین کو قدرے مخفی رکھا گیا۔ اس کی حکمت یہ ہے کہ اگر کوئی شخص کسی سے منزل اور مقصدِ حیات کی رہنمائی طلب کرے تو اس سے اتنا تو ثابت ہوتا ہے کہ وہ اپنے نصب العین کو جاننے اور مقصدِ زیست کو پہچاننے کا آرزومند ہے۔ لیکن صرف یہ طلب اس امر پر دلالت نہیں کرتی کہ وہ اس منزل تک پہنچنے اور اس مقصد کو پانے کے لیے جدوجہد پر بھی سنجیدگی کے ساتھ آمادہ ہے۔ گویا اس سوال کی حیثیت محض علمی ہوگی عملی نہیں۔ اس کے برعکس اگر کوئی کسی سے اپنی منزل کا سیدھا راستہ دریافت کرے تو اس سے واضح طور پر یہ مترشح ہے کہ منزل تو وہ جان چکا ہے۔ اب وہ اس تک پہنچنے کی فکر میں سنجیدہ اور فکرمند ہے۔ گویا یہ سوال محض علمی نہیں بلکہ عملی حیثیت کا بھی حامل ہوگا۔ پہلے سوال کی نوعیت یہ ہوتی ہے کہ مقصد کیا ہے؟ دوسرے سوال کی نوعیت یہ ہے ـــــ کہ مقصد کو حاصل کس طرح کیا جائے؟ پہلے سوال کا انداز یہ ہوتا ـــــ کہ منزل کونسی ہے؟ دوسرے سوال کا انداز یہ ہے ـــــ کہ منزل تک پہنچا کس طرح جائے؟ پہلا سوال ـ محض حقیقت کو جاننے کی غرض سے ہوتا، دوسرا سوال ـ حقیقت کو پانے کی غرض سے ہے۔ پہلا سوال صرف ایک تصور کو معلوم کرنے کی حد تک ہوتا، دوسرا سوال۔ اس تصور کو واقعہ بنانے کی خاطر ہے۔ پہلے سوال کا موضوع علم تھا، دوسرے سوال کا موضوع عمل ہے۔

علم کی ابتدا شک سے ہوتی ہے، عمل کی یقین سے،
علم میں فکر کو بنیادی اہمیت حاصل ہے، عمل میں عزم و ارادے کو۔
علم کا تعلق توجیہہ سے ہے اور عمل کا تخلیق سے۔

● **توجیہہ** صرف تین چیزوں سے بحث کرتی ہے۔

۱۔ تجزیہ و تحلیل ——— کسی شے کے اجزائے ترکیبی کو معلوم کرنا۔

۲۔ تنظیم ——— اس شے کی ماہیت اور ہیئتِ کذائیہ کو اس کے منظّم مدلول یعنی معنی اور اطلاق کی صورت میں جاننا۔

۳۔ تعلیل ——— اس شے کی علت اور مقصد کو دریافت کرنا۔

● لیکن **تخلیق** تجربی توثیق سے منتزع ہونے والے مشاہداتی اور معروضی نتائج سے بحث کرتی ہے۔ گویا پہلے سوال کے ذریعے مطلوبہ حقیقت کو جان کر زیادہ سے زیادہ اس کی توجیہہ تک رسائی حاصل کی جاسکتی تھی۔ جب کہ دوسرے سوال کے ذریعے مطلوبہ حقیقت کو پا کر اس سے حاصل ہونے والے فوائد و ثمرات سے بھی متمتع ہوا جا سکتا ہے۔

اس لیے اگر سورۂ فاتحہ کی یہ آیت "مقصد دریافت کرنے کی التجا پر مشتمل ہوتی تو اس سے **علم** کی ضمانت تو میسر آتی **عمل** کی نہیں۔ قرآنِ حکیم نے راستہ اور طریقِ کار دریافت کرنے کی التجا کا ذکر کر کے انسانوں کو اس طرف متوجہ کر دیا کہ:

**اِسلام** محض فکر کا نام نہیں، عزم و ارادے کا نام ہے۔

**اِسلام** محض علم کا نہیں، عمل کا نام ہے۔

**اِسلام** محض تبلیغ کا نہیں، تعمیل کا نام ہے۔

**اِسلام** محض توجیہہ کا نہیں، تخلیق کا نام ہے۔

**اِسلام** محض مقصدِ حیات کو جاننے کا نہیں، اس کو پانے کا نام ہے اور اسلام محض فلسفیانہ موشگافیوں کا نہیں بلکہ عملی جدوجہد کے ذریعے نتائج پیدا کرنے کا نام ہے ع

یہ شہادت گہِ الفت میں قدم رکھنا ہے    لوگ آسان سمجھتے ہیں مسلماں ہونا

یہی وہ نکتہ ہے جہاں قرآنی علم اپنی ماہیت، مقصدیت اور افادیت کے اعتبار سے دیگر علمی اور فلسفیانہ نظریات سے ممتاز نظر آتا ہے۔ قرآنی علم و ہدایت کی اس مخصوص جہت اور افادیت و مقصدیت کو اُجاگر کرنے کے لیے سورۃ فاتحہ میں لفظ صراط استعمال کیا گیا تاکہ یہ واضح ہو جائے کہ قرآن بندوں کو محض نظری و فکری ہدایت کا طالب ہی نہیں بلکہ عملی ہدایت کا طالب بنانا چاہتا ہے اور انسان کو مقصدِ حیات کی معرفت کے بعد اس کو حاصل کرنے کی فیصلہ کن جدوجہد کی راہ پر گامزن کرنا چاہتا ہے۔

## قرآنی علم اور دیگر علمی نظریات میں امتیاز

قرآنی علم اور دیگر فلسفیانہ نظریات میں کئی اعتبارات سے امتیاز موجود ہے۔ جن کو بعد میں کسی مناسب موقع پر بیان کیا جائے گا۔ اس وقت چونکہ ہمارے پیشِ نظر صرف "مقصدیت" کا پہلو ہے۔ اس لیے یہاں صرف اسی اعتبار سے مذکورہ فرق کو بیان کیا جاتا ہے۔ اھدنا الصراط المستقیم کے اسلوب کی متذکرہ بالا توضیح اور لفظِ "صراط" کے استعمال کی حکمت کے بیان سے یہ حقیقت تو اچھی طرح ذہن نشین ہو چکی ہو گی کہ قرآنی علم کا مقصد شعبہ ہائے حیات میں اس کے نصب العین اور منزلِ مقصود سے صرف آگاہ کر دینا ہی نہیں بلکہ اس کے حصول کی ایسی عملی صورت بھی واضح کر دینا ہے۔ جس میں معروضی نتائج کے میسّر آنے کی حتمی و قطعی ضمانت ہو۔ اب ہم اس لحاظ سے دیگر علمی نظریات کے ساتھ قرآنی علم کا مختصر سا موازنہ پیش کرتے ہیں۔

- **اخلاقیات** میں تمام علمی اور فلسفیانہ نظریات اس طرح بحث کرتے ہیں کہ اخلاق کی ماہیت کیا ہے؟ فضائلِ اخلاق کیا ہیں؟ معیارِ اخلاق کی صحت کی منطقی

اساس کیا ہے؟ اور اس کے کمال کے تقاضے کیا ہیں؟

لیکن **قرآنی علوم** ان تمام سوالات کا حتمی جواب دینے کے بعد اس امر سے بحث کرتا ہے کہ مطلوبہ معیارِ اخلاق کے مطابق انسان کی عملی زندگی کیسے ڈھلے گی؟ اور فضائل و اخلاق حیاتِ انسانی میں واقعہ بن کر کس طرح تبدیلی پیدا کریں گے؟ اس مسئلے پر قرآن و سنت کے سوا دنیا کے تمام فلسفے خاموش ہیں۔

- **عمرانیات** میں تمام علمی نظریات اس طرح بحث کرتے ہیں کہ — معاشرہ کیا ہے؟ کیونکر وجود میں آتا ہے؟ اور اس کے انضباط و اختلال کے اسباب کیا ہیں؟

لیکن **قرآنی علوم** ان مسائل سے آگے بڑھتے ہوئے اس امر سے بحث کرتا ہے کہ معاشرے میں پیدا ہونے والے ہر قسم کے اختلال کو رفع کر کے ہیئتِ عمرانی کو ایک ایسی مؤثر وحدت میں کس طرح بدلا جا سکتا ہے جو افتراق و انتشار کے تمام رجحانات پر قابو پا لے؟

- **سیاسیات** میں تمام علمی نظریات اس طرح بحث کرتے ہیں کہ ریاست کیا ہے؟ اس کے اجزائے ترکیبی کیا ہیں؟ اس کے اجزاء کی ماہیت اور ان کا وظیفۂ عمل کیا ہیں؟

لیکن **قرآنی علوم** ان مسائل سے آگے بڑھتے ہوئے اس امر سے بحث کرتا ہے کہ حاکم و محکوم کے درمیان پیدا ہونے والے سیاسی تناقض کو رفع کر کے اس قومی نصب العین کو کس طرح حاصل کیا جائے جس کے نتیجے میں پورا معاشرہ ہر قسم کے اندرونی و بیرونی موجباتِ خوف و غم سے محفوظ ہو جائے؟

- **معاشیات** میں تمام علمی نظریات اس طرح بحث کرتے ہیں کہ معاشی تخلیق کا عمل کیا ہے؟ دولت کی تقسیم اور اس کے صرف کا عمل کس طرح واقع ہوتا

ہے ؟ اور دولت اور محنت کا باہمی توازن کیا ہے ؟

لیکن **قرآنی علم** مسئلے کی اس جہت پر بحث کرتا ہے کہ معاشی تخلیق کو مزعومہ مفادات سے پاک رکھنے اور وسائلِ دولت پر محیط دگرد ہوں کی اجارہ داری ختم کرکے تقسیم دولت کے ایسے منصفانہ نظام کو کس طرح رائج کیا جائے کہ کسی فرد کی تخلیقی جدوجہد میں معاشی تعطل باقی نہ رہے اور فرد و معاشرہ دونوں کسی سطح پر بھی حاجتمندی کا شکار نہ ہونے پائیں ؟

- **مذہبیات** میں تمام علمی نظریات اس طرح بحث کرتے ہیں کہ عقیدہ کیا ہے ؟ اعمالِ صالحہ کیا ہیں ؟ پسندیدہ اور ناپسندیدہ عقائد و اعمال میں کیا فرق ہے ؟ اور ہر دو کے نتائج و اثرات کیا ہیں ؟

لیکن **قرآنی علم** ان مسائل کا حتمی جواب مہیا کرنے کے بعد اس امر سے بحث کرتا ہے کہ اگر عقائد، اوہام میں اور اعمال، مُردہ رسوم میں بدل چکے ہوں اور ان کے درمیان کوئی مؤثر تعلق باقی نہ رہا ہو تو انہیں پھر کس طرح سے زندہ کیا جائے کہ عقیدہ و عمل کا تعلق بحال ہوکر انسانوں کی سماجی زندگی میں مطلوبہ انقلاب بپا کرسکے ؟

متذکرہ بالا موازنے سے یہ حقیقت اظہر من الشمس ہو چکی ہے کہ تمام علمی اور فلسفیانہ نظریات میں شروع سے آج تک سوچ کا رُخ یہی رہا ہے کہ ـــ مسئلے کی نوعیت کیا ہے ؟ لیکن قرآنی علم مسئلے کی نوعیت متعین کرنے کے بعد ہمیشہ سوچ کو یہ رُخ عطا کرتا ہے کہ ـــ مسئلے کا حل کس طرح میسّر آئے۔ قرآن صرف حقیقت کی ماہیت سے نہیں بلکہ اس تک رسائی کے طریق کار سے بحث کرتا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ جب سورۃ فاتحہ کے ذریعے بنی نوع انسان کو زندگی کے مقصد سے آشنا کرایا گیا تو بجائے اس کے کہ انسان کی زبان پر یہ سوال وارد کیا جاتا کہ "ہماری زندگی کا مقصد اور نصب العین کیا ہے ؟" انسان کو سراپا سوال بنا کر

بارگاہِ ایزدی میں کھڑا کر دیا گیا اور اسے یہ سوال کرنے کی تلقین کی گئی کہ ہماری زندگی کے نصب العین تک پہنچنے کا صحیح راستہ کیا ہے ؟" لہٰذا یہ آیت سوال کے ذریعے انسان کو محض مسئلے کی نوعیت کے بارے میں نہیں بلکہ اس کے حل کے بارے میں ہدایت طلب کرنے کی تلقین کر رہی ہے ۔ کیونکہ فکری ہدایت ' عملی ہدایت کے بغیر بے سود اور ناکافی ہے ۔

## قرآنی ہدایت اور مقصدِ خلق

مذکورہ بالا وضاحت کی روشنی میں اب ہم قرآنی ہدایت کے ذریعے انسانی زندگی کا وہ نصب العین تلاش کرتے ہیں جس کی خاطر انسان کو پیدا کیا گیا اور جس کے لیے اسے اپنے عرصۂ حیات میں جدوجہد کرنے کا حکم صادر کیا گیا ہے ۔ قرآن اپنی نسبت سراسر ہدایت ہونے کا دعویٰ کرتا ہے ۔ اس سلسلے میں ارشادِ ربانی ملاحظہ فرمایئے :۔

هٰذَا بَيَانٌ لِّلنَّاسِ وَهُدًى وَّمَوْعِظَةٌ لِّلْمُتَّقِيْنَ (آلِ عمران : ۱۳۸)

یہ قرآن بنی نوعِ انسان کے لیے واضح ارشاد و ہدایت ہے اور متقین کے لیے سراسر موعظت و نصیحت ۔

اس لیے اس مقدس کتاب کا کام ہی یہ ہے کہ انسانیت کو ظلمتوں اور گمراہی کی تاریکی سے نکال کر رشد و ہدایت کے اُجالے سے ہمکنار کر دے جیسا کہ خود ارشادِ الٰہی ہے :۔

الٓرٰ ۚ كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ اِلَيْكَ لِتُخْرِجَ النَّاسَ مِنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ (ابراہیم : ۱)

الٓر ۔ اے رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہم نے یہ کتاب آپ پر نازل کی اس لیے کی ہے کہ آپ انسانوں کو تاریکیوں سے

نکال کر اُجالے تک پہنچا دیں۔

منزلِ حیات اور نصب العین سے بے خبری بھی تاریکی ہے اور منزل کے صحیح راستے سے بے خبری بھی تاریکی ہے۔ لہٰذا نسلِ انسانی جہاں جہاں جس جس قسم کی گمراہی اور تاریکی میں مبتلا تھی۔ قرآن نے اسے اس قسم کی ہدایت سے سرفراز کردیا۔ ارشادِ باری تعالےٰ ہے :۔

اِنَّ هٰذَا الْقُرْاٰنَ يَهْدِىْ لِلَّتِىْ هِىَ اَقْوَمُ (الاسراء : ۹)

بیشک یہ قرآن اس راہ (اور منزل) کی رہنمائی کرتا ہے جو سب سے زیادہ سیدھی اور محفوظ ہے۔

یہاں یہ امر بھی ملحوظ رہنا چاہیے کہ انسانی زندگی کے تین درجے ہیں :۔

" انفرادی" ، "قومی" اور "بین الاقوامی"

چنانچہ ہمیں حیاتِ انسانی کی ہر سطح اور ہر درجہ پر مقصد اور نصب العین بھی قرآن سے تلاش کرنا ہوگا اور اس کے حصول کا طریق کار بھی قرآن ہی سے تلاش کرنا ہوگا۔ پس یہی وہ مدعا ہے جو اهدنا الصراط المستقیم کے ذریعے ہم ہر نماز کے دوران بارگاہِ اُلوہیت میں دست بستہ پیش کرتے ہیں۔ اگر بنظر غائر جائزہ لیا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ کائناتِ ہستی اور اس کا ایک ایک وجود بلاشک وشبہ بامقصد تخلیق کیا گیا ہے۔ موجوداتِ عالم کا کوئی ذرّہ ایسا نہیں جس کی خلق عبث اور بے مقصد ہو۔ خود قرآنِ حکیم اس حقیقت کی شہادت یوں مہیا کرتا ہے:۔

وَيَتَفَكَّرُوْنَ فِىْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۚ رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا (آلِ عمران : ۱۹۱)

اور وہ آسمانوں اور زمین کی تخلیق میں غور وفکر کرتے ہیں (اور بالآخر پکار اُٹھتے ہیں) اے ہمارے پروردگار! اس ساری کائنات کا کوئی حصہ بھی

تو نے بے مقصد پیدا نہیں کیا۔

یہاں بامقصد تخلیق کا یہ اعتراف تو انسان کی زبان سے کروایا گیا۔ اب اس طرح باری تعالےٰ خود اعلان فرماتے ہیں:۔

وَمَا خَلَقْنَا السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا لٰعِبِيْنَ ○ مَا خَلَقْنٰهُمَآ اِلَّا بِالْحَقِّ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ

(الدخان ۳۸، ۳۹)

اور ہم نے آسمانوں اور زمین کو اور جو کچھ ان کے درمیان ہے۔ محض بے مقصد اور اتفاقیہ نہیں بنایا بلکہ ہم نے تو انہیں مخصوص حکمت و مقصد کے تحت بنایا ہے۔ لیکن اکثر لوگ اس حقیقت سے بے خبر ہیں

جب کائناتِ ارض و سما کا ہر وجود کسی نہ کسی مقصد کے لیے پیدا کیا گیا ہے۔ بلکہ بلا مقصد تخلیق کرنا خود شانِ اُلوہیت کے ہی منافی ہے تو یہ کیونکر تسلیم کر لیا جائے کہ انسان جو اشرف المخلوقات ہے بغیر کسی مقصد اور نصب العین کے پیدا کر کے دنیا میں بھیج دیا گیا ہوگا۔ یہ امر ناقابلِ اعتبار ہے اور یقیناً قرآن میں بھی حیاتِ انسانی کو بے مقصد قرار نہیں دیا گیا۔ موت و حیات کا فلسفہ بیان کرتے ہوئے قرآن واضح کرتا ہے:۔

اَلَّذِيْ خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَيٰوةَ لِيَبْلُوَكُمْ اَيُّكُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا ۚ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْغَفُوْرُ (الملک : ۲)

وہ ذات جس نے موت اور زندگی کو پیدا کیا تاکہ تمہیں آزمائے کہ تم میں سے بہتر جدوجہد کون کرتا ہے اور وہی عزت والا، بخشنے والا ہے۔

صاف ظاہر ہے کہ عمل جدوجہد کے لیے کوئی نہ کوئی مقصد اور نصب العین درکار ہوتا ہے۔ جس کے حصول کی ترغیب دی جاتی ہے اور اس کی مطابقت یا عدم مطابقت

کے لحاظ سے جدوجہد کرنے والوں کے اعمال کا مقام متعین ہوتا ہے کہ آیا وہ شخص کامیاب رہا یا ناکام، اس نے بہتر کارکردگی کا مظاہرہ کیا یا نہیں۔ قرآن کے مطابق زندگی مقصد کے حصول کی جدوجہد سے عبارت ہے اور موت اس کے اُخروی انجام و نتائج سے، اس لیے انسانی زندگی کا بامقصد ہونا خود نظامِ کائنات کے جواز کی بنیادی دلیل ہے۔

باب دوم

# انفرادی زندگی کا نصب العین

جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے کہ حیاتِ انسانی کی کائنات کا پہلا مرحلہ انسان کی انفرادی زندگی ہے۔ قرآنِ حکیم کے عمیق مطالعہ سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ انسان کی انفرادی زندگی کا مقصد اور نصب العین "اخلاقِ کمال کا حصول" ہے۔ اس سلسلے میں یہ آیت بنیادی اہمیت کی حامل ہے۔

| | |
|---|---|
| وَذَكِّرْ فَإِنَّ الذِّكْرَىٰ تَنفَعُ الْمُؤْمِنِينَ ۝ وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنسَ إِلَّا لِيَعْبُدُونِ ۝ مَا أُرِيدُ مِنْهُم مِّن رِّزْقٍ وَمَا أُرِيدُ أَن يُطْعِمُونِ (الذاریات: ۵۵، ۵۶، ۵۷) | آپ نصیحت کریں کہ یہ نصیحت مسلمانوں کو فائدہ دے گی اور (وہ یہ کہ) میں نے جن اور آدمی صرف اس لیے پیدا کیے ہیں کہ وہ میری بندگی کریں۔ ورنہ میں ان کی (کمائی میں) سے کوئی رزق نہیں مانگتا اور نہ ہی یہ چاہتا ہوں کہ وہ مجھے کھانا کھلائیں۔ |

اس آیت نے بڑی صراحت کے ساتھ انسانی زندگی کا مقصد اور اس کی غرضِ تخلیق بیان کردی کہ انسانوں کو پیدا کرنا اللہ تعالیٰ کی کسی اپنی حاجت کے لیے نہ تھا۔ کیونکہ وہ ذات تو بے نیاز اور غنی و رازق ہے۔ باری تعالیٰ نے خود ارشاد فرمایا:

| | |
|---|---|
| إِنَّ اللَّهَ هُوَ الرَّزَّاقُ ذُو الْقُوَّةِ الْمَتِينُ (الذاریات: ۵۸) | بے شک اللہ تو خود ہی بڑا رزق عطا کرنے والا اور بڑی قوت و قدرت والا ہے |

اسے کسی لحاظ سے بھی کسی مخلوق کی کوئی حاجت اور ضرورت نہ تھی۔ اس لیے کوئی یہ نہ سمجھے کہ تخلیقِ انسانیت میں شاید باری تعالیٰ کی اپنی خلاقیت کی ضرورتِ نمود و نمائش کا دخل تھا یا اس کی کسی صفت کی تکمیل اس امر کی محتاج تھی یا اس کی اپنی ہستی و وجود خلق کی ضرورت مند تھی۔ نہیں، نہیں! اس ذات نے تمہیں پیدا کیا تو صرف اس لیے کہ تم اس کی بندگی کرکے اخلاقی کمال حاصل کر سکو۔ کیونکہ اس کی بندگی کے شعور میں تمہاری ہی منفعت ہے اور اس کی بندگی اختیار کرنے میں تمہارا ہی کمال ہے۔

اس لیے انسان کے مقصدِ تخلیق کے بیان کو قرآن نے " ذکریٰ " یعنی نصیحت کے لفظ سے تعبیر کرتے ہوئے اعلان فرمایا:۔

فَاِنَّ الذِّكْرٰى تَنْفَعُ الْمُؤْمِنِيْنَ (الذاریت ۔ ۵۵)

بیشک یہ نصیحت یعنی شعورِ بندگی مومنوں کے لیے سود مند ثابت ہوگا۔

اگر انھیں اپنے مقصدِ تخلیق کا شعور حاصل ہوگیا اور انھوں نے اسے بطور نصب العین اختیار کرلیا تو اس سے وہ باکمال ہو سکیں گے اور یہی اخلاقی کمال ان کے لیے حقیقی منفعت کا باعث ثابت ہوگا۔

## ایک شبہ کا ازالہ

آیتِ مذکورہ میں " عبادت " کے لفظ سے شاید کسی کو یہ گمان پیدا ہو کہ عبادت اور بندگی سے مراد وہی امور ہیں جنہیں عرفِ عام میں " عبادات " سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ مثلاً نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ وغیرہ اور انہی عبادات کا بجالانا انسانی زندگی کا نصب العین ہے۔ یہ تصور غلط ہے۔ کیونکہ قرآن عبادت اور بندگی کو انسانی تخلیق کا واحد مقصد قرار دے رہا ہے۔

- اگر "عبادت" سے مراد محض نماز ہو، تو وہ تو دن میں صرف پانچ وقت کے لیے فرض ہے۔ بقیہ اوقات میں نہیں۔ اس طرح یہ تصور لازم آئے گا کہ باری تعالٰی نے دن رات کے چوبیس گھنٹوں میں سے صرف چند لمحات پانچ نمازوں کے لیے مقرر کرکے انسان کو اپنے مقصد اور نصب العین کی طرف متوجہ کیا اور باقی سارا وقت اسے اصل مقصدِ تخلیق سے بے نیاز ہو کر گزارنے کے لیے چھوڑ دیا۔
- اگر عبادت سے مراد محض روزہ ہو، تو وہ تو سال میں صرف ایک ماہ کے لیے فرض ہے۔ بقیہ مہینوں میں نہیں۔ اس طرح یہ تصور لازم آئے گا کہ باری تعالٰی نے سال کے بارہ مہینوں میں سے صرف ایک ماہ کے لیے انسان کو اپنے مقصد اور نصب العین کی طرف متوجہ کیا اور باقی سارے عرصے میں اسے اصل مقصد سے صرفِ نظر کرنے کی اجازت دیدی۔
- اگر عبادت سے مراد محض زکوٰۃ ہو، تو وہ بھی سال میں صرف صاحبِ نصاب کے لیے ایک مرتبہ فرض ہے۔ اس طرح بقیہ عرصہ میں اور دیگر لوگوں کے لیے اپنے مقصدِ تخلیق کی طرف متوجہ ہونے کی کوئی صورت باقی نہ رہی۔
- اگر عبادت سے مراد محض حج ہو تو وہ بھی صاحبِ استطاعت کے لیے عمر بھر میں صرف ایک مرتبہ فرض ہے تو کیا بقیہ عمر مقصدِ حیات سے صرفِ نظر کرتے ہوئے بسر ہوگی؟

اگر ارکانِ اسلام کے علاوہ دیگر جملہ عبادات کو بھی شامل کرلیا جائے تو وہ ساری کی ساری مل کر بھی پوری زندگی کے ایک ایک لمحے پر محیط نہیں ہو سکتیں۔ انسان کھاتا پیتا بھی ہے، سوتا جاگتا ہے، شادی بیاہ بھی کرتا ہے۔ تجارت اور کاروبار بھی کرتا ہے اور دیگر ہر طرح کے معاملاتِ زندگی بھی نبھاتا ہے۔ ان تمام معاملات کو "عبادات" کے زمرے میں شامل نہیں کیا جا سکتا۔ پھر اس سارے کاروبارِ حیات کو جاری رکھتے

کا حکم بھی اسلام نے ہی دیا ہے۔ کیونکہ اسے ترک کر کے ہمہ وقت عبادت اذکار و فکر میں مشغول رہنا "رہبانیت" ہے۔ جسے نظامِ حیات کے طور پر اپنانے کی اجازت اسلام نہیں دیتا۔ اس لیے سوال پیدا ہوتا ہے کہ وہ کونسی عبادت ہے جس کو انسانی تخلیق اور اس کی حیات کا مقصد اور نصب العین قرار دیا گیا ہے جو جملہ عبادات اور معاملاتِ حیات میں یکساں طور پر انسان کے پیشِ نظر رہ سکے۔ یہاں یہ امر بھی ذہن نشین رہنا چاہیئے کہ اصل نصب العین اور مقصد وہ ہوتا ہے جو کسی حالت میں بھی نظر انداز نہ ہونے پائے۔ جو لمحہ مقصد سے بے توجہی اور بے اتفاقی میں بسر ہو، گناہ ہوتا ہے اور بارگاہِ ربوبیت میں ناپسندیدہ۔ اگر عبادت سے مراد وہی تصوّر لیا جائے جو عام مذہبی ذہن میں راسخ ہے تو اس طرح انسانی زندگی کے جائز اور مشروع معاملات بھی تضاد کا شکار ہو جائیں گے۔ کیونکہ بعض معاملات انسانی نصب العین کے مطابق ہوں گے اور بعض اس کے خلاف۔

## عبادت کا صحیح تصوّر

اس الجھاؤ اور شبہ کو رفع کرنے کی صرف یہی صورت ہے کہ "عبادتِ خداوندی" کا وہ جامع اور وسیع تصور ذہن نشین کر لیا جائے جو انسانی زندگی کے جملہ معاملات پر حاوی ہے اور جس کا تعارف خود قرآن حکیم نے ان الفاظ میں کرایا ہے۔

| | |
|---|---|
| لَيْسَ الْبِرَّ اَنْ تُوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ وَالْكِتٰبِ | نیکی یعنی اصل عبادت یہ نہیں کہ تم اپنے منہ مشرق یا مغرب کی طرف کر لو، بلکہ نیکی (اور اصل عبادت) تو یہ ہے کہ (انسان) ایمان لائے اللہ، قیامت، فرشتوں، کتابوں اور پیغمبروں پر، اور |

وَالنَّبِيِّينَ وَآتَى الْمَالَ عَلَىٰ حُبِّهِ ذَوِي الْقُرْبَىٰ وَالْيَتَامَىٰ وَالْمَسَاكِينَ وَابْنَ السَّبِيلِ وَالسَّائِلِينَ وَفِي الرِّقَابِ وَأَقَامَ الصَّلَاةَ وَآتَى الزَّكَاةَ وَالْمُوفُونَ بِعَهْدِهِمْ إِذَا عَاهَدُوا وَالصَّابِرِينَ فِي الْبَأْسَاءِ وَالضَّرَّاءِ وَحِينَ الْبَأْسِ أُولَٰئِكَ الَّذِينَ صَدَقُوا وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُتَّقُونَ

(البقرہ : ۱۷۷)

(پھر) اللہ کی محبت میں (اپنے ایمان کا ثبوت فراہم کرتے ہوئے) اپنا سرمایۂ دولت خرچ کرے۔ مستحق رشتہ داروں، یتیموں، مسکینوں، مسافروں، دیگر حاجتمند سائلوں پر اور لوگوں کو طوقِ غلامی سے آزاد کرانے پر، اور نماز قائم کرے، زکوٰۃ دے، جب وعدہ کرے تو اپنے قول کو پورا کرنے والا ہو اور صبر کرنے والا ہو مصائب و آلام میں، مشکلات و شدائد میں اور جنگ و جدال کے وقت میں یہی سچے لوگ ہیں اور یہی پرہیزگار ہیں۔

اس آیتِ مبارکہ میں عبادت اور نیکی کا اصل تصور بیان کرنے سے پہلے مروّجہ تصور کی نفی کی گئی ہے۔ اس لحاظ سے یہ تعریف جامع بھی ہے اور مانع بھی۔ عوام کے ذہنوں میں عام طور پر محدود تصور راسخ ہوتا ہے اور وہ نماز ہی طرح کی عبادات کو عبادت، نیکی اور بندگی کہتے ہیں۔ زندگی کے باقی معاملات دنیا داری تصور کیے جاتے ہیں۔ قرآن نے سب سے پہلے اس راہبانہ اور مسیحی تصورِ عبادت کو رد کر دیا کہ اگر کوئی شخص مشرق و مغرب کی جانب یعنی قبلہ رو ہو کر نماز وغیرہ پڑھنے کو ہی نیکی اور اصل عبادت سمجھتا ہے تو یہ غلط ہے۔ اسلام کے نزدیک عبادت اور نیکی کا مفہوم اس قدر محدود نہیں کہ جس کا بقیہ عملی زندگی سے کوئی تعلق نہ ہو۔ بلکہ قرآنی تصورِ عبادت اور اسلامی مفہوم بڑا اس قدر وسیع

ہے جو انسان کی فکری اور عملی زندگی کے تمام گوشوں کو محیط ہے۔ اسلام کا تصورِ بندگی یہ ہے کہ انسانی زندگی درج ذیل خصائص کی جامع ہو۔

۱۔ **صحتِ عقائد** ــــــ جس میں اللہ تعالیٰ، آخرت، فرشتوں، آسمانی کتابوں اور انبیاء و رُسل پر ایمان لانا ضروری ہے۔

۲۔ **حبِّ الٰہی** ــــــ جس کا ثبوت خلقِ خدا کے حق میں نفع بخشی، فیض رسانی اور مالی ایثار و قربانی کے ذریعے فراہم کیا جاتے۔

۳۔ **مالی ایثار** ــــــ اپنے وسائلِ دولت مستحق رشتہ داروں، یتامیٰ و مساکین، غرباء و فقراء اور غلامی و محکومی کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے انسانوں کی آزادی، معاشی بحالی اور آسودگی پر خرچ کیے جائیں۔

۴۔ **صحتِ اعمال** ــــــ نماز اور روزہ وغیرہ کے احکام کی پابندی کی جائے۔

۵۔ **ایفاءِ عہد** ــــــ انسان جو عہد اور فیصلہ کرے عزم و ہمت کے ساتھ اس پر ثابت قدم رہے۔

۶۔ **صبر و تحمّل** ــــــ مصائب و شدائد کے تمام غیر معمولی حالات میں بھی صبر و تحمل اور عزم و استقلال کے ساتھ قائم رہے۔

۷۔ **جہاد** ــــــ حق کی خاطر کسی قسم کی مخالفت و مخاصمت سے نہ گھبرائے خواہ وہ کھلی جنگ کی صورت ہی کیوں نہ ہو۔

مذکورہ بالا خصائص، اجزاء کی حیثیت رکھتے ہیں اور ان تمام اجزاء کا مجموعہ "نیکی اور اصل عبادت" ہے۔ گویا اصل عبادت اور بندگی ایک کُل (TOTALITY) کا نام ہے اور زندگی کے جملہ معاملات مذہبی ہوں یا دنیوی اس کُل کے مختلف اجزاء ہیں۔ جس طرح کسی ایک جُز کو الگ کر کے اسے کُل کا نام نہیں دیا جا سکتا۔ اسی طرح زندگی کے کسی ایک پہلو کو دوسروں سے لاتعلق کر کے کامل بندگی کا نام نہیں دیا جا سکتا۔ لہٰذا

کامل عبادت اور بندگی یہ ہے کہ انسان پوری زندگی اس طرح بسر کرے جیسے اس کے خالق و مالک کی رضا ہو۔ اگر انسان نے کچھ معاملات رضائے الٰہی کے مطابق نبھائے اور کچھ اس کے خلاف تو اسے "اخلاقی کمال" یا "کامل بندگی" سے تعبیر نہیں کیا جائے گا۔

## اخلاقی کمال کی اعلیٰ ترین صورت رضائے الٰہی کا حصول ہے

انسان کی انفرادی زندگی کا نصب العین "اخلاقی کمال" ہے اور اخلاقی کمال عبارت ہے کامل بندگی سے، جس کی اعلیٰ ترین صورت "رضائے الٰہی کا حصول" ہے۔ اس لحاظ سے نتیجۃً انسان کی انفرادی زندگی کا اصل نصب العین اور مقصد "رضائے الٰہی" قرار پاگیا یا یوں سمجھ لیجئے کہ انفرادی سطح پر انسان کا مقصدِ حیات "انسانِ مرتضیٰ" یعنی ایسا انسان بننا ہے جس پر اس کا رب راضی ہو۔

یہ نتیجہ مذکورہ بالا آیت سے ہی مُنتزع ہوجاتا ہے۔ جس میں خدا اور رسول اور آخرت پر ایمان لانے کے حکم کے بعد فرمایا گیا:۔

وَاٰتَی الْمَالَ عَلٰی حُبِّهٖ ذَوِی الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى ۔

اور انسان اللہ کی محبت میں اپنا مال رشتہ داروں، یتامی اور دیگر مستحق افراد پر خرچ کرے۔

یہاں ایمان کے بعد "ایثار" اور "عمل" کی تلقین کی گئی ہے۔ لیکن ایثار و عمل کے لیے جس چیز کو بطور محرک (INCENTIVE) بیان کیا گیا ہے۔ وہ "حُبِّ الٰہی" ہے۔ یہ حقیقت بالکل واضح اور واشگاف ہے کہ کسی کی محبت میں ایثار و قربانی، صبر آزما جدوجہد اور مصائب و شدائد کا خوشی سے برداشت کرنا محض محبوب کی رضا کی خاطر ہوتا ہے۔ آخر اور کونسا مقصد اس صبر آزما زندگی میں کارفرما ہوسکتا

ہے۔ اگر محبوب کو راضی کرنا پیشِ نظر نہ ہو تو کوئی کیونکر ایسے کو دعوت دے گا اور اپنی جان و مال کی قربانی پر آمادہ ہو گا۔

اس لیے خلاصۂ کلام یہ ہوا کہ اصل زندگی اور رُوحِ عبادت جو انسانی زندگی کا نصب العین اور مقصدِ وحید ہے۔ وہ ہر حال میں "رضائے الٰہی کا حصول" ہے اس کے سوا اور کچھ نہیں۔

## قرآن اور رضائے الٰہی کا نصب العین

جیسا کہ پہلے واضح کیا جا چکا ہے کہ اخلاقِ کمال کی اعلیٰ ترین صورت "رضائے الٰہی کا حصول" ہے۔ اس لیے اب ہم اس حقیقت کو قرآنِ مجید کے حوالے سے مزید اُجاگر کرنا چاہتے ہیں کہ انسانی زندگی کی خلق و بقاء کا سب سے بڑا مقصد ہی رضائے الٰہی کا حاصل کرنا ہے۔ یہی وہ نعمتِ کبریٰ ہے۔ جس کا کوئی بدل کارخانۂ حیات میں میسّر نہیں آسکتا۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:-

| | |
|---|---|
| ۱- وَرِضْوَانٌ مِّنَ اللّٰهِ اَكْبَرُ (التوبۃ: ۷۲) | اور اللہ کی طرف سے رضا کا حاصل ہو جانا) سب سے بڑی نعمت ہے۔ |

۲- ایک مقام پر جدوجہد کرنے والوں کو ان الفاظ میں خوشخبری سنائی جا رہی ہے:-

| | |
|---|---|
| اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَهَاجَرُوْا وَجَاهَدُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ ۙ اَعْظَمُ دَرَجَةً عِنْدَ اللّٰهِ ۭ وَاُولٰۗىِٕكَ هُمُ الْفَاۗىِٕزُوْنَ ۝ يُبَشِّرُهُمْ رَبُّهُمْ بِرَحْمَةٍ مِّنْهُ وَ | جو لوگ ایمان لائے اور انھوں نے اللہ کے لیے اپنے گھر بار اور وطن کو خیرباد کہا اور خدا کے راستے میں اپنے جان و مال سے جہاد کیا، پس اللہ تعالیٰ کے ہاں ان کا بہت بڑا درجہ ہے اور وہی کامیاب و کامران ہیں۔ ان کا رب |

رِضْوَانٌ (التوبۃ : ۲۰، ۲۱)

انہیں (ان کی قربانیوں کے بدلے میں) اپنی رحمت کی اور اپنی رضا کی خوشخبری سناتا ہے۔

۳۔ اسی طرح رضائے الہٰی کی خاطر زندگی کی مشقتیں برداشت کرنے والوں کی تعریف کرتے ہوئے قرآن یوں گویا ہوتا ہے۔

اَلَّذِیْنَ اُخْرِجُوْا مِنْ دِیَارِهِمْ وَ اَمْوَالِهِمْ یَبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَ رِضْوَانًا وَّ یَنْصُرُوْنَ اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ اُولٰٓئِكَ هُمُ الصّٰدِقُوْنَ (الحشر : ۸)

جو لوگ اپنے گھروں سے نکال دیئے گئے اور مال و جائداد سے محروم کر دیئے گئے (صرف) اللہ کے فضل اور اس کی رضا کی خاطر اور اللہ اور اس کے رسول کی مدد کرنے کی خاطر، پس وہی لوگ سچے ہیں۔

جو لوگ رضائے الہٰی کو اپنا مقصد اور نصب العین تصور کرتے ہیں اور اس کے حصول کی خاطر دنیوی منافع سے خود کو محروم کر لینا بھی گوارا کر لیتے ہیں۔ ان کو اللہ تعالیٰ سچائی کی راہ پر گامزن قرار دیتے ہیں اور ساتھ ہی یہ مژدۂ جانفزا سناتے ہیں کہ "تم لوگ حقیقت میں خدا اور اس کے رسول کے مددگار ہو"

۴۔ ایک اور مقام پر ارشادِ ایزدی ملاحظہ ہو :۔

وَ مِنَ النَّاسِ مَنْ یَّشْرِیْ نَفْسَهُ ابْتِغَآءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ وَ اللّٰهُ رَءُوْفٌۢ بِالْعِبَادِ (البقرہ : ۲۰۷)

اور جو شخص اللہ کی رضا چاہتے ہوئے اپنی جان بیچ دیتا ہے۔ اللہ اپنے (ایسے) بندوں پر بہت مہربان ہے۔

۵۔ اسی طرح ایک اور مقام ملاحظہ ہو :۔

| | |
|---|---|
| وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ ابْتِغَآءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ فَسَوْفَ نُؤْتِيْهِ اَجْرًا عَظِيْمًا (النساء : ۱۱۴) | اور جو شخص اللہ تعالیٰ کی رضا چاہتے ہوئے ایسا کرے، پس اسے عنقریب ہم بڑا ثواب دیں گے۔ |

۶۔ غزوۂ اُحد کے ضمن میں صحابہ کرام کی تعریف میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے:۔

| | |
|---|---|
| فَانْقَلَبُوْا بِنِعْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ وَفَضْلٍ لَّمْ يَمْسَسْهُمْ سُوْٓءٌ وَّاتَّبَعُوْا رِضْوَانَ اللّٰهِ ؕ وَاللّٰهُ ذُوْ فَضْلٍ عَظِيْمٍ (آلِ عمران ۱۷۴) | پس وہ اللہ تعالیٰ کے احسان اور فضل کے ساتھ پلٹے، انھیں کوئی نقصان نہ پہنچا۔ (اس لیے کہ) وہ اللہ کی رضا کے طلب گار ہوتے تھے اور اللہ بڑے فضل والا ہے۔ |

۷۔ قرآنِ حکیم نے نفسِ انسانی کا منتہائے کمال رضائے الٰہی کا حصول قرار دیتے ہوئے ارشاد فرمایا:۔

| | |
|---|---|
| يٰٓاَيَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ ۞ ارْجِعِيْٓ اِلٰى رَبِّكِ رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً ۞ فَادْخُلِيْ فِيْ عِبٰدِيْ ۞ وَادْخُلِيْ جَنَّتِيْ (الفجر : ۲۷، ۲۸، ۲۹، ۳۰) | اے اطمینان یافتہ نفسِ انسانی! لوٹ آ اپنے رب کی طرف، اس حال میں کہ تو اس سے راضی ہو اور وہ تجھ سے راضی ہو، پس میرے خاص بندوں میں شامل ہو جا اور میری جنت میں آرام کر۔ |

۸۔ قرآنِ مجید نے رضائے الٰہی کو ایک اور مقام پر سب سے بڑی کامیابی قرار دیتے ہوئے فرمایا:۔

| | |
|---|---|
| رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ ؕ ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ (المائدۃ ۱۱۹) | اللہ تعالیٰ ان سے راضی ہو گیا اور وہ اللہ سے راضی ہو گئے۔ بس یہی سب |

سے بڑی کامیابی ہے۔

۹۔ یہاں تک کہ بیعتِ رضوان جو صلح حدیبیہ سے قبل ہوئی تھی۔ جس میں تمام صحابہؓ نے حضور علیہ السلام کے حکم پر اپنی جانیں قربان کر دینے کا حلف اٹھایا تھا۔ اس کا صلہ بھی ان لفظوں میں بیان فرمایا گیا:۔

| | |
|---|---|
| لَقَدْ رَضِيَ اللّٰهُ عَنِ الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ يُبَايِعُوْنَكَ تَحْتَ الشَّجَرَةِ (الفتح ۴۸: ۱۸) | جب صحابہ نے درخت کے نیچے آپ کے ہاتھ پر بیعت کی تو اللہ تعالیٰ ان مومنوں سے راضی ہو گیا۔ |

## اہلِ حق کا ہر عمل محض رضائے الٰہی کی خاطر ہوتا ہے

قرآنِ مجید کا مطالعہ کرنے سے یہ حقیقت اظہر من الشمس ہو جاتی ہے کہ حیاتِ انسانی کا اصل مقصد اور نصب العین رضائے الٰہی کا حصول ہے۔ اس لیے اہلِ حق جو کچھ بھی کرتے ہیں۔ محض رضائے الٰہی کے خیال سے کرتے ہیں۔ اس کے سوا وہ اپنے دل میں کوئی تمنائے اجر نہیں رکھتے۔ کیونکہ یہ بھی ان کے نزدیک لالچ کی ایک صورت قرار پا جاتی ہے۔

۱۰۔ اُمیہ، حضرت بلالؓ کو اسلام سے منحرف کرنے کے لیے طرح طرح کی تکلیفیں اور اذیتیں دیتا تھا۔ جس پر حضرت ابو بکر صدیق رضؓ نے حضرت بلالؓ کو گراں قیمت ادا کر کے خرید لیا اور آزاد کر دیا۔ ان کے اس عمل کا ذکر کرتے ہوئے قرآنِ حکیم میں ارشاد ہوتا ہے:۔

| | |
|---|---|
| وَمَا لِاَحَدٍ عِنْدَهٗ مِنْ نِّعْمَةٍ تُجْزٰۤى ۝ اِلَّا ابْتِغَآءَ وَجْهِ رَبِّهِ الْاَعْلٰى ۝ وَلَسَوْفَ | اس پر کسی کا کوئی احسان نہیں جس کا وہ بدلہ چکائے۔ مگر اس نے تو (یہ کام) صرف ربِ عظیم کی رضا |

| | |
|---|---|
| يَرْضٰى ۝ (الیل: ۱۹-۲۱) | چاہتے ہوئے کیا ہے اور بیشک جلد ہی اس کا رب اس پر راضی ہو جائیگا |

اس آیت سے یہ حقیقت مترشح ہو گئی کہ اہلِ حق ہمیشہ ہر کام صرف رضائے الٰہی کی نیت سے کیا کرتے ہیں۔ جس کے نتیجے میں انہیں یہ نعمت میسر بھی آجاتی ہے۔

اسی طرح حضرت سلیمانؑ کے یہ الفاظ قرآنِ حکیم میں منقول ہیں:۔

| | |
|---|---|
| وَقَالَ رَبِّ أَوْزِعْنِيٓ أَنْ أَشْكُرَ نِعْمَتَكَ الَّتِيٓ أَنْعَمْتَ عَلَيَّ وَعَلٰى وَالِدَيَّ وَأَنْ أَعْمَلَ صَالِحًا تَرْضٰهُ وَأَدْخِلْنِي بِرَحْمَتِكَ فِي عِبَادِكَ الصّٰلِحِينَ (النمل: ۱۹) | اور انھوں نے عرض کیا۔ اے میرے رب! مجھے توفیق دے کہ میں تیرے احسانات کا شکر ادا کروں جو تو نے مجھ پر اور میرے والدین پر کیے اور یہ کہ میں وہ کچھ کر سکوں جس سے تو راضی ہو اور مجھے اپنی رحمت سے اپنے صالح بندوں میں شامل فرمالے۔ |

## رضائے الٰہی کی خاطر مباح بدعت بھی عنداللہ مقبول ہوتی ہے۔

اس وقت بدعت کے موضوع پر کچھ عرض کرنا ہمارا مقصد نہیں ہے۔ لیکن اتنی بات ذہن میں رکھ لینی چاہیئے کہ بدعت سے مراد عام طور پر وہ نئی چیز یا عمل ہوتا ہے۔ جس کا ثبوت کتاب الٰہی اور سنّتِ رسولؐ میں نہ ہو۔ لیکن ضروری نہیں کہ ہر نیا عمل کتاب و سنّت کے احکام سے متصادم ہی ہوگا۔ اگر ایسا ہو تو اسے "بدعتِ سیئہ" (ممنوعہ) کہیں گے اور اس کے مختلف درجے ہیں۔ اگر وہ نیا عمل کتاب و سُنّت کے کسی حکم سے متصادم نہ ہو اور نہ ہی روحِ شریعت کے منافی ہو تو اسے "بدعت مباحہ" کہیں گے۔ اس کے بھی

مختلف درجے ہیں۔ اگر اس بنیادی امتیاز کو نظر انداز کر کے ہر نئے کام کو بغیر اس کی ماہیت، افادیت، مقصدیت اور مشروعیت کے تجزیئے کے بدعت قرار دے کر مذموم تصور کر لیا جائے تو عہدِ خلافتِ راشدہ سے لے کر آج تک لاکھوں شرعی اجتہادی اور اجتماعی فیصلے، احکام، مذہبی رسوم اور معاملات (معاذ اللہ) ضلالت و گمراہی قرار پا جائیں گے اور ہمیشہ کے لیے دینی معاملات میں اجتہاد و استحسان اور مصالح و استصلاح کا دروازہ بند ہو جائے گا۔ جس سے لامحالہ بدلتے ہوئے حالات میں اسلام کا قابلِ عمل ہونا بھی ناممکن ہوگا۔ بہر حال یہ بحث تو کسی مناسب موقع پر کی جائے گی۔ سرِ دست یہ عرض کرنا مقصود ہے کہ اگر کوئی عمل نہ کتاب میں مذکور ہو نہ اس اُمت کو اس کے رسول نے ایسا حکم دیا ہو اور بعد ازاں اُمت کے صلحاء و علماء از خود کسی نئے عمل یعنی بدعت مباحہ کو وضع کر کے اپنا لیں۔ لیکن اس کا محرک رضائے الٰہی کا حصول ہو تو اِنَّمَا الْاَعْمَالُ بِالنِّیَّاتِ کے مصداق یہ بدعت بھی "عند اللہ" مقبول اور باعثِ اجر و ثواب قرار پاجاتی ہے۔ اسی کو بدعت حسنہ" یا "امر مستحسن" کہتے ہیں۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:-

| | |
|---|---|
| ثُمَّ قَفَّيْنَا عَلٰٓى اٰثَارِهِمْ بِرُسُلِنَا وَقَفَّيْنَا بِعِيْسَى ابْنِ مَرْيَمَ وَاٰتَيْنٰهُ الْاِنْجِيْلَ وَجَعَلْنَا فِيْ قُلُوْبِ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُ رَاْفَةً وَّرَحْمَةً وَرَهْبَانِيَّةَ ۨابْتَدَعُوْهَا مَا كَتَبْنٰهَا عَلَيْهِمْ اِلَّا ابْتِغَآءَ رِضْوَانِ اللّٰهِ فَمَا رَعَوْهَا | پھر ہم نے ان کے پیچھے اسی راہ پر اپنے اور رسول بھیجے اور ان کے پیچھے عیسیٰ ابن مریم کو بھیجا، انھیں انجیل عطا فرمائی اور ہم نے ان کے صحیح پیروکاروں کے دل میں نرمی اور رحمت رکھی اور رہبانیت کی بدعت انھوں نے خود وضع کر لی تھی، ہم نے ان پر فرض نہ کی تھی۔ ہاں، مگر انھوں نے یہ |

حَقَّ رِعَايَتِهَا فَاٰتَيْنَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْهُمْ اَجْرَهُمْ وَكَثِيْرٌ مِّنْهُمْ فٰسِقُوْنَ

(الحدید، ۵۷: ۲۷)

صرف اللہ تعالیٰ کی رضا چاہتے ہوئے وضع کی۔ (اس لیے ہم نے اسے بھی قبول کر لیا) لیکن وہ اس کے جملہ تقاضوں اور آداب کا لحاظ قائم نہ رکھ سکے پس ان میں سے جو لوگ ایماندار تھے ہم نے انہیں ان کا اجر عطا کیا مگر ان میں سے اکثر نافرمان تھے۔

آپ نے ملاحظہ فرمایا کہ دینِ عیسوی میں اصلاً رہبانیت فرض نہ کی گئی تھی بلکہ اس کا تعلیماتِ مسیح میں سرے سے کوئی ذکر ہی نہ تھا۔ بعد کے لوگوں نے از خود رضائے الٰہی کی خاطر زیادہ ریاضت و مجاہدہ اور عبادت و مشقت کی خاطر رہبانیت (ترکِ دنیا) کی صورت پیدا کرلی۔ جس کو قرآن نے "اِبْتَدَعُوْهَا" (اس بدعت کو اپنا لیا) کے الفاظ سے تعبیر کیا۔ چونکہ یہ کام بھی رضائے الٰہی کے نصب العین کے تحت کیا گیا تھا۔ اس لیے قرآنی بیان کے مطابق باری تعالیٰ نے اسے امرِ مستحسن سمجھ کر قبول کر لیا اور اسے بھی دینِ عیسوی میں ایک اہم مقام حاصل ہو گیا۔ اب ضروری تھا کہ رہبانیت کے جملہ تقاضے کماحقہٗ پورے کیے جاتے تاکہ اس سے صحیح روحانی فائدہ میسر آتا۔ لیکن ان میں سے اکثر افراد بالالتزام ان تقاضوں کو پورا نہ کر سکے۔ اس لیے انہیں "نافرمان" قرار دیا گیا اور جنہوں نے اس کے تقاضوں کو صحیح طور پر پورا کیا۔ انہیں باری تعالیٰ نے اجر و ثواب سے بہرہ ور کیا۔

## تصورِ بدعت سے متعلق دو اہم اُمور

آیتِ مذکورہ سے دو اُمور پر روشنی پڑتی ہے:۔

ایک یہ کہ اگر رضائے الٰہی کی خاطر کوئی نیا کام جسے عرفِ عام میں بدعت کہتے ہیں، کیا جائے جو فی نفسہٖ خلافِ شریعت نہ ہو تو اسلام اس کو قبول کرتا ہے، امرِ مستحسن کے طور پر اس کا اجر و ثواب اور فوائد و برکات بھی متحقق ہوتی ہیں۔ ایسے امور شریعت میں متدرج حیثیت رکھتے ہیں۔ ان کو مطلقاً ناجائز سمجھنا زیادتی ہے

دوسرے یہ کہ جس مقصد کے لیے وہ بدعتِ حسنہ وضع کی گئی ہو۔ اس سے وہ مقصد بجا طور پر پورا ہونا چاہیے ایسا نہ ہو کہ بدعتِ حسنہ کے تصور کا سہارا لے کر کسی کام کو روا تو رکھ دیا جائے لیکن اس کی اصل روح، افادیت اور مقصدیت باقی نہ رہے بلکہ محض رسمیت رہ جائے۔ جیسا کہ بے عملی کی وجہ سے اکثر ہو جاتا ہے۔ یہ اقدام نافرمانی قرار پا جائے گا

لیکن شرط یہ ہے کہ ایسے معاملات "بدعاتِ حسنہ" یعنی "مستحسنات" ہی رہنے چاہئیں۔ ان کو ضروریاتِ دین نہیں سمجھا جا سکتا۔ بدعت کے جس تصور کی احادیث میں مذمت آئی ہے۔ اس سے مراد کسی نئے کام کو دین میں داخل کرنا ہے جس کا مفہوم یہ ہے کہ اسے ضروریاتِ دین میں شمار کیا جائے۔ یعنی اس کا ترک گویا کسی فرض، واجب یا سنت کا ترک تصور ہونے لگے۔ اس سے اس کو "بدعتِ سیئہ" کا درجہ حاصل ہو جاتا ہے۔ اگر وہ اعتقاداً ضروریاتِ دین کا حصہ قرار نہ پائے لیکن عادۃً اور مصلحۃً جتنا بھی ضروری و معمول بہ تصور ہوتا ہو۔ جب تک وہ شریعت کے ساتھ متصادم نہیں قطعی ناجائز نہیں کہا جا سکتا۔ لہٰذا یہاں یہ نکتہ قابلِ غور ہے کہ اگر بدعت بھی رضائے الٰہی کے نصب العین کے تحت وضع کی جائے تو اسے بھی بارگاہِ ایزدی میں شرفِ قبولیت حاصل ہو جاتا ہے۔ یہاں یہ امر بھی ذہن نشین رہنا چاہیے کہ اس طرح اسلام کے اندر شرعی محرمات اور نواہی کے جواز کی قطعاً کوئی صورت پیدا نہیں کی جا سکتی۔

# اہلِ حق کی دوستی وعداوت کا معیار بھی رضائے الٰہی کا نصب العین ہوتا ہے۔

جیسا کہ پہلے متعدد آیات سے ثابت کیا جا چکا ہے کہ اہلِ حق کی پوری زندگی رضائے الٰہی کی خاطر متحرک رہتی ہے۔ چنانچہ ان کی دشمنیاں اور دوستیاں سب اسی مقصد کے حوالے سے متعین ہوتی ہیں۔ اسی تصور کو حدیث کی اصطلاح میں "الحب فی اللہ و البغض فی اللہ" کے عنوان سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

۱۲۔ قرآنِ حکیم میں صحابہ کرام کی زندگی جو فیضانِ صحبتِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم سے متأثر ہوئی تھی، اس طرح بیان کی گئی ہے:۔

مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ ؕ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗۤ اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ تَرٰىهُمْ رُكَّعًا سُجَّدًا يَّبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَ رِضْوَانًا۔ (الفتح ۴۸: ۲۹)

محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے رسول ہیں اور جو لوگ ان کی صحبت و معیت سے فیضیاب ہوئے وہ کافروں پر نہایت سخت ہیں۔ آپس میں نہایت رحمت و مودت سے پیش آتے ہیں۔ آپ انہیں رکوع و سجود کی حالت میں دیکھیں گے۔ وہ (ہر حال میں) اللہ کا فضل اور اس کی رضا تلاش کرتے رہتے ہیں۔

یہاں غلامانِ مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی تین صفات بیان کی گئی ہیں:۔

**ایک** یہ کہ وہ حق کی خاطر عالمِ کفر کے خلاف ہر وقت صف آرا رہتے ہیں اور اعلائے کلمۃ اللہ کے لیے سر بکفن میدانِ کارزار میں ہر وقت تیار رہتے ہیں۔

**دوسری** یہ کہ آپس میں انتہائی رحیم و شفیق اور ایک دوسرے کے لیے سراپا

ایثار و احسان ہیں ؎

ہو حلقۂ یاراں تو بریشم کی طرح نرم
رزمِ حق و باطل ہو تو فولاد ہے مومن

**تیسری** یہ کہ وہ ہمہ وقت یادِ الٰہی میں محو رہتے ہیں۔ جس وقت بھی دیکھو انہیں رکوع و سجود کی حالت میں ہی پاؤ گے۔ گویا صبح و شام ان کا قلبی تعلق اپنے محبوبِ حقیقی سے قائم رہتا ہے۔

لیکن جنگ و جدال کی حالت ہو، دوستی و محبت کی کیفیت ہو یا بارگہِ اُلوہیت میں سجدہ ریزیاں ہوں، ہر حال میں ان کے پیشِ نظر ایک ہی مقصد اور ایک ہی نصب العین ہوتا ہے اور وہ ہے "رضائے الٰہی کی تلاش" اس مقام پر "یبتغون فضلاً من اللّٰہ و رضوانا" کا مفہوم کسی شاعر نے کیا خوب بیان کیا ہے ؎

مجھے ہوش کب تھی رکوع کی، مجھے کیا خبر تھی سجود کی
ترے نقشِ پا کی تلاش تھی، کہ میں جھک رہا تھا نماز میں

جب رضائے الٰہی مقصدِ حیات بن کر انسان کی پوری زندگی پر محیط ہو جائے تو اس کا اٹھنا بیٹھنا، کھانا پینا، سونا جاگنا، چلنا پھرنا، الغرض سارا کاروبارِ حیات ہی عبادت اور بندگی قرار پاتا ہے۔ اس کا ایک ایک سانس اور ایک ایک لمحہ عبادت میں شمار ہوتا ہے۔ وہ شخص رضائے الٰہی کی خاطر شادی کرتا ہے تو وہ بھی عبادت ہوتی ہے، بیوی بچوں سے شفقت و محبت کرتا ہے تو وہ بھی عبادت ہوتی ہے۔ مشاغلِ حیات میں مصروف ہوتا ہے تو وہ بھی عبادت ہوتی ہے۔ یہاں تک کہ حیاتِ انسانی کی ہر حرکت و سکون سراسر عبادت و بندگی میں بدل جاتی ہے۔ اسی تصور کو قرآن یوں واضح کرتا ہے:۔

| | |
|---|---|
| رِجَالٌ لَّا تُلْهِيْهِمْ تِجَارَةٌ وَّلَا بَيْعٌ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ | ایسے لوگ بھی ہیں کہ تجارت اور خرید و فروخت بھی انہیں یادِ الٰہی سے غافل نہیں ہونے دیتی۔ |
| (النور ۲۴ : ۳۷) | |

ایسے بندگانِ خدا کا ایک ایک قدم یادِ الٰہی میں شمار کیا جاتا ہے۔ بلکہ وہ اپنے مقصد اور نصب العین میں اس طرح کھو جاتے ہیں کہ خود بھی مقصودِ خلائق قرار پا جاتے ہیں۔

## مقصد مَن میں اُتر جائے تو بندہ مقصودِ خلائق بن جاتا ہے

- یہ وہ مقام ہے جہاں ع

ذاکر ہمہ ذکر، دو ذکر، مذکور شود

کا منظر دیکھنے میں آتا ہے۔ انسان اپنے مقصود میں اس طرح گم ہو جاتا ہے کہ قدرت خود اسی کو مقصودِ خلائق بنا دیتی ہے۔ جس کی اپنی زندگی کا ہر لمحہ خدا کی یاد اور اس کی رضا کے لیے وقف ہو۔ اس شخص کو دیکھنا بھی خود یادِ الٰہی بن جاتا ہے جیسے کہ رسولِ مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:۔

| | |
|---|---|
| اَلَا اُنبئکم بخیارکم قالوا بلٰی یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال خیارکم الذین اذا رُؤُوا ذکر اللہ | کیا میں تمہیں ان لوگوں کے بارے میں نہ بتاؤں جو تم میں سے افضل ہیں صحابہ نے عرض کیا۔ جی ہاں یارسول اللہ تو حضور علیہ السلام نے فرمایا تم میں سے افضل وہ لوگ ہیں جنہیں دیکھتے ہی خدا یاد آجائے۔ |
| (ابنِ ماجہ) | |

رضائے حق کو اپنا مقصدِ حقیقی سمجھنے والے جب اس مقصود کو عملاً پا لیتے

ہیں تو پھر وہ خود بھی خدا کے محبوب و مرتضےٰ ہو جاتے ہیں۔ خود رب ذوالجلال انہیں اپنا مطلوب و مقصود بنا لیتا ہے۔ قرآنِ حکیم اس حقیقت کی تائید یوں کرتا ہے:-

● قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ (آلِ عمران: ۳۱)

فرما دیجئے اگر تم اللہ سے محبت کرتے ہو تو میری غلامی اختیار کرو، (نتیجۃً) اللہ تمہیں اپنا محبوب بنا لے گا۔

اس آیت نے صراحت کے ساتھ یہ امر واضح کر دیا کہ رضائے الٰہی کی طلب بندے کو اطاعت و اتباعِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد خود محبوب و مرتضٰی بنا دیتی ہے۔ انسان کی جہدِ حیات کا آغاز تو حبِّ الٰہی اور رضائے الٰہی کے حصول کی کاوش سے ہوتا ہے۔ جس میں صداقت کی شرط اتباعِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہے۔ ورنہ حبِ الٰہی اور رضائے الٰہی کا دعوٰے کامل تصور ہی نہیں ہو سکتا۔ لیکن اتباعِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم جس کا محرک محبت ہو، کا نتیجہ یہ ہے کہ بندہ مُحب سے محبوب، طالب سے مطلوب اور متلاشیِ رضا سے خود مرتضٰی و مجتبٰی بن جاتا ہے۔ وہ "عبدِ محض" کے بجائے "عبدہٗ"، اور منتظر کے بجائے منتظَر ہو جاتا ہے۔ اسی تصور کو علامہ اقبالؒ یوں بیان کرتے ہیں ؎

عبد دیگر عبدہٗ چیزے دگر
ایں سراپا انتظار، او منتظر

● قرآنِ حکیم میں ارشاد فرمایا گیا:-

اَللّٰهُ يَجْتَبِيْٓ اِلَيْهِ مَنْ يَّشَآءُ وَيَهْدِيْٓ اِلَيْهِ مَنْ يُّنِيْبُ (شوریٰ: ۱۳)

اللہ تعالیٰ اپنی ذات تک رسائی دیدیتے ہیں جسے چاہیں اور اپنی طرف راہ دکھا دیتے ہیں جو کوئی ارادہ کرے۔

یہ عنایاتِ الٰہیہ ہیں۔ جن پر کسی کا قبضہ و تصرف نہیں۔ وہ ذات جس کو

جس قدر چاہے نواز دے ۔ لہٰذا بندہ جب رضائے الٰہی کے نصب العین اور مقصود کو پالے تو اسے خود مقصودِ خلائق بنا دیا جاتا ہے ۔

● جیسا کہ حضرت ابوہریرہؓ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں :

قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان اللہ اذا احبّ عبداً دعا جبرئیل فقال انی اُحبُّ فلاناً فاحبّہ قال فیحبّہٗ جبرئیل ثم ینادی فی السّماء فیقول ان اللہ یحب فلاناً فاحبّوہ فیحبّہٗ اہل السّماء ثم یوضَعُ لہ القبول فی الارض

(صحیح مسلم)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جب اللہ تعالیٰ کسی بندے سے محبت کرتے ہیں تو جبرئیل کو ندا کر کے فرماتے ہیں ! میں نے فلاں شخص کو محبوب و مرتضیٰ بنا لیا ہے تو بھی اس سے محبت کر، پس جبرئیل اس کو محبوب بنالیتا ہے ۔ پھر وہ آسمانوں میں ندا کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فلاں شخص کو اپنا محبوب بنالیا ہے ۔ تم بھی اس سے محبت کرو، پس اہلِ سما بھی اس کو محبوب بنا لیتے ہیں ۔ پھر اس شخص کے لیے اہلِ زمین کے دلوں میں مقبولیت اُتار دی جاتی ہے ۔ یعنی اہلِ زمین بھی حکمِ الٰہی سے اسے اپنا محبوب و مقصود بنا لیتے ہیں

● جن لوگوں نے رضائے الٰہی کو مقصدِ حیات بنا کر اپنے صبح و شام اسی رنگ میں ڈھال لیے ہیں ۔ قرآن ان سے بھی خصوصی لگاؤ اور تعلق قائم رکھنے کی تلقین کرتا ہے ۔ اس لیے کہ ان کی صحبت و معیت سے اور کچھ نہ سہی محبوب کی خبر تو ملتی رہتی ہے ۔ بقول شخصے ؎

گرد مستاں گرد، گرمے کم رسد، بوئے رسد
بوئے او گر کم رسد، رویتِ ایشاں بس است

● قرآنِ مجید میں حکم صادر کیا گیا ہے :-

وَاصْبِرْ نَفْسَكَ مَعَ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَدٰوةِ وَالْعَشِيِّ يُرِيْدُوْنَ وَجْهَهٗ وَلَا تَعْدُ عَيْنٰكَ عَنْهُمْ (الکہف : ۲۸)

اپنی طبیعت ان لوگوں سے مانوس رکھو جو صبح و شام اپنے رب کو پکارتے (اور) اسی کی رضا چاہتے ہیں۔ (تم ہر وقت ان سے اس طرح قریب رہو کہ) تمہاری آنکھیں ان سے ہٹ کر کہیں اور پھرنے نہ پائیں۔

● ایک اور مقام پر ارشاد فرمایا گیا ہے :-

وَلَا تَطْرُدِ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَدٰوةِ وَالْعَشِيِّ يُرِيْدُوْنَ وَجْهَهٗ (الانعام : ۵۲)

اور ان لوگوں کو خود سے دُور نہ کرو جو صبح و شام اپنے رب کو پکارتے اور اسی کی رضا کے طلبگار رہتے ہیں

● اسی طرح ایک اور مقام پر ارشادِ ایزدی ہے :-

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَكُوْنُوْا مَعَ الصّٰدِقِيْنَ (التوبۃ : ۱۱۹)

اے اہلِ ایمان، اللہ تعالیٰ سے ڈرو اور صدق والوں کی معیت اختیار کرلو۔

یقیناً صدق والے وہی لوگ ہیں جو خلوصِ دل سے رضائے الٰہی کے طلبگار ہیں اور جنہیں نعمتِ رضوان نصیب ہو چکی ہے۔

**خلاصۂ کلام** مذکورہ بالا تمام آیات اور احادیث میں مختلف صورتوں سے ایک ہی حقیقت پر زور دیا گیا ہے اور وہ ہے

اہلِ رضا سے تعلق، معیّت، رفاقت اور وابستگی اختیار کرنا۔ کیونکہ یہی وہ لوگ ہیں جو اپنے مقصودِ زندگی کو پا چکے ہیں۔ لہٰذا مقصدِ حیات اور نصب العین کی صحیح ہدایت بھی ان ہی کے راستے سے میسّر آ سکتی ہے۔ یہ لوگ چونکہ صحیح معنوں میں ہدایت یافتہ ہیں۔ اسی لیے ہدایت کا اوّلین شعور بھی ان ہی کے راستے سے نصیب ہوتا ہے۔

● قرآنِ حکیم اس حقیقت کی تائید ان لفظوں میں کرتا ہے :۔

| | |
|---|---|
| قَدْ جَآءَكُمْ مِّنَ اللّٰهِ نُوْرٌ وَّ كِتٰبٌ مُّبِيْنٌ ۝ يَّهْدِيْ بِهِ اللّٰهُ مَنِ اتَّبَعَ رِضْوَانَهٗ سُبُلَ السَّلٰمِ وَ يُخْرِجُهُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ بِاِذْنِهٖ وَ يَهْدِيْهِمْ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ (المائدہ، ۵ : ۱۵، ۱۶) | بیشک تمہارے پاس اللہ کی طرف سے ایک نور آ گیا اور ایک روشن کتاب؛ اس سے اللہ اسی کو سلامتی کے راستوں کی ہدایت دیتا ہے جس نے اس کی رضا کو اپنا لیا اور وہ انہیں اپنے حکم سے اندھیروں سے نکال کر روشنی (یعنی صحیح شعور کے اُجالے) کی طرف لے جاتا ہے اور وہ انہیں سیدھی یعنی استقامت والی راہ دکھاتا ہے۔ |

اس آیت نے متذکرہ بحث کے نتیجے پر مہرِ تصدیق ثبت کر دی کہ جو لوگ رضائے الٰہی کے نصب العین کے طلب گار ہیں۔ حقیقت میں وہی راہِ ہدایت پر ہیں اور انہی کے سینے شعورِ مقصدیت کے اُجالے سے منور ہیں، انہی کا راستہ صراطِ مستقیم ہے اور انہی کو منزل تک رسائی کی حتمی ضمانت نصیب ہو چکی ہے۔

اسی لیے باری تعالیٰ نے اهدنا الصراط المستقيم کے الفاظ

کے فوراً بعد اس دعا اور التجا کو مشخص، معین اور نتیجہ خیز کرنے کے لیے صراط الذین انعمت علیھم غیر المغضوب علیھم ولا الضالین کے ذریعے راستے کی تعیین فرمادی۔ تاکہ انسان کی زبان سے نکلی ہوئی دعا اسی معنی و مفہوم کا جامہ پہن کر بارگاہِ الوہیت میں پہنچے کہ:۔

اے باری تعالیٰ! ہم کو اسی مقصد حیات کا شعور عطا کر جس سے تو نے اپنے انعام یافتہ بندوں کو نوازا۔

اے باری تعالیٰ! ہم کو اپنے نصب العین کے حصول کے لیے اسی راستے پر چلا جس پر تیرے انعام یافتہ بندے چلتے رہے۔

اے باری تعالیٰ! ہم کو منزلِ مقصود تک رسائی کی اسی طرح ضمانت عطا کر جس طرح تو نے اپنے انعام یافتہ بندوں کو عطا فرمائی۔

اور ذاتِ حق کے انعام یافتہ بندے جن کا راستہ "صراطِ مستقیم" قرار پا چکا ہے وہی ہیں۔ جن کا ذکر سورۃ المائدۃ کی آیت ۱۶ میں ان لفظوں کے ذریعے کیا گیا ہے ـــــ یَهْدِیْ بِهِ اللّٰهُ مَنِ اتَّبَعَ رِضْوَانَهٗ ـــــ وَ یَهْدِیْهِمْ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ ـــــ اللہ تعالیٰ نورِ ہدایت اور صراطِ مستقیم سے ان ہی لوگوں کو نوازتے ہیں۔ جو رضائے الٰہی کو اپنا نصب العین بنا کر اپنی زندگی اس کے لیے وقف کر چکے ہیں۔

مذکورہ بالا بحث سے انسان کی انفرادی زندگی کا مقصد اور نصب العین واضح ہو چکا کہ وہ "اخلاقی کمال کا حصول" ہے۔ جس کی اعلیٰ ترین صورت "رضائے الٰہی" ہے۔ بقول استاذی المکرم جناب ڈاکٹر برہان احمد فاروقی "انسان کی انفرادی زندگی کا نصب العین انسان مرتضیٰ بننا ہے"۔

لیکن اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ:۔

- اس اخلاقِ کمال (رضائے الٰہی) کے حصول کا محرک کیا ہوگا؟
- اس کا طریقِ کار کیا ہوگا؟
- اس کی عملی اساس کیا ہوگی؟
- اس کا نمونۂ کمال کیا ہوگا؟
- اور اس کا معیارِ عمل کیا ہوگا؟

باب سوم

# حصولِ نصب العین کا محرّک

سابقہ صفحات پر ہم نے انسان کی انفرادی زندگی کا نصب العین واضح کیا ہے۔ لیکن جیسے کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے۔ قرآنی ہدایت محض انسان کو اس کے مقصد اور نصب العین سے آگاہ کر دینا ہی کافی نہیں سمجھتی۔ بلکہ اس کے بعد اس معینہ نصب العین کے حصول کے لیے رہنمائی بھی مہیا کرتی ہے۔ اس ضرورت کو بھی سورۂ فاتحہ کی زیرِ غور آیت کے حوالے سے سمجھا جا سکتا ہے ـــــــ انسان بارگہِ ایزدی میں التجا کرتا ہے :۔

اھدنا الصراط المستقیم — اے باری تعالیٰ! ہم کو نصب العین تک پہنچا دینے والا سیدھا راستہ دکھا

گویا اس وقت، طالبِ ہدایت کو "حصولِ نصب العین کا لائحہ عمل" معلوم کرنا درکار ہے۔ ہم نے پہلے بھی اشارہ کر دیا ہے کہ لائحہ عمل کی پانچ ضروریات ہیں جنھیں پورا کیے بغیر "لائحہ عمل کی ہدایت" مکمل تصور نہیں ہو سکتی۔ وہ پانچ ضروریات درج ذیل ہیں :۔

۱۔ محرک (INCENTIVE)

۲۔ طریقِ کار (PROCEDURE)

۳۔ عملی اساس (PRACTICAL BASE)

۴۔ نمونۂ کمال (MODEL OF PERFECTION) OR (IDEAL)

## ۵۔ معیارِ عمل (STANDARD)

اب ہم مذکورہ بالا شرائط کے مطابق لائحہ عمل کا تفصیلی جائزہ لیتے ہیں۔

### ۱۔ محرّک تزکیہ نفس کی آرزو

یہ حقیقت، روزِ روشن کی طرح عیاں ہے کہ قدرت نے کائنات کے پورے نظام میں اصلاح کا ارتقائی طریق کار رائج کیا ہے اور تضاد کو ہر جگہ اصلاح کے لیے سازگار شرط کے طور پر پیدا فرمایا ہے۔ فلسفۂ تضاد پر تفصیلی گفتگو ان شاءاللہ سورۂ فاتحہ کی تفسیر کے دوران آئے گی۔ لیکن اس وقت ہمیں صرف یہ واضح کرنا مقصود ہے کہ انسان کی انفرادی زندگی کے نصب العین "جو کہ رضائے الٰہی کا حصول ہے" کے حصول کے لیے محرّک قدرت نے ہر انسان کی فطرت کے اندر رکھ دیا ہے اور وہ محرّک "تزکیہ نفس کی آرزو" ہے۔ تزکیہ نفس کا مفہوم سمجھے بغیر بات واضح نہیں ہو سکے گی۔

**تزکیہ** ــــ زکا سے مشتق ہے۔ زکیٰ یزکی کے معنی "پاک صاف کرنے اور نشوونما دینے" کے ہیں۔ اس سے "زکوٰۃ" کا لفظ نکلا ہے۔ کہا جاتا ہے:

اصل الزکوٰۃ النُّمُوُّ الحاصل عن برکۃ اللہ تعالیٰ (المفردات) — زکوٰۃ کی اصل وہ نشوونما ہے جو برکتِ الٰہی سے حاصل ہوتی ہے۔

اسی طرح کھیتی کے نشوونما پانے اور اس سے خیر و برکت حاصل ہونے پر کہا جاتا ہے۔ "زکا الزَّرْعُ"۔ کھیتی نشوونما پا گئی۔

تزکیۃ النفس "کی تعریف امام راغب یوں کرتے ہیں:۔

تنمیتھا بالخیرات والبرکات (المفردات) — خیرات و برکات کا نفسِ انسانی میں نشوونما پانا، تزکیہ نفس کہلاتا ہے۔

## تزکیہ کا قرآنی مفہوم

یہ لفظ قرآنِ مجید میں ہر جگہ ان ہی معنوں میں استعمال ہوا ہے - ارشادِ باری تعالٰے ہے :-

| | |
|---|---|
| ۱- مَنْ تَزَكّٰى فَاِنَّمَا يَتَزَكّٰى لِنَفْسِهٖ (فاطر: ۱۸) | اور جو کوئی پاک ہوا پس وہ اپنی ہی جان کے لیے پاک ہوتا ہے۔ |
| ۲- ذٰلِكُمْ اَزْكٰى لَكُمْ وَ اَطْهَرُ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ وَاَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ (البقرہ: ۲۳۲) | یہ تمہارے لیے زیادہ پاک اور صاف ہے - اللہ بہتر جانتا ہے اور تم (حقیقتِ امر کو) نہیں جانتے۔ |

۳- جبرائیل امینؑ نے حضرت مریمؑ کو عیسٰی علیہ السلام کے تولد کی بشارت ان الفاظ میں دی :-

| | |
|---|---|
| قَالَ اِنَّمَا اَنَا رَسُوْلُ رَبِّكِ لِاَهَبَ لَكِ غُلٰمًا زَكِيًّا (مریم: ۱۹) | اس نے کہا - میں تو تیرے رب کا بھیجا ہوا پیغامبر ہوں - تجھ کو ایک پاک لڑکا دینے کے لیے آیا ہوں۔ |
| ۴- قَالَ اَقَتَلْتَ نَفْسًا زَكِيَّةًۢ بِغَيْرِ نَفْسٍ (الکہف: ۷۴) | انہوں نے کہا - کیا آپ نے ایک پاک اور بے گناہ جان بغیر کسی جان کے قتل کر دی ؟ |

۵- باری تعالٰی ارشاد فرماتے ہیں :-

| | |
|---|---|
| فَلَا تُزَكُّوْۤا اَنْفُسَكُمْ هُوَ اَعْلَمُ بِمَنِ اتَّقٰى (النجم: ۳۲) | تم اپنی جانوں کی صفائی اور پاکیزگی کی قسم نہ کھاؤ، وہ (اللہ) بہتر جانتا ہے کہ کون زیادہ پاکیزہ ہے۔ |

۶- ایک اور مقام پر ارشاد فرمایا گیا :-

بَلِ اللّٰهُ یُزَکِّیْ مَنْ یَّشَآءُ وَلَا یُظْلَمُوْنَ فَتِیْلًا

(النساء : ۴۹)

بلکہ اللہ تعالیٰ جس کی چاہے گا صفائی اور پاکیزگی بیان کرے گا اور لوگ ذرہ بھر بھی ظلم نہیں کیے جائیں گے

۷۔ اسی طرح فرائضِ پنجگانۂ نبوت کا بیان کرتے ہوئے چار مرتبہ قرآنِ مجید میں ارشاد ہوا ہے :۔

یَتْلُوْا عَلَیْکُمْ اٰیٰتِنَا وَیُزَکِّیْکُمْ وَیُعَلِّمُکُمُ الْکِتٰبَ وَالْحِکْمَةَ وَیُعَلِّمُکُمْ مَّالَمْ تَکُوْنُوْا تَعْلَمُوْنَ

(البقرہ : ۱۵۱)

وہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم تمہارے اُوپر ہماری آیات پڑھتے ہیں اور تمہارے نفوس کو پاک کرتے ہیں اور تمہیں کتابِ الٰہی کی تعلیم دیتے ہیں اور حکمت و دانائی (یا اسرار و رموزِ دین) کی تعلیم دیتے ہیں اور اس کے علاوہ جو کچھ تم نہیں جانتے اس کی بھی تعلیم دیتے ہیں۔

مذکورہ بالا آیات کے بیان سے یہ حقیقت اچھی طرح واضح ہوگئی ـــ کہ "تزکیہ" اپنی جانوں کو رذائل اور رذائم سے پاک و صاف کرنے کا نام ہے۔ صاف ظاہر ہے کہ پاک صاف کرنے کی ضرورت تبھی پیدا ہوتی ہے اگر نفوسِ انسانی میں میل کچیل موجود ہو۔ رذائل اور میل کچیل کا نفسِ انسانی میں موجود ہونا اس وجہ سے ثابت ہے کہ فطرتِ انسانی نیکی اور بدی دونوں طرح کے رجحانات اور صلاحیتیں اپنے اندر رکھتی ہے۔ مذکورہ بالا بحث کی روشنی میں اب تک "تزکیہ" کے مفہوم کے تحت دو اُمور سامنے آئے ہیں :۔

۱۔ پاک صاف کرنا

## ۲۔ نشوونما پانا

اس سلسلے میں قرآن حکیم کی ایک اور آیت ملاحظہ ہو:۔

| | |
|---|---|
| قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَکّٰهَا وَ قَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰهَا (الشمس: ۹، ۱۰) | پس وہ کامیاب ہو گیا جس نے اپنے نفس کو صاف ستھرا کیا اور نیکیوں کے ذریعے فروغ دیا (یعنی اس کی صحیح نشوونما کی) اور وہ ناکام ہو گیا جس نے گناہ و معصیت کے ساتھ اسے دبا دیا (یعنی اس کی نشوونما روک دی) |

یہاں یہ چیز قابلِ غور ہے کہ نفس کا پاک صاف کرنا اور اسے نشوونما دینا' ان دونوں خصوصیتوں کا آپس میں کیا تعلق ہے؟ اس کو ایک مثال کے ذریعے بخوبی سمجھا جا سکتا ہے۔

### عملِ تزکیہ کی تمثیل

تزکیہ کے عمل کو اس طرح آسانی سے سمجھا جا سکتا ہے۔ جیسے کوئی کیاری ہو۔ آپ محنت کر کے اس میں صاف ستھرا پودینہ اُگانا چاہیں۔ لیکن ساتھ ہی اس میں کچھ خود رَو پودے اُگ آئیں۔ اب آپ چاہیں گے کہ ان خود رَو پودوں کو چُن چُن کر اُکھاڑ پھینکیں۔ کیونکہ اگر انہیں بدستور اُگنے دیا جائے تو دو قسم کی خرابیاں پیدا ہوں گی:۔

**ایک** تو یہ کہ کیاری کی صفائی اور نظافت و لطافت باقی نہ رہے گی۔

**دوسری** یہ کہ پودینے کے پودوں کی صحت اور نشوونما پر اثر پڑے گا۔ کیونکہ زمین کی تخلیقی قوت، بجائے خالصتاً پودینے کی نشوونما پر صرف ہونے کے خود رَو، غیر ضروری اور ناپسندیدہ پودوں کی صحت و نشوونما پر بھی خرچ ہونے لگے گی۔

جس سے پودینے کی نشوونما رک جائے گی یا صحیح طور پر نہ ہو سکے گی۔

زمین کی تخلیقی قوت کو غلط مصرف سے بچانے اور پودینے کی صحیح نشوونما کی ضمانت مہیا کرنے کی خاطر جب آپ خودرو پودوں کو اکھاڑ پھینکتے ہیں تو یہی عمل کیاری کے لیے "تزکیہ کا عمل" کہلاتا ہے۔

اسی سے تزکیۂ نفس کے مضمون کو سمجھ لیجیے۔ نفسِ انسانی گویا ایک روحانی زمین ہے۔ جس میں آپ نیکی، بھلائی اور فضائلِ اخلاق کے پودے اگانا چاہتے ہیں۔ اس نفسِ انسانی کی زمین میں برائی اور رذائلِ اخلاق کے پودے بھی از خود اگ آتے ہیں۔ کیونکہ فطرتِ انسانی میں ہر دو طرح کے رجحانات موجود ہیں۔ اب نفسِ انسانی کی قوتیں بجائے صرف نیکی کی نشوونما پر صرف ہونے کے برائی کی نشوونما پر بھی صرف ہونے لگتی ہیں۔ لہٰذا نیکی اور تقویٰ کی صحیح نشوونما کے لیے گناہ و معصیت کے رجحانات سے نفسِ انسانی کی زمین کو پاک کر دینا "تزکیۂ نفس" کہلاتا ہے۔ اس تزکیہ سے نہ صرف نفسِ انسانی برائی سے پاک و صاف ہوتا ہے بلکہ اس میں نیکی بھی نشوونما پانے لگتی ہے۔ اسی عمل کے بارے میں ارشادِ باری ہے:-

| | |
|---|---|
| قَدْ اَفْلَحَ مَنْ تَزَكّٰى ۝ وَ ذَكَرَ اسْمَ رَبِّهٖ فَصَلّٰى (الاعلیٰ: ۱۴، ۱۵) | بیشک وہ فلاح پا گیا۔ جس نے نفس کو پاک صاف کر لیا۔ پھر اپنے رب کے نام کو یاد کیا اور نماز پڑھی۔ |

اس آیت میں تین چیزوں کا بیان ہے:-

۱۔ تزکیہ —— یعنی نفس کی زمین کو برائی اور انحراف کے رجحانات اور میلانات سے پاک صاف کر دینا۔

۲۔ یادِ الٰہی —— جب نفسِ انسانی کی تمام تخلیقی قوتیں برائی پر خرچ ہونے سے محفوظ ہو گئیں اور یادِ الٰہی کا پودا قلب و باطن میں صحیح طور پر نشوونما پانے لگا۔

۴۔ **نماز** ـــــ تو اس حال میں پڑھی ہوئی نماز وہاں حق کے لیے اہلِ ایمان کی "معراج" بن گئی۔ چنانچہ ارشاد فرمایا گیا کہ ان شرائط کو پورا کرنے والا "فلاح" پا گیا۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ نفسِ انسانی کی سطح پر اس عملِ تزکیہ کا محرک کس طرح اور کہاں سے پیدا ہوا!

## عملِ تزکیہ کی تحریک کس طرح ہوتی ہے؟

یہاں تک تو "تزکیہ نفس" کی اصطلاح کے مفہوم کی بات ہوئی۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ انسان کے اندر تزکیہ نفس کی آرزو کس طرح پیدا ہوتی ہے؟ یا اس کی تحریک کس طرح جنم لیتی ہے؟ اس کے بارے میں اشارۃً پہلے عرض کر دیا گیا ہے کہ انسانی فطرت ایک تضاد سے دوچار ہے اور وہی "تضاد" تزکیہ نفس کی آرزو کا محرک بنتا ہے۔

## فطرتِ انسانی کا تضاد اور اس کی نوعیت

مطالعہ قرآن سے یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ انسانی فطرت کے دو پہلو ہیں:۔

۱۔ فطرت بالقوۃ (POTENTIAL NATURE)

۲۔ فطرت بالفعل (ACTUAL NATURE)

فطرت بالقوۃ سے مراد وہ فطری احساسات ہیں جو ہر انسان کے اندر خلقی طور پر مضمر ہوتے ہیں۔ خواہ وہ جہاں بھی جس ماحول میں پیدا ہو، ان احساسات کے شعور کو "ضمیر" کا نام دیا جاتا ہے۔ جبکہ فطرت بالفعل سے مراد وہ نفسانی خواہشات اور طبعی داعیات ہیں۔ جن کا ظہور ہر انسان کی زندگی میں فعلاً ہوتا ہے۔

## فطرت بالقوۃ کے لوازمات

انسان کی فطرت، بالقوہ چار لوازمات کی جامع ہے:-

### ۱- اقرارِ اُلوہیت

انسان پیدائشی طور پر اس خالقِ کائنات کی ربوبیت و اُلوہیت کے احساس سے بہرہ ور ہوتا ہے اور اس کے اقرار کی طرف طبعاً راغب بھی ہوتا ہے۔ اس کی بنیاد عالمِ ارواح کا وہ "معاہدۂ الست" ہے۔ جس میں تمام انسانوں نے باری تعالیٰ کی خالقیت و ربوبیت کو تسلیم کیا تھا۔ ان سے سوال کیا گیا:-

| | |
|---|---|
| اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ قَالُوْا بَلٰى (اعراف: ۱۷۲) | اللہ تعالیٰ نے پوچھا! کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں؟ سب نے جواب دیا ہاں تو ہمارا رب ہے۔ |

کوئی شخص جہاں بھی پیدا ہو، جس ماحول میں پلے، خواہ وہ ماحول کفر و الحاد سے لبریز ہو یا شرک و بت پرستی سے، بہرحال اس کے لاشعور میں کسی بڑی قوت کے ہونے، اس کے قادرِ مطلق ہونے اور اس کے خالق و رب ہونے کا احساس کسی نہ کسی صورت میں ضرور موجود ہوتا ہے۔ بعض اوقات وہ دنیا کے تمام اسباب و ذرائع سے مایوس ہونے کے بعد اس ہستی مطلق کی ربوبیت کی طرف متوجہ ہوتا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ اس ذاتِ والاصفات کی اُلوہیت و ربوبیت کا کسی مذہب کسی صورت میں اس تک پہنچا۔ یا وہ بھی نہ پہنچا، لیکن اس کی طبیعت و فطرت تو بھی نہ کبھی اقرارِ اُلوہیت کے لیے تیار ضرور ہوتی ہے۔ مختلف زمانوں میں لوگوں نے انسان کے اسی فطری تقاضے کو غلط استعمال کرتے ہوئے اسے مظاہرِ قدرت کے سامنے جھکا دیا۔ گویا بت پرستی کے شعار کو اپنانے والے بھی اس

امر کا ثبوت تو فراہم کر ہی رہے ہیں کہ کوئی ہے ضرور، جسے انسان اپنا رب ماننا چاہتا ہے۔

## ۲۔ فجور و تقویٰ کا امتیاز

اسی طرح ہر شخص کی خلقی فطرت میں اچھائی برائی اور خیر و شر کے درمیان فرق کرنے کا داعیہ ضرور موجود ہوتا ہے۔ جس معاشرتی تصورات و معتقدات میں اس کی پرورش ہوتی ہے وہ اس کو معیارات امتیاز مہیا کرتے رہتے ہیں۔ لیکن یہ بنیادی داعیہ بہر صورت موجود ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بعض تغیر ناپذیر اخلاقی اقدار کو انسان تاریخ کے ہر دور میں برابر تسلیم کرتا چلا آیا ہے۔ قرآن حکیم میں اس امر کی طرف اس طرح اشارہ کیا گیا ہے:۔

فَأَلْهَمَهَا فُجُورَهَا وَتَقْوَاهَا (الشمس: ۸) — پس اللہ تعالیٰ نے نفسِ انسانی کے اندر بُرائی اور اچھائی دونوں کا شعور ودیعت کر دیا ہے۔

ایک اور مقام پر ارشاد ایزدی ہے:۔

فَهَدَيْنَاهُ النَّجْدَيْنِ (البلد: ۱۰) — پس ہم نے انسان کو نیکی اور بدی کے دونوں راستے دکھا دیئے ہیں۔

لوگ اخلاقی فضائل و رذائل یا معاشرتی و سماجی اچھائیوں اور برائیوں کے تصورات یا پیمانے انسانی اقدار کے نام پر، یا مذہب کے نام پر جو چاہیں اور جس طرح چاہیں مقرر کرتے پھریں۔ لیکن اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ فطرتِ انسانی کے اندر انصاف اور ظلم، خیر و شر اور نیکی و بدی کے درمیان امتیاز پیدا کرنے کا داعیہ موجود ہے اور کوئی بھی ذی شعور انسان اس فرق کے تصور سے بے نیاز نہیں ہو سکتا۔

## ۳۔ بصیرتِ نفس

ارشادِ ربانی ہے :۔

| | |
|---|---|
| بَلِ الْاِنْسَانُ عَلٰى نَفْسِهٖ بَصِيْرَةٌ (القیٰمۃ : ۱۴) | بلکہ انسان اپنے نفسی اعمال پر خوب نظر رکھتا ہے۔ |

یعنی خیر و شر کے امتیاز کے باعث انسان ذات کا خود محتسب ہے۔ وہ اپنے اعمال میں نفع و نقصان کو خوب جانتا ہے۔ اس لیے اسے اپنے اعمال کا ذمہ دار ٹھہرایا گیا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے :۔

| | |
|---|---|
| اِنَّمَا تُجْزَوْنَ مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ (التحریم : ۷) | بیشک تمہیں تمہارے کیے کی جزا و سزا ضرور ملے گی۔ |

ایک اور مقام پر ارشاد فرمایا گیا :۔

| | |
|---|---|
| وَ وُفِّيَتْ كُلُّ نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ (آلِ عمران : ۲۵) | اور ہر نفس کو اس کے اپنے کسب کا بدلہ مل کر رہے گا۔ |

ان آیات سے انسان کے اپنے اعمال کے کسب و ارتکاب میں صاحبِ ارادہ و اختیار ہونے کا پتہ چلتا ہے۔ اسی لیے اسے اپنے نفسی اعمال پر صاحبِ بصیرت گردانا گیا ہے اور جوابدہ بھی۔

## ۴۔ امانت کی ذمہ داری کا احساس

انسان کو ناصل اخلاق کے منصب کی امانت سے نوازا گیا ہے۔ یہ امانت خیر و شر کے درمیان امتیاز کی بنا پر جد و جہد کے ذریعے اخلاقِ کمال کے حصول سے عبارت ہے اور اسی کا نام "خلافتِ الٰہیہ" ہے۔ جو لِيَبْلُوَكُمْ اَيُّكُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا سے متحقق ہوتی ہے۔ اس کی ذمہ داری کا احساس بھی اس کے اندر خلقی طور پر موجود ہے۔ جس کے باعث وہ خود کو اپنے اعمال پر کسی نہ کسی

سطح پر جوابدہ ضرور سمجھتا ہے۔ وہ کبھی بھی اپنے افعال کے نتائج سے بری الذمہ نہیں ہو سکتا۔ جو رگ دنیا میں "فلسفہ جبریت" (DETERMINISIM) کا سہارا لے کر خود کو اخلاقی ذمہ داری سے بری قرار دینا چاہتے ہیں۔ اگر ان کے دل و دماغ کا تجزیہ کیا جائے تو یہ حقیقت ظاہر ہوگی کہ وہ بھی خود کو ان فلسفوں کے سہارے اپنے اعمال کے نتائج سے بری الذمہ تصور نہیں کر سکتے۔ انہیں اپنے ان خود ساختہ فریب ہائے فکر و نظر کی اصلیت کا احساس ہوتا ہے۔ یہ کاوشیں محض اپنے گناہ و معصیت سے لبریز کردار پر پردہ پوشی کی غرض سے ہوتی ہیں۔ ورنہ ان کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ بنا بریں انسان کے ضمیر سے یہ ندا اٹھتی ہے :۔

| | |
|---|---|
| فَعَلَيَّ إِجْرَامِيْ وَ أَنَا بَرِيْٓءٌ مِّمَّا تُجْرِمُوْنَ | پس میرے جرم کی ذمہ داری مجھ پر ہے اور میں تمہارے جرائم سے |
| (ہود : ۳۵) | بری الذمہ ہوں۔ |

متذکرہ بالا چار احساسات ہر انسان کے اندر خلقتاً موجود ہیں اور انہی کے مجموعے کا نام "فطرت بالقوۃ" ہے۔ جسے فطرتِ سلیمہ بھی کہا جاتا ہے۔ اسی کی طرف حدیثِ رسول ﷺ میں واضح اشارہ کیا گیا ہے :۔

| | |
|---|---|
| كُلُّ مَوْلُوْدٍ يُوْلَدُ عَلَى الْفِطْرَةِ (مسند امام احمد) | ہر بچہ فطرتِ صحیحہ پر پیدا ہوتا ہے۔ |

ایک اور روایت میں ارشاد ہوتا ہے :۔

| | |
|---|---|
| ما من مولود يولد الا على الفطرة فابواه يهودانه او ينصرانه او يمجسانه (متفق علیہ) | کوئی بچہ ایسا نہیں جو (مذکورہ بالا) فطرتِ صحیحہ پر پیدا نہ ہوتا ہو، بعد میں اس کے والدین اسے یہودی یا نصرانی یا مجوسی وغیرہ بنا دیتے ہیں۔ |

## فطرت بالفعل کے لوازمات

فطرتِ انسانی کا دوسرا پہلو "فطرت بالفعل" ہے۔ جس کا ذکر قرآن مجید میں اس طرح آیا ہے :۔

| | |
|---|---|
| زُيِّنَ لِلنَّاسِ حُبُّ الشَّهَوٰتِ | لوگوں کی طبیعتوں کو مزین کیا گیا ہے۔ |
| مِنَ النِّسَآءِ وَالْبَنِيْنَ | ان شہوانی اور نفسانی داعیات سے |
| وَالْقَنَاطِيْرِ الْمُقَنْطَرَةِ | جو عورتوں، بچوں، سونے چاندی کے |
| مِنَ الذَّهَبِ وَالْفِضَّةِ | ڈھیروں، آراستہ اور نشانزدہ گھوڑوں، |
| وَالْخَيْلِ الْمُسَوَّمَةِ وَالْاَنْعَامِ | مویشیوں اور کھیتیوں وغیرہ کی محبت |
| وَالْحَرْثِ (آل عمران ۱۴:۳) | سے متعلق ہیں۔ |

مذکورہ بالا آیت کی روشنی میں انسان کی فطرت بالفعل درج ذیل لوازمات وخصائص کا مرقع قرار پاتی ہے :۔

۱۔ شہوانی خواہشات اور نفسانی داعیات

۲۔ اولاد اور خونی قرابتوں کی محبت

۳۔ مال اور زر کی محبت

۴۔ جاہ و منصب کی محبت

انسان کی فطرت بالقوۃ کی طرح، فطرتِ انسانی کے اس پہلو کے بھی چار ہی لوازمات ہیں۔ جن کی تکمیل کی صورتیں مختلف اور متعدد ہو سکتی ہیں۔

## تضاد کی نوعیت اور اس کا حل

انسانی شخصیت تضاد کا شکار اس طرح ہوتی ہے کہ ایک طرف اس کی

"فطرت بالقوہ" کے تقاضے کام کرتے ہیں۔ جو خلقی احساسات' کے طور پر انسان کے لاشعور پر غالب رہتے ہیں۔ دوسری طرف اس کی "فطرت بالفعل" کے تقاضے کام کرتے ہیں۔ جو "جبلی داعیات" اور نفسانی خواہشات" کے طور پر انسان کے شعور کو متاثر کرتے رہتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ انسانی لاشعور عام طور پر "تقاضائے نیکی" سے متاثر اور مغلوب رہتا ہے اور انسانی شعور نفسانی داعیات یعنی تقاضائے بدی سے متاثر رہتا ہے۔ یہاں پر نفسِ انسانی ایک خلقی کشمکش کی صورتِ حال سے دوچار ہوتا ہے۔ اگر یہ تضاد برقرار رہے تو انسانی شخصیت اختلال و افتراق کا شکار ہو جاتی ہے۔ شعور اور لاشعور کے تقاضوں کی جنگ اس کا دماغی توازن تک مختل کر سکتی ہے۔ لہٰذا انسان یہ ضرورت محسوس کرتا ہے کہ "شعور" اور "لاشعور" کے تضاد کو رفع کیا جائے۔ یعنی تقاضائے نیکی و بدی کے درمیان اس مستقل تضاد و تصادم کی کیفیت کو ختم کیا جائے۔

اس تضاد کے خاتمے کی صرف ایک ہی صورت ہے۔ وہ یہ کہ دونوں کے درمیان سازگاری، مطابقت اور ہم آہنگی پیدا کی جائے۔ یہ ظاہر بات ہے کہ نیکی اور بدی کے درمیان تو مطابقت ہو نہیں سکتی۔ لہٰذا سازگاری کی صرف دو ہی صورتیں ہو سکتی ہیں۔

۱۔ تقاضائے نیکی (فطرۃ بالقوۃ) نشوونما پا کر تقاضائے بدی (فطرۃ بالفعل) کو اپنے تابع کرلے۔

یا ۲۔ تقاضائے بدی (فطرۃ بالفعل) نشوونما پا کر تقاضائے نیکی (فطرۃ بالقوہ) کو اپنے تابع کرلے۔ گویا لاشعور کے تقاضے شعور کے تقاضوں کو اپنے تابع اور مغلوب کرلیں۔

**یا**

شعور کے تقاضے لاشعور کے تقاضوں کو اپنے تابع اور مغلوب کرلیں۔

یہ عمل تب ہی ممکن ہے کہ دونوں میں سے کسی ایک کو فروغ اور نشوونما دیا جائے۔ اگر ایک تقاضا نشوونما پائے تو دوسرا ازخود مغلوب ہو کر اس کے تحت منظم اور منضبط ہو جائے گا۔ چونکہ دونوں تقاضے فطری اور طبعی ہیں۔ ان میں سے کسی ایک کو بھی کلیتہً ختم نہیں کیا جا سکتا اور نہ ہی کسی ایک تقاضے کی تکمیل کلیتہً رد کی جا سکتی ہے۔ اس طرح انسانی شخصیت غیر متوازن ہو جائے گی۔ شخصیت کے توازن کا تقاضا یہی ہے کہ

- شعور اور لاشعور کے تقاضوں کا تضاد بھی ختم ہو۔
- اور ایک کو دوسرے پر غالب کر کے مغلوب تقاضے کی تکمیل بھی نظم و ضبط کے ساتھ جاری رہے

اگر تقاضائے شعور جو نفسانی داعیات پر مبنی ہے غالب آجائے اور لاشعور کا تقاضائے نیکی مغلوب ہو تو شخصیت منفی طرز پر ڈھل جائے گی اور یہ مطابقت تخریبی نوعیت کی ہوگی۔ جس کا اشارہ اس حصۂ آیت میں موجود ہے۔

قَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰهَا — وہ ہلاک ہو گیا جس نے نفسِ انسانی کو گناہ و معصیت کے نیچے دبا دیا۔ (الشمس: ۱۰)

اور اگر تقاضائے لاشعور جو نیکی کے احساسات پر مبنی ہے۔ غالب آجائے اور شعور کا تقاضائے بدی مغلوب ہو تو شخصیت مثبت طرز پر ڈھلے گی اور یہ مطابقت تعمیری نوعیت کی ہوگی۔ جس کا اشارہ اس حصۂ آیت میں موجود ہے

قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰهَا — وہ فلاح پا گیا جس نے اپنے نفس کو نیکی سے نشوونما دی۔ (الشمس: ۹)

پس مطلوب یہی ہے کہ تقاضائے نیکی کو اس قدر فروغ اور نشوونما دی جائے کہ تقاضائے بدی اس کے تحت منظم ہو کر اپنی تکمیل کر سکے۔ اس طرح مطابقت

کے ذریعے تضاد بھی ختم ہو گا۔ دونوں تقاضوں کی تکمیل بھی ہو گی اور شخصیت بھی متوازن رہے گی۔

## پیغمبرانہ تربیت کا اثر

پیغمبرانہ تربیت کا مقصد اور اس کا اثر بھی یہی ہوتا ہے کہ انسانوں کی فطرۃ بالقوۃ" کے خلقی میلانات کو فروغ دے کر اس کی "فطرۃ بالفعل" کے طبعی داعیات کو ان کے تحت منظم کر دیا جاتا ہے۔ "فطرۃ بالقوۃ" کے خلقی میلانات سراسر تقاضائے نیکی ہوتے ہیں انسان کے اندر فروغ پا کر زندہ قوت بن جاتے ہیں اور انسان کے طبعی داعیات جو "فطرۃ بالفعل" کے تقاضے ہیں ان کے تحت منظم اور منضبط صورت میں مقررہ قواعد وضوابط اور شرعی اصولوں کے مطابق تکمیل پذیر ہونے لگتے ہیں۔ تو پھر ان کی تکمیل "بدی" نہیں رہتی بلکہ وہ بھی اخلاقی عمل قرار پا جاتی ہے۔ جب تک فطرت بالفعل کی نفسانی خواہشات اور طبعی داعیات بغیر نیکی سے مغلوب ہوئے آزادانہ طور پر اپنی تکمیل کرتے رہیں "بدی" وجود میں آتی رہتی ہے۔ وہ تمام محبتیں جو نفسِ انسانی میں طبعاً ودیعت کی گئی ہیں گناہ ومعصیت اور غیر اخلاقی جرائم کی صورت میں ظہور پذیر ہوتی رہتی ہیں۔ لیکن جب نفسانی خواہشات کے یہی فطری تقاضے فطرۃ بالقوۃ کے خلقی تقاضوں کے تحت منظم اور منضبط ہو جاتے ہیں تو اندریں صورت ان کی تکمیل بھی بدی نہیں بلکہ نیکی بن جاتی ہے۔ حصولِ مال کا تقاضا بھی نیکی کے زیر اثر نیکی بن جاتا ہے۔ نفسانی شہوت کی تکمیل بھی نیکی کے اصولوں کے تحت بصورتِ نکاح نیکی بن جاتی ہے۔ الغرض تمام داعیات کی تکمیل مناکحات ومعاملات کی صورت میں سراسر عبادت بن جاتی ہے بلکہ اس شرط کے پورا ہو جانے کے بعد ساری زندگی

عبادت اور کامل بندگی میں بدل جاتی ہے۔

جب نفسِ انسانی میں تقاضائے نیکی اس طرح غالب آکر فروغ پاجائے کہ تقاضائے بدی اس کے تحت منضبط ہو جائے تو بدی، بدی نہیں رہتی بلکہ اس کی ماہیت ہی بدل جاتی ہے۔ اسی عمل کو "تزکیہ نفس" کہتے ہیں کہ "نفس بدی سے پاک ہوگیا اور نیکی کو نشو و نما نصیب ہوگئی"۔

اسی لیے تربیت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کی نسبت ارشاد فرمایا گیا:

| | |
|---|---|
| يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ (آلِ عمران: ۱۶۴) | وہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم ان پر اللہ تعالیٰ کی آیات پڑھتے ہیں۔ پھر ان کا تزکیہ نفس فرماتے ہیں اور پھر انہیں کتاب و حکمت کی تعلیم دیتے ہیں۔ |

تلاوت آیات کو تزکیہ نفس پر اس لیے مقدم رکھا گیا کہ ان کے ذریعے انہیں اپنی اصلاح و تزکیہ کی تحریک و تشویش ہو۔ ان کا شعور بیدار ہو اور پھر جب انہیں نیکی کے فروغ کے لیے تشویش لاحق ہو چکے تو اس کے بعد نگاہ مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم ان کے تزکیہ نفوس میں مصروف ہو جائے۔

خلاصہ کلام یہ ہوا کہ فطری تقاضوں کا یہ جبلی تضاد خود ہی اصلاح و تزکیہ کی تحریک پیدا کرتا ہے۔ کیونکہ جب نفس پر فطرت بالفعل کے داعیات غالب ہوتے ہیں تو نفس "نفسِ امارہ" کی حالت اختیار کر لیتا ہے۔ جس کا ذکر قرآن یوں کرتا ہے:-

| | |
|---|---|
| اِنَّ النَّفْسَ لَاَمَّارَةٌۢ بِالسُّوْٓءِ (یوسف: ۵۳) | بیشک نفس برائی کا سخت میلان رکھنے والا ہے۔ |

یہ حالت انسان کے لاشعور اور اس کی فطرت بالقوۃ کو قبول نہیں ہوتی

اس لیے اس کے اندر ایک ہیجان اور اضطراب پیدا ہو جاتا ہے۔ رضائے الٰہی کا نصب العین چاہتا ہے کہ اسے اس حالت سے نکالا جائے۔ چنانچہ وہ فطرۃً بالقوۃ کے احساسات کی طرف سنجیدگی سے متوجہ ہوتا ہے۔

پھر یہ نفسِ امارہ عملِ تزکیہ سے برائی اور اچھائی کے امتیاز کے ذریعے

- "نفسِ ملھمہ" میں بدل جاتا ہے جو بعد ازاں نیکی کے فروغ و ارتقار کے باعث
- "نفسِ لوّامہ" میں بدل جاتا ہے۔ جب اس میں نیکی اور تقویٰ کو قرار و دوام ملتا ہے تو یہ
- "نفسِ مُطمئنّہ" میں بدل جاتا ہے۔ جب یہ نفس ہر حال میں ذاتِ حق سے راضی ہو جاتا ہے تو یہ
- "نفسِ راضیہ" میں بدل جاتا ہے اور جب ذاتِ حق خود اس سے راضی ہو جاتی ہے۔
- "نفسِ مرضیہ" میں بدل جاتا ہے اور اس "مقامِ مرتضےٰ" کو پاکر "نفسِ کاملہ" بن جاتا ہے۔ جسے ندا آتی ہے۔

| | |
|---|---|
| فَادْخُلِیْ فِیْ عِبَادِیْ | میرے محبوب بندوں میں شامل ہو جا |
| وَادْخُلِیْ جَنَّتِیْ | اور میری پُرسکون جنت میں آجا |

(الفجر: ۲۹-۳۰)

باب چہارم

# حصولِ نصب العین کا طریقِ کار

تزکیہ نفس کی حیثیت تو محض حصولِ نصب العین کے محرک کی تھی۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس کا طریقِ کار کیا ہے؟ طریقِ کار، لائحہ عمل کا دوسرا بنیادی لازمہ ہے۔ قرآنِ مجید اس امر پر شاہد ہے کہ "رضائے الٰہی کے نصب العین کے حصول کا طریقِ کار صرف اور صرف فعلِ احسان ہے۔

## احسان کا مفہوم

احسان عام طور پر کسی پر بھلائی اور انعام کرنے کو کہتے ہیں۔ اس کا مفہوم صحیح طور پر اس آیت سے واضح ہوتا ہے:-

| | |
|---|---|
| إِنَّ اللّٰهَ يَأْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْإِحْسَانِ (النحل: ۹۰) | بیشک اللہ عدل اور احسان (دونوں) کا حکم دیتا ہے۔ |

آیتِ مذکورہ میں دو چیزوں کا بیان ہے:-

۱ — عدل  ۲ — احسان

دونوں کا فرق امام راغب اصفہانیؒ یوں بیان کرتے ہیں:-

| | |
|---|---|
| العدل — هو ان يُعطِيَ ما عليه و يأخذ مالهٗ | عدل یہ ہے کہ جس قدر دینا فرض ہو اسی قدر دیا جائے اور جس قدر لینا ہو اسی قدر لیا جائے۔ |

| | |
|---|---|
| الاحسان ـــــ هو ان يعطى اكثر مما عليه و ياخذ اقل مما لهٗ | احسان یہ ہے کہ جس قدر دینا فرض ہو اس سے زیادہ دیا جائے اور جس قدر لینا حق ہو اس سے کم لیا جائے۔ |

(المفردات)

اس سلسلے میں میری رائے یہ ہے کہ "عدل و احسان" کا مذکورہ معیار کم سے کم حد پر مبنی ہے۔ کیونکہ اس کا تو حکم دیا جا رہا ہے اور حکم اس واجب التعمیل امر کا نام ہوتا ہے جس کا ترک گناہ ہو۔ اگر یہ کم سے کم عدل اور احسان بھی نہ ہو تو انسان گناہگار ہو جائیگا۔

لہٰذا احسان کا یہ مفہوم اہلِ ایمان کے لیے درجۂ فرض میں ہے۔ اسے مطلق احسان سے تعبیر کیا جا سکتا ہے اور "کمالِ احسان" یہ ہے کہ انسان اپنا سارا کا سارا حق دوسروں کے لیے قربان کر دے۔

مذکورہ بالا مفہوم ایک حدیثِ رسولؐ سے یوں واضح ہوتا ہے :۔

| | |
|---|---|
| عن انس قال قال رسول الله صلى الله عليه وسلم والذى نفسى بيده لا يؤمن عبدٌ حتى يحب لاخيه ما يحب لنفسه (متفق علیہ) | حضور علیہ السلام نے فرمایا۔ اس ذات کی قسم جس کے قبضۂ قدرت میں میری جان ہے۔ کوئی شخص بھی اس وقت تک صاحبِ ایمان نہیں ہو سکتا جب تک وہ اپنے بھائی کے لیے وہی کچھ پسند نہ کرے جو اپنی ذات کے لیے پسند کرتا ہے۔ |

ہمارے نزدیک اس حدیث میں بھی آیت مذکورہ کی طرح دو حالتیں بیان کی گئی ہیں :۔

عدل اور احسان، اور دونوں حالتیں تقاضائے ایمان قرار دی گئی ہیں۔
**حالتِ عدل** میں مسلمان ہونے کے لیے کم از کم شرط یہ ہے کہ انسان اس حد تک بے لوث اور بے غرض ہو، اور معاشرے کے دیگر افراد کے حق میں اس حد تک دردمند، بہی خواہ، نفع بخش اور فیض رساں ہو جائے کہ جو کچھ وہ اپنی ذات کے لیے پسند کرے یا روا رکھے کم از کم وہی دوسروں کے لیے بھی پسند کرے اور ہوسکے تو مہیا کرے۔ یعنی اپنے حقوق و مفادات اور دوسروں کے حقوق و مفادات میں کوئی فرق تصور نہ کرے۔ دوسروں کی عزت بھی اتنی ہی عزیز سمجھے جتنی کہ اپنی، دوسروں کا مال بھی اتنا ہی عزیز سمجھے جتنا کہ اپنا۔ اگر خادم رکھتا ہو تو اسے حدیثِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے مطابق اس معیار کا لباس پہنائے جیسا خود پہنتا ہے۔ اسی معیار کا کھانا کھلائے جیسا خود کھاتا ہے۔ وہی ضروریاتِ حیات اور تحسینات رہائش مہیا کرے جو اپنے لیے استعمال کرتا ہے۔ اگر معاشرے کے لوگ بنیادی ضروریات سے محروم ہوں اور صاحبِ دولت تعیشات کی زندگی بسر کرتا ہے تو یہ عدل کے خلاف ہے۔ یعنی جو سہولتیں وہ خود کو مہیا کرنا چاہتا ہے۔ دوسروں کے لیے بھی انہی کا خیال رکھے۔ اگر یہ احساس اور دردِ دل و دماغ میں مفقود ہو اور عمل ان خصائص سے عاری ہو تو زندگی خلافِ عدل ہوگی کیونکہ خلافِ عدل کو ظلم کہتے ہیں اور ظلم منافیٔ ایمان ہے۔ اس صورت میں یہ سمجھنا چاہیے کہ ایمان کا ادنیٰ تقاضا بھی پورا نہیں ہو رہا۔

**حالتِ احسان** یہ کمالِ ایمان سے متعلق ہے۔ پہلی صورت میں جو کچھ اپنی ذات کے لیے پسند تھا۔ اسی کے برابر دوسروں کے لیے بھی پسند کرنے کا حکم دیا جا رہا تھا اس صورت میں انسان اپنے حق سے دستبردار نہیں ہو رہا تھا بلکہ مفہوم یہ تھا کہ جن لذاتِ حیات سے تم خود لطف آشنا ہو رہے ہو۔ ان سے دوسروں کو بھی متمتع ہونے کا موقع دو۔ لیکن حالتِ احسان میں تصور بدل گیا۔ یہاں تقاضائے ایمان

یہ ہے کہ:۔

| | |
|---|---|
| حتیٰ یحب لاخیہ ما یحب لنفسہٖ (متفق علیہ) | جو اس نے اپنی ذات کے لیے پسند کیا تھا۔ وہی بجائے اپنی ذات پر صرف کرنے دوسروں کے لیے صرف کر دے۔ |

ذرا غور فرمائیے۔ حدیث میں مثل ما یحب لنفسہٖ (جو کچھ اپنے لیے پسند کرتا ہے اسی کا مثل دوسروں کے لیے بھی پسند کرے) کے الفاظ نہیں آئے بلکہ الفاظ یہ ہیں ما یحب لنفسہٖ کہ وہی جو اپنے لیے پسند کرتا ہے۔ خود پیکرِ ایثار بن کر دوسرے کو اس سے فیضیاب کر دے۔

- **عدل** یہ تھا کہ خود بھی لطف اٹھائے اور دوسروں کو بھی اٹھانے دے۔
  **احسان** یہ ہے کہ اپنا لطف قربان کر کے دوسروں کو بہم پہنچا سکے۔
- **عدل** یہ تھا کہ اپنے لیے بھی جئے اور دوسروں کے لیے بھی۔
  **احسان** یہ ہے کہ صرف "دوسروں کے لیے زندہ رہے"
- **عدل** یہ تھا کہ کسی کو دکھ نہ پہنچے۔
  **احسان** یہ ہے کہ اپنے سکھ بھی دوسروں میں بانٹ دے۔
- **عدل** شرطِ ایمان تھا اور احسان کمالِ ایمان۔
- **عدل** مساوات تھی اور احسان سراسر ایثار۔

احسان کی مثال ایک جنگ کے مشہور واقعے سے بخوبی سمجھ میں آ سکتی ہے جس میں کئی صحابہ زخموں کی تاب نہ لاتے ہوئے جامِ شہادت نوش فرمانے والے تھے۔ کسی نے پیاس کی شدت میں پانی مانگا۔ انہیں پیش کیا گیا۔ ابھی وہ پیالہ لبوں کے قریب نہ کر پائے تھے کہ دوسرے صحابی کی آواز آئی۔ "پانی دو" انہوں نے

وہیں سے پانی بہا دیا۔ دوسرا پیا اس کو پلاؤ، پیالہ ان کی طرف کردیا گیا۔ جب وہ پینے لگے تو تیسرے صحابی کی آواز آئی۔ "پانی دو"۔ انہوں نے بھی بغیر پیئے پیالہ آگے بڑھا دیا۔ اسی طرح متعدد صحابہ کی آوازیں بلند ہوئیں۔ ہر ایک نے دوسرے کی خاطر ایثار کیا۔ یہاں تک کہ سب شہید ہو گئے اور پانی کوئی نہ پی سکا۔ یہ "فعلِ احسان" تھا کہ اپنی منفعت دوسروں کی خاطر قربان کردی اور دوسروں کی زندگی بھی اپنی زندگی سے عزیز تر سمجھی۔ اسی حالت اور عمل کا نام دردِ دل ہے جو وجہِ تخلیقِ انسانیت ہے۔ سہ

درد دل کے واسطے پیدا کیا انسان کو
ورنہ طاعت کے لیے کچھ کم نہ تھے کروبیاں

**عدل اور احسان کا موازنہ** عدل اور احسان کے تقابل جاننے کے لیے یہ حدیث عرض کرتا ہوں۔ جس کے راوی خود حضرت عمرؓ ہیں۔ آپ فرماتے ہیں:-

امرنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان نتصدق، ووافق ذالک عندی مالاً فقال الیوم اسبق ابابکر ان سبقتہ یوماً قال فجئت بنصف مالی، فقال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم "ما ابقیت لاھلک؟" قلت مثلہٗ، واتٰی ابوبکر بکل ما عندہٗ، فقال لہٗ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم "ما

ایک روز ہمیں رسول اللہؐ صلی اللہ علیہ وسلم نے صدقہ کرنے کا حکم صادر فرمایا۔ اس دن میرے پاس زیادہ مال تھا۔ میں نے کہا کہ آج ابو بکرؓ مجھ سے سبقت نہیں لے سکتے۔ میں نے اپنے تمام مال میں سے نصف حضور علیہ السلام کی خدمت میں پیش کردیا۔ حضور علیہ السلام نے پوچھا! عمر اپنے گھر والوں کے لیے کیا چھوڑ آئے ہو؟ میں نے عرض کیا یا رسول اللہؐ! نصف مال چھوڑ آیا ہوں۔ اتنے میں ابوبکرؓ اپنا سارا کا سارا مال لے کر حاضر ہو گئے۔ حضور صلے اللہ علیہ وسلم

ابقيت لأهلك ؟" قال: ابقيت لهم الله ورسوله : قلت لا اسبقه الى شئ ابداً

(ترمذی، ابوداؤد)

نے ان سے فرمایا۔ " ابوبکر، گھر والوں کے لیے کیا چھوڑ آئے ہو؟" انھوں نے جواب دیا۔ گھر والوں کے لیے خدا اور خدا کا رسولؐ چھوڑ آیا ہوں۔" اس دن میں نے اعتراف کر لیا کہ میں کبھی بھی کسی چیز میں ان سے سبقت نہیں لے سکتا

اس حدیث سے بخوبی واضح ہو گیا کہ فعلِ عمرؓ ـــ عدل کا غماز تھا اور فعلِ ابی بکرؓ ـــ احسان کا آئینہ دار تھا۔ اسی وجہ سے بعض محدثین نے مزید بیان کیا ہے کہ جب حضرت ابوبکرؓ نے گھر کا سارا مال یہاں تک کہ ضرورت کے کپڑے بھی خدا کی راہ میں دیدیئے تو حضرت جبرئیل امینؑ بارگاہِ نبویؐ میں حاضر ہوئے اور عرض کیا " یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ابوبکرؓ سے فرمائیے کہ ان کا رب انہیں سلام کرتا ہے اور پوچھتا ہے :۔

اراض انت عنی فی فقرك هذا ام ساخط

کیا تو مجھ سے اپنے فقر کی اس حالت میں راضی ہے یا ناراض

گویا احسان کرنے والوں کو ایسا "مقامِ مرتضیٰ" نصیب ہو جاتا ہے جہاں

؎ خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے

اِدھر بندہ خدا کو منانے کی فکر میں ہے۔ اُدھر خدا بندے کو منانے کا آرزو مند ہے۔ یہاں پر :۔

رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوا عَنْهُ

اللہ ان سے راضی ہو گیا، وہ اللہ سے راضی ہو گئے

اور يُحِبُّهُمْ وَيُحِبُّوْنَهٗ

(المائدہ: ۵۴)

اللہ ان سے محبت کرتا ہے اور وہ اس

سے محبت کرتے ہیں

کا پُر کیف منظر دیکھنے میں آتا ہے۔

مذکورہ بالا وضاحت کی روشنی میں "احسان" کا مفہوم تو واضح ہو چکا ہے کہ یہ "سراسر ایثار" کا نام ہے۔ اب ہم قرآنِ مجید کے حوالے سے اس کا مقام متعین کرتے ہیں۔

## فعلِ احسان اور احکامِ قرآنی

۱۔ قرآنِ حکیم صحابہ کرام میں سے مہاجرین و انصار کو "السّابقون الاوّلون" کی اصطلاح سے تعبیر کرتا ہے۔ اس کی وجہ صرف یہی تھی کہ مہاجرین نے رضائے الٰہی کی خاطر ایثار و قربانی کا وہ معیار پیش کیا تھا جو رشکِ عالم تھا۔ وہ مال و جائیداد، بیوی بچے، جاہ و منصب، کاروبار و تجارت الغرض تمام دنیوی منافع اور ضروریاتِ حیات یکسر قربان کر کے تنِ تنہا رضائے ایزدی کے لیے گھر بار اور وطن کو چھوڑ کر مدینہ ہجرت کر آئے تھے۔ جہاں ان کی حیثیت محض نو وارد اجنبیوں کی تھی۔ لیکن اس ایثار پر ان کے دل میں کوئی ملال نہ تھا۔ دوسری طرف انصار وہ اہلِ مدینہ تھے جنہوں نے مہاجرین کی خاطر "مواخات" کی صورت میں ایثار و قربانی کی وہ مثال پیش کی تھی۔ جس کی نظیر آج تک تاریخ مہیا نہیں کر سکتی۔ گویا مہاجرین و انصار کا دیگر صحابہ کرام پر امتیاز اور فوقیت ہی یہی تھی کہ ان جیسا ایثار کہیں اور میسر نہ آ سکتا تھا ان کا ذکر کرتے ہوئے قرآنِ مجید میں ارشاد ہوتا ہے:۔

| | |
|---|---|
| وَالسّٰبِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ | سب سے پہلے سبقت لینے والے |
| مِنَ الْمُهٰجِرِيْنَ وَالْاَنْصَارِ | مہاجرین و انصار (ہیں) اور جو لوگ بعد |
| وَالَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُمْ بِاِحْسَانٍ | میں بھی فعلِ احسان کے ذریعے ان کی |

رَّضِیَ اللّٰہُ عَنْھُمْ وَرَضُوْا عَنْہُ ـــــــــ ذٰلِکَ الْفَوْزُ الْعَظِیْمُ (التوبہ : ۱۰۰)

اتباع کریں گے ۔ اللہ تعالیٰ ان سب پر راضی ہوگا اور وہ اللہ سے راضی ہوں گے ۔ اور یہی سب سے بڑی کامیابی ہے

یہاں دو اجزاء و سعادت کی اتباع جس شرط "فعل احسان" کی لگادی گئی ہے "فوز عظیم" سے الہی کا تقاضہ ۔ یعنی فعل احسان اپنائے بغیر حاصل نہیں ہوسکتا۔

۲ـ ہر نیکی اور عبادت کی جزا ثواب اور اخروی نعمتوں کی صورت میں مذکور ہوتی ہے ' احسان ' چونکہ ایک ایسا طرز عمل ہے جس میں انسان دوسرے کی خاطر اپنے آپ کو بھول جاتا ہے ۔ اس میں کسی پر لطف و عنایت اور رحم و کرم کی کوئی حد نہیں ہوتی ۔ کیونکہ جہاں حد بندی کا تصور ہوگا وہ ' عدل ' بن جائے گا ۔ باری تعالیٰ فرماتے ہیں ۔ ہر بھلائی اور نیکی کی کوئی نہ کوئی مخصوص جزا ہوتی ہے لیکن :۔

هَلْ جَزَآءُ الْإِحْسَانِ إِلَّا الْإِحْسَانُ (الرحمٰن : ۶۰)

فعل احسان کی جزا (میرے فرمانے میں) سوائے احسان کے اور کچھ نہیں

جو کوئی کسی پر احسان کرے گا ۔ میں اس پر جزاءً احسان ہی فرماؤں گا ۔ یعنی اس پر اتنی عنایات کروں گا جن کا وہ اپنے اعمال کے لحاظ سے مستحق بھی نہ ہوگا ۔ اسی عمل کو اصطلاحاً " احسان " کہتے ہیں ۔ کیونکہ استحقاق کے برابر دینا عدل کہلاتا ہے اور اس سے زیادہ دینا احسان ۔

۳ـ باری تعالیٰ فرماتے ہیں ۔ احسان کرنے والے میرے محبوب ہو جاتے ہیں :۔

وَالْكَاظِمِيْنَ الْغَيْظَ وَالْعَافِيْنَ عَنِ النَّاسِ ۝ وَاللّٰہُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ (آل عمران : ۱۳۴)

متقی اور پرہیزگار لوگ ہیں جو غصہ پی جاتے ہیں ۔ لوگوں کو ان کی خطاؤں پر معاف کر دیتے ہیں اور جو لوگ احسان

کرتے ہیں انھیں تو اللہ اپنا محبوب بنالیتا ہے۔

۴۔ ایک اور مقام پر ارشاد فرمایا گیا:۔

وَاَحْسِنُوْا اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ (البقرہ : ۱۹۵)

اور تم احسان کرو، کیونکہ احسان کرنے والوں سے اللہ محبت کرتا ہے۔

۵۔ ایک اور مقام پر ارشاد فرمایا گیا:

ثُمَّ اتَّقَوْا وَّ اَحْسَنُوْا ط وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ (المائدہ : ۹۳)

پھر وہ اللہ سے ڈریں اور احسان کریں اور اللہ احسان کرنے والوں سے محبت کرتا ہے۔

۶۔ ایک اور مقام پر ارشاد ہوتا ہے:۔

اِنَّ اللّٰهَ لَا يُضِيْعُ اَجْرَ الْمُحْسِنِيْنَ (التوبہ: ۱۲۰)

بیشک اللہ تعالےٰ احسان کرنے والوں کے احسان کا ثمرہ بہرصورت عطا کرکے رہتا ہے۔

۷۔ اس کے امکانِ عمل کی صورت تزیں بیان فرمائی گئی کہ:۔

اِنَّ رَحْمَتَ اللّٰهِ قَرِيْبٌ مِّنَ الْمُحْسِنِيْنَ (الاعراف:۵۶)

بے شک اللہ تعالیٰ کی رحمت احسان کرنے والوں کے بالکل قریب ہوتی ہے

۸۔ اسی طرح فرمایا گیا:۔

نُصِيْبُ بِرَحْمَتِنَا مَنْ نَّشَآءُ وَلَا نُضِيْعُ اَجْرَ الْمُحْسِنِيْنَ (الاعراف : ۵۶)

ہم جسے چاہتے ہیں اپنی رحمت کا انعام عطا فرماتے ہیں لیکن احسان کرنے والوں کا احسان کبھی بھی ہماری رحمت کے (بالفعل) انعام سے محروم نہیں رہتا۔

- اس وجہ سے احسان اپنا صلہ پاکر ہی رہتا ہے۔ کیونکہ دوسری نیکی پر ہماری رحمت کبھی معجل ہوتی ہے اور کبھی مؤجل یعنی کبھی جلدی اور کبھی دیر سے۔ لیکن فعل احسان کے ساتھ رحمت کا تعلق اتنا قریب ہے کہ وہ مؤخر ہو ہی نہیں سکتی۔

۹۔ اب اسکے امکانِ عمل کی صورت بیان کی جا رہی ہے :۔

| | |
|---|---|
| وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا وَ اِنَّ اللّٰهَ لَمَعَ الْمُحْسِنِيْنَ (العنکبوت : ۶۹) | اور جو لوگ ہماری خاطر مجاہدہ کرتے ہیں ہم ان پر اپنے تمام راستے کھول دیتے ہیں اور بیشک اللہ تعالٰی احسان کرنے والوں کے ساتھ ہے۔ |

- یہاں یہ نکتہ واضح کیا جا رہا ہے کہ جو لوگ ہماری خاطر مجاہدہ کرتے ہیں۔ ہماری رضا کے لیے اپنی ذات اور اپنی منفعتوں کو قربان کر دیتے ہیں۔ وطیرۂ احسان اپنا کر سراپا ایثار ہو جاتے ہیں اور اپنی خودی کو مٹا دیتے ہیں۔ ہم ان پر اپنے تمام راستے کھول دیتے ہیں۔ یہاں تک کہ ہماری رضا خود بڑھ کر انہیں تھام لیتی ہے۔ جب بندہ ہماری خاطر خود کو فراموش کر دیتا ہے۔ ہم اس کی خاطر اسی کے ہو جاتے ہیں۔ پھر وہ جو کچھ چاہتا ہے اسے ملتا ہے اور رضاءِ الٰہی بھی خود اس کی رضا کی منتظر ہو جاتی ہے

## حدیثِ جبریل سے مفہومِ احسان کا تعین اور اس کا ثمرہ

مذکورہ بالا آیت سے مستخرجہ معنٰی کی تائید صحیح بخاری کی اس حدیث سے پیش کرنا چاہتا ہوں۔ جسے اصطلاح محدثین میں "حدیثِ جبریل" کہا جاتا ہے۔ بارگاہِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں ایک مرتبہ جبریل امین نے ایک اعرابی کی شکل میں حاضر ہو کر "ایمان" اور "اسلام" کی بابت سوال کیا اور بعد ازاں پوچھا :۔

| | |
|---|---|
| ما الاحسان قال الاحسان ان | یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم احسان کیا |

تعبد اللہ کانک تراہ فان لم تکن تراہ فانہٗ یراک۔
(البخاری)

ہے: آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ احسان یہ ہے کہ تو اللہ کی عبادت اس طرح کرے گویا تو اللہ کو دیکھ رہا ہے۔ (یعنی تو نے اسے پالیا ہے) اگر تو اسے نہ دیکھ سکے (یا نہ پا سکے) تو کم از کم تیری حالت یہ ہو کہ وہ تجھے دیکھ رہا ہے۔

مذکورہ بالا حدیث کی شرح میں عام طور پر محدثین کے دو موقف رہے ہیں جن میں ایک امام ابن حجر عسقلانیؒ کا ہے اور دوسرا علامہ نوویؒ کا۔

امام عسقلانیؒ عبارتِ حدیث میں "اِنْ" کو "شرطیہ" مانتے ہوئے حکم کو دو حالتوں پر محمول قرار دیتے ہیں کہ احسان کی پہلی حالت "حالتِ مشاہدہ" ہے اور دوسری "حالتِ مراقبہ" — جب کہ امام نوویؒ "ان" کو "وصلیہ" مانتے ہیں اور حکمِ حدیث میں سارا زور صرف "حالتِ مراقبہ" پر ہی دیتے ہیں۔ ان کی بحث کا خلاصہ یہ ہے کہ

یک چشم زدن غافل ازاں شاہ نباشی
شاید کہ نگاہے کند آگاہ نباشی

بندہ محبوبِ حقیقی کی یاد کو پورے استحضار کے ساتھ دل میں قائم رکھے۔ اس کے تصورات مشاہدہ و مکاشفہ کے دریاؤں میں غوطہ زن رہے۔ ہر وقت پورے دھیان، انہماک اور استغراق کے ساتھ اپنے قلب کو اسی طرف مشغول رکھے۔ حضورِ دوام کی دولت سے مالامال رہے۔ جب دل کے تمام گوشے محبوب کے ذکر و فکر اور تصور سے معمور ہو جائیں۔ اندرونی حواس کی نس نس میں وہی سما جائے تو اس کے نتیجے میں وہ ظاہری دنیا میں جو کچھ بھی دیکھے گا۔ سب بے خیالی اور بے دھیانی کی نظر ہو جائے

کا۔ جب استغراق کی یہ حالت نصیب ہو جائے تو حجابات اُٹھ جاتے ہیں۔ حق تعالیٰ کے مشاہدے کا مقام حاصل ہو جاتا ہے۔ اسی لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

جعلت قرۃ عینی فی الصلوٰۃ — نماز میں مجھے آنکھوں کی ٹھنڈک نصیب ہوتی ہے۔

یہ آنکھوں کی ٹھنڈک یقیناً دیدارِ محبوب کا ثمرہ ہوتی ہے۔ لیکن احتیاط کا یہ عالم ملحوظ رہنا چاہیئے کہ اس سفر میں ایک لمحے کی غفلت اور بے دھیانی بھی ہزاروں طے شدہ مسافتیں ضائع کر دیتی ہے۔ بقول شخصے ؎

ماندم کہ خار از پا کشم محمل نہاں شد از نظر
یک لحظہ غافل بودم و صد سالہ منزل دُور شُد

● یہ گفتگو تو ضمنی طور پر کر دی گئی ہے۔ اس وقت ہماری بحث "احسان" کی اس صورت سے ہے۔ جس کا بیان ملا علی قاری نے "مرقاۃ المفاتیح" میں کیا ہے۔ اس لحاظ سے عبارتِ حدیث میں "فان لم تکن" میں "کانَ" "تامّہ" ہے "ناقصہ" نہیں۔ لہٰذا "فَاِنْ لَمْ تَكُنْ تَرَاهُ" کی تیسری تعبیر جس کا تعلق ہمارے موضوع سے ہے۔ یہ ہوئی کہ پہلے حدیث میں "احسان" کی تعریف بیان کر دی۔ یعنی "احسان، عبادت کی اس حالت کا نام ہے جس میں بندہ خدا کو پالے"۔ اب ضروری تھا کہ اس حالتِ احسان کو حاصل کرنے کی عملی صورت بھی بتائی جاتی کہ آخر یہ حالت بندے کو نصیب کس طرح ہوگی؟ اس مقامِ احسان کو پانے کی عملی صورت کیا ہے؟ بندہ کیا کرے کہ اس درجہ احسان تک پہنچ جائے جہاں اسے وصالِ حق کی دولت نصیب ہو سکے؟

پس اس کا جواب بھی اس حدیث نے فراہم کر دیا۔ الفاظِ حدیث پر دوبارہ ترتیبِ نو کے ساتھ توجہ فرمائیں۔ ارشاد ہوتا ہے "فان لم تکن، تراہ"

اگر حالتِ احسان کے ذریعے خدا کو پانا چاہتے ہو تو اس کی ممکن العمل صورت یہ ہے "فان لم تکن" (کہ تم خود نہ رہو) یعنی اپنی ذات کو فنا کردو۔ خود کو، اپنے منافع و مفادات کو، اور اپنی ہوس و خواہش کو اس طرح بھول جاؤ گویا تم معدوم ہو گئے ہو۔ جب تم خود نہ رہو گے "تراہ" (تو تم اس کو پالو گے) لہٰذا وصالِ ذات کی شرط فنائے ذات قرار دیدی گئی۔ بقول حضرت خواجہ اجمیریؒ ؎

اگر بقا طلبی اولت فنا باید
کہ تا فنا نشوی رہ نمی بری بہ بقا

اور بقول علامہ اقبالؒ ؎

کمالِ زندگی دیدارِ ذات است
طریقش رستن از بندِ جہات است

حدیثِ احسان کا مطلب یہ ہوا کہ اگر تمہارا وجود فنا ہو جائے جو حق تعالیٰ کی رؤیت و مشاہدہ میں حاجب و مانع ہے تو تم اللہ کو دیکھ لوگے۔

لہٰذا احسان کا معنیٰ یہ قرار پایا کہ بندہ اپنی ذات سے بے نیاز ہو جائے یہاں یہ امر ذہن نشین رہے کہ ایثار و قربانی کا منتہائے کمال استغنائے نفس اور خود فراموشی ہے۔ عظیم محدث و فقیہہ ملا علی قاریؒ اس مقام پر لکھتے ہیں:۔

اذا مت موتا مجازیا ودخلت فی حال الفناء و بقیت فی مقام البقاء تراہ رؤیۃ مشاھدۃ غیبیۃ
(مرقاۃ المفاتیح، جلد ا ص۶۳)

جب تو مجازی موت مر جائے یعنی اپنی ذات کے لحاظ سے حالتِ فنا میں داخل ہو جائے اور حقیقی بقا سے بہرہ ور ہو جائے تو تو ذاتِ حق کو دیکھ لے گا۔ یعنی غیبی طور پر اس کی رؤیت و مشاہدہ کی نعمت سے لطف اندوز ہو سکے گا۔

مدعائے کلام یہ ہوا کہ جب تک بندہ اپنی ذات ہی کے مفاد سے وابستہ رہے، اسی کے شعور اور اسی کی منفعت کے حصول میں کوشاں رہے۔ وہ ہم سے دُور اور ہم اس سے محجوب رہتے ہیں اور جب وہ اپنی ذات کے تنگ حصار سے باہر نکل آئے۔ ہماری رضا کی خاطر ایسا مجاہدہ کرے کہ فنائے ذات کے مقام پر فائز ہو جائے۔ وہ اپنے لئے نہیں بلکہ ہمارے لیے زندہ رہے اور ہمارے لیے جینے کی صورت یہ ہے کہ اس طرح زندہ رہے۔ جیسے ہم دوسروں کے لیے زندہ ہیں۔ جیسا کہ ابنِ عمرؓ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں :۔

| | |
|---|---|
| من كان فى حاجة اخيه كان الله فى حاجته (متفق علیہ) | جو شخص اپنے بھائی (کے لیے زندہ رہا یعنی اس) کی ضروریات پورا کرنے میں مصروف رہا۔ اللہ اس کی ضروریات پورا کرنے میں مصروف رہے گا۔ |

اسی مفہوم کو اس حدیث میں یوں واضح کیا گیا ہے :۔

| | |
|---|---|
| من كان لله كان الله له | جو شخص اللہ کے لیے ہو گیا ، اللہ اس کے لیے ہو گیا۔ |

گویا جو شخص اپنی ذات اور اپنی منفعتوں کے تصوّر سے فنا اور بے نیاز ہو جائے وہی صاحبِ احسان ہے اور اسی پر رضائے الٰہی اور وصالِ حق کے تمام دروازے کھول دیئے جاتے ہیں۔

لہٰذا حدیثِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اس قرآنی حکم کی تائید کر دی کہ :۔

| | |
|---|---|
| وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا (العنکبوت : ۶۹) | یعنی جو لوگ ہم میں گم ہو جاتے ہیں۔ ہماری خاطر اس قدر مجاہدہ و تکلیف برداشت کرتے ہیں کہ خود کو بھول جاتے |

ہیں۔ ہم ان پر اپنی رضا، معرفت اور
وصال کے سب راستے کھول دیتے ہیں

الفاظِ فاتحہ کی صورت میں انسان کی یہی پکار تھی:-

| | |
|---|---|
| اھدنا الصراط المستقیم | اے باری تعالیٰ! ہم پر اپنی ذات اور اپنی رضا و وصال کا سیدھا راستہ کھول دے۔ |

پھر ساتھ ہی قلبِ سلیم نے اس کی نشاندہی کرتے ہوئے خود ہی کہہ دیا

| | |
|---|---|
| صراط الذین انعمت علیھم | یہ راستہ ان ہی لوگوں کا ہے جن پر ہماری نعمتیں ہوئیں۔ |

یعنی جنہوں نے درجۂ احسان پہ فائز ہو کر خود کو اس طرح
وارفتہ کر دیا کہ ان کا جینا اور مرنا کچھ بھی اپنے لیے نہ رہا۔ تو ہماری رضا کے
سب دروازے ان پر کھل گئے گویا وہ ہمارے ہو گئے اور ہم ان کے ہو گئے۔
تم بھی اسی شعارِ حیات اور وطیرۂ زندگی کو اپنا لو۔ یقیناً تم بھی ہدایت کی
آخری منزل کو پا لو گے۔

## انبیاءِ کرام اور شعارِ احسان

قرآنِ حکیم حصولِ نصب العین کے لائحہ عمل کے طور پر اللہ تعالیٰ کے
انعام یافتہ بندوں کے طریقے کی تعلیم دیتا ہے۔ مطالعۂ قرآن سے پتہ چلتا ہے کہ
خدا کے انعام یافتہ بندے بنیادی طور پر چار طبقات پر مشتمل ہیں۔ انبیاء، صدیقین،

شہداء، صالحین۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے :-

فَأُولٰٓئِكَ مَعَ الَّذِيْنَ أَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنَ النَّبِيّٖنَ وَالصِّدِّيْقِيْنَ وَالشُّهَدَآءِ وَالصّٰلِحِيْنَ ۚ وَحَسُنَ أُولٰٓئِكَ رَفِيْقًا (النساء: ۶۹)

انھیں ان لوگوں کی معیت نصیب ہوگی جن پر اللہ تعالیٰ نے انعام فرمایا ہے یعنی اللہ پاک نے جن (انبیاء) صدیقین، شہداء اور صالحین ہیں اور یہ لوگ کیا ہی اچھے ساتھی ہیں۔

آیتِ متذکرہ سے یہ ثابت ہوگیا کہ انعام یافتہ بندوں میں جو طبقہ سرِفہرست ہے۔ "انبیاء کرام" کا ہے۔ اس لیے ہم حصولِ نصب العین کے طریق کار پر بحث کرتے ہوئے انبیاء کرام کے نصب العین کا جائزہ لیتے ہیں۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے۔

وَوَهَبْنَا لَهٗٓ إِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ ۚ كُلًّا هَدَيْنَا ۚ وَنُوْحًا هَدَيْنَا مِنْ قَبْلُ وَمِنْ ذُرِّيَّتِهٖ دَاوٗدَ وَسُلَيْمٰنَ وَأَيُّوْبَ وَيُوْسُفَ وَمُوْسٰى وَهٰرُوْنَ ۚ وَكَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِيْنَ ۙ وَزَكَرِيَّا وَيَحْيٰى وَعِيْسٰى وَإِلْيَاسَ ۚ كُلٌّ مِّنَ الصّٰلِحِيْنَ ۙ وَإِسْمٰعِيْلَ وَالْيَسَعَ وَيُوْنُسَ وَلُوْطًا ۚ وَكُلًّا فَضَّلْنَا عَلَى الْعٰلَمِيْنَ ۙ وَمِنْ اٰبَآئِهِمْ وَذُرِّيّٰتِهِمْ وَإِخْوَانِهِمْ ۚ وَاجْتَبَيْنٰهُمْ وَهَدَيْنٰهُمْ إِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ

اور ہم نے ابراہیم کو اسحاق اور یعقوب عطا کیے اور ہم نے ان سب کو منزلِ مقصود تک پہنچایا اور ان سے پہلے نوح کو بھی منزلِ مقصود تک پہنچایا اور اس کی اولاد میں سے داؤد، سلیمان، ایوب، یوسف، موسیٰ اور ہارون کو بھی (اپنے اپنے نصب العین میں کامیاب کیا) اور ہم اسی طرح "احسان والوں" کی جدوجہد کو بانتیجہ اور باثمر کرتے ہیں۔ اور (اسی طرح) زکریا، یحییٰ، عیسیٰ اور الیاس کو بامراد کیا۔ یہ سب ہمارے قرب والے تھے اور اسماعیل، یسع، یونس

ذٰلِكَ هُدَى اللّٰهِ يَهْدِىْ بِهٖ مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ ؕ وَلَوْ اَشْرَكُوْا لَحَبِطَ عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ

(الانعام: ۸۵-۸۹)

اور لوط کو بھی اور ہم نے سب کو جہان والوں پر فضیلت دی۔ ان کے آباء و اجداد، اولاد اور بھائیوں میں سے بعض کو ہم نے چن لیا اور انہیں سیدھی راہ پر چلایا، یہ اللہ کی ہدایت اور رہنمائی ہے اپنے بندوں میں سے جسے چاہتا ہے عطا کرتا ہے۔ اور اگر وہ شرک کرتے تو ضرور ان کا کیا اکارت جاتا۔

۲۔ اس تفصیلی ذکر کے بعد آخر میں پھر فرمایا گیا:۔

اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ هَدَى اللّٰهُ فَبِهُدٰىهُمُ اقْتَدِهْ ؕ

(الانعام: ۹۰)

یہی وہ لوگ ہیں جنہیں اللہ تعالیٰ نے منزلِ مقصود تک پہنچایا۔ پس تم بھی ان ہی کی راہ کی پیروی کرو۔

قرآن مجید نے دو ٹوک انداز میں ہدایت یافتہ افراد کا ذکر کر کے نسلِ انسانی کے سامنے ان کی راہ کی پیروی کی تلقین کر دی ہے۔ اور انبیاء و صلحاء کا وطیرہ و شعار کیا ہے۔ جس کا بدلہ انہیں کامیابی و کامرانی کی ضمانت کی صورت میں عطا کیا گیا۔ قرآن اسے بڑی صراحت کے ساتھ بیان کرتا ہے:۔

وَكَذٰلِكَ نَجْزِى الْمُحْسِنِيْنَ

ہم اسی طرح یہ جزا احسان کرنے والوں کو عطا کرتے ہیں۔

گویا تمام گروہِ انبیاء کا شعارِ حیات "فعلِ احسان" تھا۔ جس کے نتیجے میں وہ اپنی جد و جہد میں بامراد ہوئے اور انھوں نے ہدایتِ ایزدی کے باعث اپنے نصب العین کو پالیا

٣۔ قرآن حکیم حضرت یوسفؑ کے اپنی منزلِ مقصود اور نصب العین کو پانے کا ذکر اس طرح کرتا ہے:

وَلَمَّا بَلَغَ أَشُدَّهُ آتَيْنَاهُ حُكْمًا وَعِلْمًا ۚ وَكَذَٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِينَ
(یوسف: ٢٢)

اور جب وہ اپنے شباب کو پہنچا، ہم نے اسے حکومت اور اہلِ علم و بصیرت سے نواز دیا اور ہم اسی طرح احسان کرنے والوں کو منزلِ مقصود تک پہنچاتے ہیں۔

٤۔ موسیٰؑ کے بارے میں ارشاد فرمایا:

وَلَمَّا بَلَغَ أَشُدَّهُ وَاسْتَوَىٰ آتَيْنَاهُ حُكْمًا وَعِلْمًا ۚ وَكَذَٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِينَ
(القصص: ١٤)

جب وہ اپنے شباب کو پہنچا اور پورے زور پر آیا، ہم نے اسے حکم اور علم کی نعمت سے نوازا، اور ہم اسی طرح احسان کرنے والوں کو منزلِ مقصود تک پہنچاتے ہیں۔

٥۔ نوحؑ کی کامیابی و کامرانی کا ذکر کرتے ہوئے قرآن مجید میں ارشاد ہوتا ہے:

سَلَامٌ عَلَىٰ نُوحٍ فِي الْعَالَمِينَ ۝ إِنَّا كَذَٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِينَ ۝ إِنَّهُ مِنْ عِبَادِنَا الْمُؤْمِنِينَ ۝ ثُمَّ أَغْرَقْنَا الْآخَرِينَ
(الصّٰفّٰت: ٧٩، ٨٢)

نوحؑ پر سلام ہو تمام جہان والوں میں، بیشک ہم اسی طرح احسان کرنے والوں کو بامراد کرتے ہیں۔ وہ یقیناً ہمارے اعلیٰ درجے کے ایمان والے بندوں میں سے تھے۔ پھر ہم نے (ان کے مقابل) دوسروں کو غرق کر دیا۔

٦۔ ابراہیمؑ کے بارے میں ارشاد ہوتا ہے:

وَنَادَيْنَاهُ أَنْ يَا إِبْرَاهِيمُ

اور ہم نے اسے ندا فرمائی کہ اے ابراہیمؑ،

فَـقَدْ صَدَّقْتَ الرُّؤْيَا اِنَّا كَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِيْنَ (الصّٰفّٰت : ۱۰۵)

بے شک تو نے خواب سچ کر دکھایا۔ ہم اسی طرح احسان کرنے والوں کو بامراد کرتے ہیں۔

۷۔ اسی طرح فرمایا گیا:۔

سَلٰمٌ عَلٰى مُوْسٰى وَهٰرُوْنَ ۝ اِنَّا كَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِيْنَ (الصّٰفّٰت، ۱۲۱)

سلام ہو موسیٰؑ اور ہارونؑ پر۔ ہم اسی طرح احسان کرنے والوں کو جزا عطا کرتے ہیں۔

۸۔ سَلٰمٌ عَلٰى اِلْ يَاسِيْنَ ۝ اِنَّا كَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِيْنَ (الصّٰفّٰت، ۱۳۱)

سلام ہو الیاسؑ پر۔ ہم اسی طرح احسان کرنے والوں کو صلہ عطا کرتے ہیں۔

الغرض قرآن حکیم میں کم و بیش ہر پیغمبر کو "صاحب احسان" کے لقب سے نوازا گیا ہے۔ مذکورہ بالا آیات اس امر کی صرف چند ایک شہادتیں ہیں۔ گروہِ انبیاء سے بڑھ کر نہ کوئی کامیاب ہو سکتا ہے اور نہ کوئی ہدایت یافتہ، ان سے بڑھ کر کوئی منزلِ مقصود اور نصب العین کا پانے والا ہو سکتا ہے اور نہ کوئی جہدِ حیات میں کامیاب و کامران۔ لہٰذا ان کا شعار بجا طور پر حصولِ نصب العین کا واحد ضمانت یافتہ طریق کار ہو سکتا ہے۔ آپ نے ملاحظہ فرمایا کہ ان کا شعار بھی بلااستثنیٰ "فعلِ احسان" ہی تھا۔ لہٰذا مذکورہ بالا شواہد و دلائل سے یہ حقیقت روزِ روشن کی طرح عیاں ہو گئی کہ "حصولِ نصب العین" کا پیغمبرانہ طریق کار بھی "فعلِ احسان" ہے۔

## ایک مغالطے کا ازالہ

یہاں پر ایک مغالطہ ہو سکتا ہے۔ کیونکہ عام طور پر مترجمینِ قرآن اور مفسرین

"احسان" کا معنی "نیکی" کرتے ہیں اور نیکی مطلقاً کئی صورتوں پر مشتمل ہوتی ہے۔ لہٰذا اس ترجمے کے مطابق احسان کا معنی مشخص اور معین نہ رہا۔ کسی بھی نیکی اور عمل صالح کو "احسان" اور اس سے متصف کو "محسن" کہا جا سکتا ہے چونکہ انبیائے کرام ہر قسم کے اعمالِ صالحہ اور نیکیوں سے مزین ہوتے ہیں۔ اس لیے انہیں "محسنین" کہا گیا ہے۔ یہ خیال درج ذیل وجوہ کی بنا پر غلط ہے :-

۱۔ ایک یہ کہ ہم احسان کا معنی شروع میں واضح کر چکے ہیں۔ عدل اور احسان کے تقابل کے بعد لفظِ احسان کے معنی کو مطلق نیکی کے حوالے سے محض عمومی حیثیت دینا عربی لغت و ادب کے قاعدوں کے ساتھ صریح ناانصافی ہے۔

۲۔ دوسرے یہ کہ اگر اسے مطلقاً نیکی سے تعبیر کر دیا جائے تو بھی سورۃ البقرہ کی آیت ۱۷۷ اور کسی دیگر مقامات قرآنی کی روشنی میں اس کا مفہوم یہی متعین ہوتا ہے کہ "حُبِّ الٰہی میں تسلیم و رضا اور ایثار و قربانی کا پیکر بن جانا نیکی ہے"۔ اور اسی طرزِ زندگی کا نام "احسان" ہے۔

۳۔ تیسرے یہ کہ ہم نے متعدد قرآنی احکام اور احادیث کے ذریعے لفظِ "احسان" کا مفہوم بیان کیا ہے۔ جس سے صاحبِ احسان میں ذاتی منفعت کی طلب کی نفی اور دوسروں کے لیے سراسر ایثار اور نفع بخشی کا معنی ثابت ہوتا ہے۔ لہٰذا اس کی اس معنوی خصوصیت کا انکار قرآن و حدیث کے احکام سے صریح انحراف ہے۔

۴۔ چوتھا یہ کہ قرآنِ مجید میں جس قدر التزام کے ساتھ انبیاء کو "صاحبِ احسان" یا "محسن" قرار دیا گیا ہے اور یہ اصطلاح ان کے حق میں جتنی کثرت اور فراوانی کے ساتھ استعمال ہوئی ہے۔ اس سے یقیناً ان کے مخصوص طرزِ عمل اور نمایاں شعارِ حیات کا اندازہ ہوتا ہے۔ کسی عام نیکی پر اس اصطلاح کا استعمال اس قدر کثیر نہیں ہو سکتا تھا۔ پھر یہ کہ گروہِ انبیاء کا یہی تو سب سے زیادہ مشترک، غالب اور نمایاں طرزِ عمل تھا

کر وہ ہزاروں مصائب و آلام برداشت کر کے بھی دوسروں کی منفعت ہی سوچتے تھے۔ ان کا زندہ رہنا بھی خلقِ خدا ہی کی بھلائی کے لیے تھا اور تمام تر جدوجہد کے باوجود وہ کسی سے اپنی ذات کے لیے کچھ نہ لیتے تھے۔ بلکہ ان کا اعلان یہ ہوتا تھا۔

اِنْ اَجْرِیَ اِلَّا عَلَی اللّٰہ (ہود - ۲۹) میرا اجر تو صرف میرے اللہ کے پاس ہے۔

یہاں تک کہ ان کی ذاتی جائیداد اور دولت بھی ان کے وصال کے بعد بطور وراثت تقسیم نہیں ہوتی تھی۔ وہ بھی خلقِ خدا کی بہتری کے لیے وقف تھی۔ ان کے اسی نمونۂ عمل کا نام "احسان" ہے۔ جس کا ذکر قرآنِ مجید میں بار بار آیا ہے۔ لہٰذا یہاں لفظِ "احسان" سے مراد عام نیکی یا عملِ صالح نہیں بلکہ وہ مخصوص طرزِ عمل ہے جو دوسروں کے لیے نفع بخشی، فیض رسانی اور ایثار و قربانی سے عبارت ہو۔ یہی طرزِ عمل شعارِ انبیاء ہے اور اسی کا نام "فعلِ احسان" ہے۔ جو رضائے الٰہی کے حصول کا حتمی طریقِ کار ہے۔

باب پنجم

# حصولِ نصب العین کی عملی اساس

# فصلِ اوّل انفاق فی المال کی حقیقت

انسانی زندگی میں انفرادی سطح پر حصولِ نصب العین کے لائحہ عمل کے طور پر اب تک دو شرائط کا ذکر ہو چکا ہے۔ محرک اور طریقِ کار ـــــ محرک، "تزکیہ نفس کی آرزو" تھی اور طریقِ کار، فعلِ احسان۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس طریقِ کار یعنی فعلِ احسان کی عملی اساس کیا ہو گی؟

اس کا جواب مجملاً اوپر آ چکا ہے کہ فعلِ احسان کی عملی اساس ـــــ "انفاق فی المال" ہے۔ اس کا معنی "مال خرچ کرنا" ہے۔ لیکن اپنی ضروریات و تعیشات پر نہیں بلکہ دوسروں کی زندگیوں سے معاشی تعطّل رفع کرنے کے لیے۔

انفاق فی المال سے مراد "درحقیقت اپنے سرمایہ و دولت کو دوسروں پر اس طرح خرچ کرنا ہے کہ ان کا معاشی تعطّل ختم ہو۔ ان کی تخلیقی جدوجہد بحال ہو اور وہ معاشرے میں مطلوبہ کردار بحسن و خوبی سرانجام دے سکیں۔" اس انفاق کی عملی مثال "مواخاتِ مدینہ" ہے اور حصولِ نصب العین کے لیے فعلِ احسان کی عملی صورت اسی قسم کا "انفاق" ہے۔

## حکمِ انفاق کی دو سطحیں

انفاقِ مال کا عمل دو سطحوں پر ہو سکتا ہے۔ انفرادی سطح پر اور اجتماعی سطح پر

**انفرادی سطح** سے مراد یہ ہے کہ افراد اپنے طور پر اپنے احباب و متعلقین اور حلقۂ اثر میں "انفاق" کو بطور دائمی عمل جاری کریں۔ جو شخص معاشی ابتلاء کا شکار ہو، ضروریاتِ زندگی سے محروم ہو یا اس کی زندگی ایسے تعطل کی نذر ہو گئی ہو کہ اس کی تخلیقی جدوجہد بحال نہ رہی ہو، ایسے ضرورت مند افراد کی مالی اعانت اس انداز سے کرنا کہ ان کی عزتِ نفس بھی مجروح نہ ہو، ان کی ضروریات بھی پوری ہوں اور وہ ہر وقت دوسروں کی اعانت کے منتظر نہ رہیں۔ بلکہ ان کی زندگی سے معاشی تعطل ختم کر کے ان کا اپنا تخلیقی عمل بحال کر دیا جائے تاکہ وہ معاشرے میں صحیح مقام اور مفید کردار سرانجام دینے کی پوزیشن میں ہو سکیں۔ اس سلسلے میں اپنے اعزہ و اقارب اور پڑوسیوں کے علاوہ سب سے زیادہ مستحق وہ لوگ ہیں جنھوں نے خود کو خدمتِ اسلام میں اس طرح وقف کر دیا ہو کہ ان کے پاس روزگارِ حیات کی خاطر فرصت ہی باقی نہ رہی ہو۔ ان سے مراد وہ مجاہدینِ اسلام ہیں جن کی زندگیاں اسلام کی علمی و فکری اور عملی و انقلابی خدمت میں محصور ہو چکی ہیں۔ یہی لوگ راہِ حق کے اسیر ہیں۔ اگر یہ لوگ معاشی تعطل کا شکار ہو گئے تو دینِ حق اور ملتِ اسلامیہ کے احیاء کی خاطر ہونے والی انقلابی کاوشیں معطل ہو جائیں گی۔ ان کا حکم قرآنِ مجید میں اس طرح آیا ہے :۔

| | |
|---|---|
| لَيْسَ عَلَيْكَ هُدٰىهُمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ ۗ وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَيْرٍ فَلِاَنْفُسِكُمْ ۗ وَمَا تُنْفِقُوْنَ اِلَّا ابْتِغَآءَ وَجْهِ اللّٰهِ ۗ وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَيْرٍ يُّوَفَّ | ان کو منزلِ مقصود تک پہنچانا آپ کے ذمے لازم نہیں (بلکہ آپ کے ذمے تو صرف رہنمائی کر دینا ہے) ہاں اللہ جسے چاہتا ہے منزل تک پہنچا دیتا ہے۔ تم اگر کوئی اچھی چیز خرچ کرو تو اس میں تمہارا ہی بھلا ہے اور تمہیں |

اِلَیْکُمْ وَاَنْتُمْ لَا تُظْلَمُوْنَ ۝
لِلْفُقَرَآءِ الَّذِیْنَ اُحْصِرُوْا
فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ لَا یَسْتَطِیْعُوْنَ
ضَرْبًا فِی الْاَرْضِ یَحْسَبُھُمُ
الْجَاھِلُ اَغْنِیَآءَ مِنَ التَّعَفُّفِ ۚ
تَعْرِفُھُمْ بِسِیْمٰھُمْ لَا یَسْـَٔلُوْنَ
النَّاسَ اِلْحَافًا ۗ وَمَا تُنْفِقُوْا
مِنْ خَیْرٍ فَاِنَّ اللّٰہَ بِہٖ عَلِیْمٌ ۝
اَلَّذِیْنَ یُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَھُمْ
بِالَّیْلِ وَالنَّھَارِ سِرًّا وَّعَلَانِیَۃً
فَلَھُمْ اَجْرُھُمْ عِنْدَ
رَبِّھِمْ وَلَا خَوْفٌ عَلَیْھِمْ
وَلَا ھُمْ یَحْزَنُوْنَ

(البقرہ، ۲۷۲ '۲۷۴)

(کسی اور مقصد کے لیے) مال خرچ کرنا مناسب نہیں۔ ہاں مگر صرف رضائے الٰہی کے حصول کے لیے انفاق کرو۔ تم جو کچھ بھی انفاق کرو گے تمہیں اس کا پورا پورا نتیجہ اور ثمرہ ملے گا۔ تمہیں ہرگز نقصان نہ پہنچائے گا۔ (انفاق کرو) ان فقرا کے لیے جو راہِ خدا کے اسیر ہیں (وہ دینِ حق کی خدمت میں اس قدر مصروف ہو گئے ہیں کہ) وہ زمین میں کاروبارِ حیات کے لیے چلنے پھرنے کا وقت بھی نہیں پاتے نادان لوگ انہیں عزتِ نفس کے باعث سوال سے بچنے کی وجہ سے (مغالطہ کا شکار ہو کر) مال دار سمجھتے ہیں۔ تم انہیں ان کی صورت سے پہچان لو گے۔ وہ لوگوں کے سامنے دستِ سوال دراز نہیں کرتے کیونکہ اس طرح ان کی عزتِ نفس مجروح ہوتی ہے۔ تم جو کچھ بھی انفاق کرو گے۔ بیشک اللہ تعالیٰ اسے جانتا ہے۔ جو لوگ راتوں کی تاریکی میں اور دن کے اجالے میں یا چھپے اور ظاہر دوسروں پر اپنا مال خرچ کرتے ہیں۔ ان کے لیے ان کا اجر اور صلہ ان کے رب کے پاس ہے۔ (وہ یہ خوشخبری ابھی سن لیں کہ ایسا کرنے والوں کو) نہ کوئی خوف دامنگیر ہوگا اور نہ کوئی حزن و ملال۔

● مذکورہ بالا تین آیات سے قبل بھی انفاق ہی کا حکم اور اس کے مسائل کا بیان چلا آ رہا ہے اور یہ تینوں آیات بھی اسی حکم سے متعلق ہیں۔ لیکن آپ غور فرمائیں کہ ان تین آیات میں بھی صراحت کے ساتھ پانچ (۵) مرتبہ انفاق کا حکم وارد ہوا ہے۔ اس سے اس کی اہمیت وافادیت از خود اُجاگر ہو جاتی ہے۔ لیکن حکمِ انفاق کے حوالے سے جو نمایاں اشارات ان آیات سے ماخوذ ہیں۔ وہ قابلِ غور ہیں۔ انہیں یہاں اختصار کے ساتھ درج کیا جاتا ہے:۔

۱۔ رہنمائی کے باوجود منزل مقصود ہر ایک کو نہیں ملتی۔ (ہدایت کا آخری مرحلہ منزلِ مقصود کو پالینا ہے)

۲۔ منزل مقصود اور نصب العین کے حصول میں کامیابی اللہ تعالیٰ صرف انہی لوگوں کو عطا کرتا ہے جو انفاق فی المال کا راستہ اختیار کرتے ہیں

۳۔ انفاق کا فائدہ صاحبِ انفاق کو خود ہی پہنچتا ہے کہ اسے اپنی منزل نصیب ہو جاتی ہے جس کے لیے دوسرے عمر بھر ترستے رہتے ہیں۔

۴۔ انفاق کا عمل صرف رضائے الٰہی کے نصب العین کی خاطر ہونا چاہیے۔ دیگر ممنوع اور مذموم مقاصد کے لیے نہیں۔

۵۔ عملِ انفاق اپنے اندر نتیجہ خیزی کی ضمانت رکھتا ہے۔ اس کا مطلوبہ صلہ میسّر آکر رہتا ہے۔ صاحبِ انفاق کو نتائج وثمرات کے لحاظ سے کبھی بھی مایوسی نہیں ہو سکتی۔

۶۔ انفاق کے سب سے زیادہ مستحق وہ لوگ ہیں جو دینِ حق کی راہ میں خود کو وقف و محصور کر چکے ہیں۔

۷۔ ہر وقت راہِ حق میں اس طرح کوشاں رہنا کہ کاروبارِ حیات کی فرصت بھی باقی نہ رہے اصحابِ صفہ کی سنّت ہے شرعاً ممنوع نہیں۔

۸۔ اہلِ حق کسی کے سامنے دستِ سوال دراز نہ کریں۔ ان کی شخصیت بے نیازی اور استغنا ِنفس کی پیکرِ اتم ہونی چاہیئے۔

۹۔ اہلِ ثروت کو مجاہدینِ حق کی مالی ضروریات کی کفالت اس انداز سے کرنی چاہیئے کہ ان کی زندگی میں معاشی تعطل بھی پیدا نہ ہونے پائے اور ان کی عزّتِ نفس بھی مجروح نہ ہو۔

۱۰۔ ذاتِ حق ہر حال میں کیے گئے اِنفاق سے باخبر ہوتی ہے اور اس پر اجر عطا کرتی ہے۔

۱۱۔ اہلِ اِنفاق دنیا و آخرت میں ہر قسم کے خوف و غم سے محفوظ رہتے ہوئے اپنے نصب العین کو پالیں گے۔

یہ عملِ انفاق کی انفرادی صورت تھی کہ مالدار افراد مستحق افراد کی مالی کفالت کے لیے ذاتی سطح پر اِنفاق کریں۔ اس طرح ہر صاحبِ مال پر اس کی انفرادی حیثیت میں "اِنفاق" لازم ہے اور یہی "فعلِ احسان" ہے جس کے ذریعے وہ بارگاہِ ایزدی میں نعمتِ رضا کا مستحق قرار پاتا ہے۔

**اجتماعی سطح** سے مراد یہ ہے کہ اجتماعی طور پر عملِ انفاق کو ایک ایسے نظام کے طور پر رائج کیا جائے کہ معاشرے کا کوئی فرد حاجتمندی میں مبتلا نہ رہے اور معاشرہ معاشی استحکام سے ہمکنار ہو کر قومی نصب العین کے حصول کے لیے اپنا کردار مؤثر طور پر ادا کر سکے۔ اس پہلو کو "قومی نصب العین اور اس کے حصول کے لائحہ عمل" کے تحت بیان کیا جائے گا۔ اس وقت ہمارے پیشِ نظر صرف انفرادی سطح پر حصولِ نصب العین کا مسئلہ ہے۔

## اِنفاقِ واجبہ اور اِنفاقِ نافلہ میں اِمتیاز

فقہی اصطلاح کے مطابق وجوب اور عدمِ وجوب کے لحاظ سے اِنفاق کی دو

قسمیں ہیں :-

۱- اِنفاقِ واجبہ ـــــ اس میں زکوٰۃ ، عُشر ، صدقۂ فطر اور دیگر ایسے صدقات شامل ہیں ۔ جن کا ادا کرنا صاحبِ نصاب پر بہرحال فرض یا واجب ہوتا ہے

۲- اِنفاقِ نافلہ ـــــ اس میں صدقاتِ واجبہ کے علاوہ اِنفاق کی تمام صورتیں شامل ہیں ۔ لیکن ان میں سے کسی صورتوں کو مصلحتاً ، ضرورتاً یا استحساناً" واجب بھی قرار دیا جا سکتا ہے ۔ اس امر کی تفصیلات ہم نے " اسلام کے تصورِ ملکیت ' میں بیان کی ہیں ۔ یہاں یہ امر ذہن نشین رہے کہ فعلِ احسان کا اطلاق " انفاقِ واجبہ ' پر نہیں بلکہ " انفاقِ نافلہ " پر ہوگا " انفاقِ واجبہ کی تمام صورتیں قرآن کے " حکمِ عدل " کے تحت شمار کی جائیں گی ۔ کیونکہ عدل کا مفہوم یہی ہے کہ جس قدر دینا لازم ہو اسی قدر دیا جائے اور شرعاً واجب حصے کے علاوہ دینا " احسان ' ہے ۔ لہٰذا ہماری بحث " انفاقِ نافلہ " کے حکم سے ہے ۔ اِنفاقِ واجبہ سے نہیں ۔

## نصابِ انفاق اور حدِ انفاق کا مسئلہ

یہاں اس امر کی وضاحت بھی ضروری ہے کہ " نصابِ انفاق ' اور " حدِ انفاق " کا مسئلہ صرف " انفاقِ واجبہ " سے متعلق ہے ۔ مثلاً مقررہ نصاب سے کم جائیداد رکھنے والے پر " زکوٰۃ ' فرض نہیں ہوتی ۔ دیگر صدقاتِ واجبہ کا معاملہ بھی اسی طرح ہے ۔ حدِ انفاق بھی صدقاتِ واجبہ کے لیے مقرر ہے ۔ مثلاً زکوٰۃ میں اڑھائی فیصد ' عشر " میں دس یا بیس فیصد وغیرہ ۔ جہاں تک انفاقِ نافلہ کا تعلق ہے ۔ اس کا اصول نصاب اور حد کے تعینات سے ماوراء ہے اس کے لیے نہ کم سے کم نصاب متعین ہے اور نہ زیادہ سے زیادہ حد ، کیونکہ یہ " انفاق "

احسان ہے اور انفاق واجب عدل۔ جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے کہ "عدل" معینہ اور مقررہ حد کے مطابق دینے کا نام ہے۔ جب کہ "احسان" ایسا فعل ہے جو حدود و قیود سے بلند و بالا ہوتا ہے۔ احسان میں چونکہ محسن کے پیش نظر اپنی ذات اور مادی منفعت نہیں ہوتی اس لیے اس میں کوئی "نصاب" نہیں ہوتا۔ مزید برآں احسان میں چونکہ دوسرے شخص کے استحقاق کا قانونی تعین نہیں ہوتا اس لیے اس پر کوئی حد نہیں ہوتی۔ یہ انفاق، جو فعلِ احسان کی عملی صورت ہے رضائے الٰہی کے نصب العین کی خاطر ہر ایک پر لازم ہے خواہ غریب ہو یا امیر، صاحبِ نصاب ہو یا غیر صاحبِ نصاب، تھوڑا دے سکے یا زیادہ، جو کچھ بھی اسے میسر ہو۔ اسی میں سے حسبِ استطاعت انفاق کرنا "احسان" ہے۔ اس پر نہ یہ شرط عاید کی گئی ہے کہ کتنا دے؟ (بچا ہوا دے یا سب کچھ لٹا دے) اور نہ یہ شرط ہے کہ کتنے میں سے دے؟ یہ بات دینے والے کے اپنے ظرف، غنائے نفس اور اس کے ذاتی حالات پر منحصر ہے۔

## احسان نصابِ انفاق سے ماوراء ہے

۱۔ قرآن حکیم میں ارشاد فرمایا گیا۔

وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ ۝ (البقرۃ : ۳)

اور ہم نے جو کچھ بھی انہیں دیا ہے اسی میں سے انفاق کرتے ہیں۔

یہاں "ما" کلمہ عام ہے۔ جو نصاب کی شرط سے پاک ہے۔ اس کا معنی یہ ہے کہ جو کچھ بھی خزانۂ قدرت سے نصیب ہوا ہو۔ اسی میں سے راہِ خدا میں خرچ کیا جائے۔

۲۔ ایک اور مقام پر ارشادِ باری ہے :-

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْفِقُوْا

اے ایمان والو! جو کچھ ہم نے تمہیں

مِمَّا رَزَقْنٰكُمْ (البقرہ، ۲۵۴) دیا ہے۔ اسی میں سے انفاق کرو۔

۳۔ یہی حکم ایک اور مقام پر بھی دیا گیا ہے :۔

وَاَنْفِقُوْا مِمَّا رَزَقْنٰكُمْ مِّنْ قَبْلِ اَنْ یَّاْتِیَ اَحَدَكُمُ الْمَوْتُ فَیَقُوْلَ رَبِّ لَوْلَآ اَخَّرْتَنِیْٓ اِلٰٓی اَجَلٍ قَرِیْبٍ ۙ فَاَصَّدَّقَ وَاَكُنْ مِّنَ الصّٰلِحِیْنَ (المنافقون، ۱۰)

اور جو کچھ ہم نے تمہیں دیا ہے اس میں سے انفاق کرو قبل اس کے کہ تم میں سے کسی کو موت آجائے۔ پھر وہ کہنے لگے اے میرے رب تو نے مجھے تھوڑی سی مہلت اور کیوں نہ دی؟ کہ میں اپنا مال صدقہ دیتا (یعنی عملِ انفاق کرتا) اور اس طرح میں بھی تیرے قُرب والوں میں شامل ہو جاتا۔

اس آیت میں ایک تو یہی حقیقت واضح کی گئی ہے کہ انفاق کے لیے ڈھیروں مال کا ہونا ضروری نہیں۔ جو کچھ میسّر ہو اسی میں سے خرچ کیا جانا چاہیے۔ اسی کا نام "احسان" ہے۔ دوسری یہ بات واضح کی گئی ہے کہ خدا کے مقربین و صالحین میں بھی شامل ہونے کی یہی صورت ہے کہ انفاقِ مال کے عمل کو اپنایا جائے۔

۴۔ ایک اور مقام پر مذکور ہے :۔

یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْفِقُوْا مِنْ طَیِّبٰتِ مَا كَسَبْتُمْ (البقرہ، ۲۶۷)

اے ایمان والو! جو کچھ پاک رزق تم کماتے ہو اسی میں سے خدا کی راہ میں بھی خرچ کرو۔

مذکورہ بالا آیات سے یہ امر واضح ہو گیا کہ فعلِ احسان کے طور پر کیے جانے والے انفاق میں کوئی نصاب شرط نہیں ہے۔ جتنا کچھ پاس ہو اسی میں دوسروں کو بھی شریک کر لیا جائے :۔

## احسان حدِ انفاق سے ماوراء ہے

احسان بالانفاق میں جس طرح نصاب کی شرط نہیں تھی اسی طرح اس کی کوئی حد و انتہا بھی متعین نہیں ہے۔

۱۔ قرآنِ حکیم میں ارشاد فرمایا گیا:۔

يَسْئَلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ ۥ قُلِ الْعَفْوَ ۥ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمُ الْاٰيٰتِ لَعَلَّكُمْ تَتَفَكَّرُوْنَ

(البقرہ ۲: ۲۱۹)

اے رسول صلی اللہ علیہ وسلم آپ سے پوچھتے ہیں، کیا خرچ کریں: فرما دیجئے! جو کچھ تمہاری ضرورت سے بچ رہے انفاق کر دو۔ اسی طرح اللہ تم سے نشانیاں بیان کرتا ہے تاکہ تم غور و فکر کر سکو۔

اس آیت کے ذریعے حدِ انفاق کے مسئلے کو بھی حل کر دیا گیا کہ انفاق کی کوئی آخری حد نہیں ہے۔ جو کچھ تمہاری ضرورتوں سے زائد ہو وہ دوسروں پر خرچ کر دو تاکہ اس سے وہ اپنی ضرورتیں پوری کر سکیں۔ اس آیت نے یہ فلسفۂ حیات بیان کیا کہ یہ ہرگز جائز نہیں کہ جس معاشرے میں کئی لوگ ضروریاتِ زندگی سے محروم ہوں یا غربت و افلاس کے باعث باعزت زندگی سے محروم کر دیئے گئے ہوں اسی معاشرے کے کچھ لوگ اپنی ضروریات سے بچی ہوئی دولت اپنی تحسینات و تزئینات اور تعیشات پر خرچ کرنے لگیں اور بالآخر غربت و امارت کی بناء پر ایک ہی معاشرے میں طبقاتی تقسیم کی بنیاد فراہم ہو جائے۔ اسی لیے فرمایا گیا:۔

لَعَلَّكُمْ تَتَفَكَّرُوْنَ

اس حکم میں تمہارے لیے غور و فکر کا بہت سارا سامان موجود ہے۔

آیت کے الفاظ پکار پکار کر کہہ رہے ہیں کہ ایسے احکام کو محض "نفلی" اور "مستحب" اعمال سمجھ کر نظر انداز نہ کیے رکھو! بلکہ اس میں غور و فکر کرو اور ان کی بنیاد

پر اپنے معاشرے کی معاشی زندگی کا ڈھانچہ تعمیر کرو۔ گویا آیت کے آخری الفاظ سابقہ حکم یعنی قُلِ الْعَفْوَ کی نسبت دعوتِ فکر و عمل دے رہے ہیں۔

۲۔ اسی سورت میں ایک اور مقام پر ارشاد فرمایا گیا :۔

يَسْئَلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ ۚ قُلْ مَآ اَنْفَقْتُمْ مِّنْ خَيْرٍ فَلِلْوَالِدَيْنِ وَالْاَقْرَبِيْنَ وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ وَابْنِ السَّبِيْلِ ۗ وَمَا تَفْعَلُوْا مِنْ خَيْرٍ فَاِنَّ اللّٰهَ بِهٖ عَلِيْمٌ ۝

(البقرہ : ۲۱۵)

اے نبی صلی اللہ علیہ وسلم آپ سے پوچھتے ہیں۔ کیا خرچ کریں ؟ آپ فرما دیجئے (کیا یہ بھی پوچھنے کی بات ہے) تم جو کچھ بھی خرچ کرو گے نیکی میں شمار ہوگا۔ پس (انفاق) والدین، اقربا، یتیموں، حاجتمندوں اور مسافروں کے لیے ہے اور تم جس قدر بھی نیکی کرو اللہ اسے خوب جانتا ہے۔

یہاں حکم انفاق کو اور زیادہ وسعت دے دی گئی ہے۔ پہلے یہ کہا گیا تھا کہ جو کچھ بھی ضرورت سے زائد ہو مستحق لوگوں کے معاشی تعطل کو رفع کرنے پر خرچ کر دو۔ یہاں شرط بھی مرتفع کر دی گئی کہ "ضرورت سے بچ رہے تو خرچ کرو" نہیں نہیں، اگر کوئی غنائے صدیقی کا حامل ہے اور اپنی ضرورت بھی دوسروں پر خرچ کر دینا چاہتا ہے تو اس پر بھی کوئی پابندی نہیں، جو کچھ خرچ کرو گے نیکی ہوگی اور نیکی کے بارے میں پوچھا نہیں جاتا ۔ بس خدا کی ذات تمہارے انفاق سے باخبر ہے۔ یہ حکم ہر ایک کے لیے نہیں۔ صرف اسی کے لیے ہے جو راہِ خدا میں سب کچھ لٹا کر بھی دل میں حزن و ملال محسوس نہیں کرتا اور مالی تنگی وقتی طور پر بھی اسے پریشان نہیں کر سکتی۔ یہ حکم اس شخص کے لیے ہے جسے توکل اور استغنا کا وہ بلند درجہ نصیب ہو چکا ہو کہ دوسروں کا فقر مٹانے کے لیے

اپنے اُوپر فقر بھی طاری کرے تو اس کے پائے استقلال اور عزم و ہمت میں کوئی فرق نہ آئے۔ یہ ایمان کا وہ کامل ترین درجہ ہے جس کا مظاہرہ سیدنا ابو بکر صدیقؓ نے غزوہ تبوک کے موقع پر کیا تھا اور جس کا عملی مشاہدہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور اہلبیتِ نبوی کے گھروں میں ہوتا رہتا تھا۔

جب امام حسنؓ کے گھر میں چند دن سے فاقے کی حالت دیکھ کر آپ کی خادمہ چاندی کا ٹکڑا لے کر آپ کی خدمت میں حاضر ہوئی اور عرض کیا۔ اے امام عالی مقام! اسے فروخت کر کے کچھ دنوں کا سامانِ خورد و نوش لے آیئے۔ امام ابنِ عساکرؒ بیان کرتے ہیں کہ آپ نے جلال میں آکر اپنا قدم زمین پر مارا۔ گھر کی ساری زمین سونا بن گئی۔ آپ نے فرمایا خادمہ تُو نے کیا سمجھا ہے کہ ہم محتاج ہیں اور فقرِ اضطراری میں مبتلا ہیں۔ نہیں۔ خدا کی قسم یہ فقر تو ہم نے خود اپنے اوپر طاری کر رکھا ہے تاکہ دوسروں کا فقر مٹا سکیں۔ یہ فقر اختیاری ہے اضطراری نہیں اور ہمارے نانا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت ہے۔ کیونکہ آپؐ نے یہ فرمایا تھا:۔

| | |
|---|---|
| الفقر فخری | فقر اختیار کرنا میرے لیے باعثِ فخر ہے |

ورنہ عام لوگوں کے لیے تو حکم یہی ہے کہ اپنی ضرورتوں کا خیال رکھ لیں اور بقایا انفاق کر دیں۔

۴۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:۔

| | |
|---|---|
| خیر الصدقۃ ما کان عن ظھر غنی | بہتر صدقہ وہی ہے جو ضرورت کے مطابق بچا کر کیا جائے یا غنائے نفس کے ساتھ کیا جائے۔ |
| (صحیح مسلم) | |

"عن ظھر غنی" کے الفاظ میں مذکورہ بالا دونوں صورتوں کو سمو دیا گیا ہے۔

۴۔ ایک اور مقام پر حضور علیہ السلام نے ارشاد فرمایا :۔

| | |
|---|---|
| یا ابن آدم انك ان تبذل الفضل خیرٌ لك وان تمسكهٗ شرٌ لك ولا تلام علی کفاف وابدأ بمن تعول | اے ابن آدم ! اگر تو ضرورت سے بچا ہوا خدا کی راہ میں خرچ کردے تو یہ تیرے لیے بہتر ہے اور اگر تو اس کو بھی بچا کر رکھ لے تو یہ تیرے لیے نقصان دہ ہے۔ ہاں اس قدر بچا کر رکھنے میں کوئی مضائقہ اور ملامت نہیں جو تیری ضرورت کے لیے کافی ہو اور انفاق کا آغاز ان لوگوں سے کر جن کی ذمہ داری تجھ پر عائد ہوتی ہے۔ |
| (مسلم و ترمذی) | |

۵۔ اسی سلسلے میں ایک اور حدیث ملاحظہ فرمایئے جسے جابر بن عبداللہ انصاریؓ روایت کرتے ہیں۔ وہ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ ہم حضور علیہ السلام کی خدمت میں میں حاضر تھے کہ ایک شخص انڈے کے برابر سونا لے کر آیا اور عرض کرنے لگا :۔

| | |
|---|---|
| یا رسول اللہ اصبت ھذہ من معدن، فخذھا فھی صدقۃٌ ما املك غیرھا، فاعرض عنہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، ثم اتاہ من قبل رکن الایمن فقال مثل ذالك، فاعرض عنہ ـــــــــ | یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مجھے یہ سونا ایک کان سے ملا ہے۔ اسے صدقہ کے لیے قبول فرمایئے ۔ اس کے سوا میرے پاس اور کچھ نہیں۔ چنانچہ حضور نے چہرۂ انور دوسری طرف کر لیا۔ پھر وہ شخص دائیں جانب سے آکر یہی عرض کرنے لگا۔ حضور نے پھر اس طرف نظر فرمالی۔ (یہاں تک کہ آپ نے اس سے سونا لے کر اسی کی طرف دے مارا) |

فقال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یاتی احدکم بما یملک فیقول ھذہ صدقۃ، ثم یقعد یستکف الناس، خیر الصدقۃ ماکان عن ظھر غنی (صحیح مسلم)

پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تم میں سے کوئی شخص جو کچھ اس کے پاس ہوتا ہے لے کر آجاتا ہے اور کہتا ہے اسے صدقہ کر دیجئے۔ پھر خود بیٹھ کر لوگوں کے ہاتھ تکتا رہے (کہ کوئی اسے دیگا تو اس کی ضرورت پوری ہوگی) بہتر صدقہ وہی ہے جو حسب ضرورت بچا کر کیا جائے۔

اس حدیث سے عوام الناس کو یہ "اصولِ انفاق" مہیا کر دیا گیا کہ انفاق کے لیے کوئی حد مقرر نہیں۔ لیکن کم از کم اس امر کا خیال رہنا چاہیئے کہ اتنا کچھ ضرور بچا کر رکھ لیا جائے۔ جس سے صاحبِ انفاق کی ذاتی اور عائلی ضروریات پوری ہوتی رہیں۔

اس اصولِ انفاق کی بہترین مثال حضرت عمر فاروق رضؓ نے غزوۂ تبوک کے موقع پر فراہم کی۔ جس کا ذکر پہلے گزر چکا ہے کہ "نصف مال گھر کے لیے رکھ لیا اور نصف صدقہ کر دیا"۔ لیکن ایک نمونہ اسی موقع پر صدیق اکبر رضؓ کے فعلِ انفاق نے فراہم کیا کہ آپ نے سب کچھ صدقہ کر دیا اور کہا کہ "ہمارے لیے خدا اور خدا کا رسولؐ کافی ہیں"۔ یہ مقامِ تفویض تھا جو احسان کا بلند ترین درجہ ہے کہ کوئی شخص غنائے قلب سے اس مقام پر فائز ہو تو اس کے لیے انفاق اس حد تک بھی جائز ہے۔ لیکن اہل وعیال کا بھی اس درجے کا متوکل ہونا ضروری ہے تاکہ رضائے الٰہی کی خاطر کی گئی قربانی پر کسی کے دل میں رنج وملال کا شائبہ تک پیدا نہ ہونے پائے۔

مذکورہ بالا حدیث پر غور فرمائیے۔ اس شخص کا صدقہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے قبول نہ فرمایا۔ اس کی وجہ صرف یہ نہ تھی کہ وہ سارا کا سارا مال پیش کر رہا تھا۔ اگر صرف یہی وجہ ہوتی تو آپ حضرت ابوبکرؓ کا صدقہ بھی قبول نہ فرماتے۔ اس کا صدقہ قبول نہ فرمانے کی اصل وجہ یہ تھی کہ وہ سارا مال صدقہ کرنے کی جرأت تو کر رہا تھا لیکن غنائے قلب اور توکل کے اس مقام پر فائز نہ تھا جس پر ابوبکر صدیقؓ تھے کیونکہ وہ مال صدقہ دیتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ مَا اَمْلِكُ غَيْرَهَا (میرے پاس اس کے سوا کچھ نہیں) اس کے یہ الفاظ اس امر پر دلالت کر رہے تھے کہ یہ شخص سارا مال دے کر دل سے مطمئن نہیں۔ وہ ابھی تک مال و دولت سے اس قدر بے نیاز اور مستغنی نہیں ہوا جو اس حد تک انفاق کے لیے ضروری ہے۔ اس لیے تو ساتھ ہی یہ شنار ہا ہے کہ "میرے پاس اس کے سوا اور کچھ نہیں"۔ چنانچہ نگاہ نبوت نے جان لیا کہ "یہ سب کچھ لٹا کر خوش نہیں رہے گا بلکہ لالچ بھری نگاہوں سے دوسروں کو تکتا رہے گا"۔ اس لیے اسے فرمایا:۔

خذ عنا مالك لاحاجة لنا به — اپنا مال واپس لے جا، ہمیں اس کی ضرورت نہیں۔

## انفاق میں غنائے مال اور غنائے نفس کا امتیاز

مذکورہ بالا بحث سے یہ امر طے ہوا کہ غنار کی دو قسمیں ہیں:۔

۱۔ غنارِ مال — ۲۔ غنارِ نفس

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد " خير الصدقة ما كان عن ظهر غنى " (بہترین صدقہ وہ ہے جو غنار کے ساتھ کیا جائے) دونوں قسموں پر منطبق ہوتا ہے۔ کیونکہ لوگ جو احکام شریعت کے مکلف ہوتے ہیں ان کی بھی دو اقسام ہیں۔ "عوام" اور "خواص"

- عوام کے لیے "عن ظهر غنی" کا وہی معنیٰ ہے جو اُوپر بیان ہو چکا ہے اور جس کی تصریح جابر بن عبداللہؓ سے مروی اس حدیث سے ہو چکی ہے کہ "بہتر صدقہ وہ ہے جس کے پیچھے غنا ہو۔" یعنی صدقے کے باوجود پیچھے اس قدر مال موجود ہو جو اس کی ضروریات کے لیے کافی رہے اور اس شخص کو مالی پریشانی سے بے نیاز رکھے۔ یہ حکم غنار مال کے مفہوم پر دلالت کرتا ہے اور اس کے مکلّف عوام ہیں۔
- خواص کے لیے "عن ظهر غنی" کا معنی وہ ہے جس کی تصریح عملِ صدیقؓ سے ہوتی ہے۔ اس اعتبار سے مفہومِ حدیث یہ ہوا کہ "بہتر صدقہ وہ ہے جس کے پیچھے غنائے نفس ہو۔" یعنی دل اس قدر متوکل اور دولتِ غنار سے بہرہ یاب ہو کہ سب کچھ خدا کی راہ میں لٹا کر بھی دل بوجھ محسوس نہ کرے اور یہ گمان تک ذہن میں پیدا نہ ہونے پائے کہ "اب ضروریات کہاں سے پوری ہوں گی؟" اس مفہوم کی تائید بھی خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اس حکم سے ہوتی ہے جس میں آپؐ نے فرمایا:۔

| | |
|---|---|
| لیس الغنی عن کثرۃ العرض ولکن الغنی غنی النفس (ترمذی) | غنار کثرتِ مال سے نہیں بلکہ غنارِ نفس سے حاصل ہوتا ہے۔ |

اس حکم کے مکلّف خواص ہیں — حکم ایک ہی ہے لیکن اس کی تعبیریں اور اطلاقات مختلف ہیں۔

عوام کو صرف ضرورت سے زائد خرچ کرنے کی اجازت ہے۔ لہٰذا وہ "قل العفو" کے مصداق ہیں۔ ان کے لیے غنار سے مراد غنارِ مال ہے اور خواص کو سب کچھ راہِ خدا میں لٹا دینے کی بھی اجازت ہے۔

لہٰذا وہ "ما انفقتم من خیرٍ" کے مصداق ہیں۔ ان کے لیے غنا رسے مراد "غنائے نفس" ہے۔ صدیقِ اکبرؓ غنائے نفس سے بہرہ ور تھے۔ اس لیے ان کا سارا سرمایہ و دولت بطور صدقہ قبول کر لیا گیا۔ دوسرا شخص غنائے نفس سے بہرہ ور نہ تھا۔ اس کو غنائے مال کی ضرورت تھی۔ اس لیے اس کا سارا مال بطور صدقہ قبول نہ کیا گیا۔

● ہمیں چاہیے کہ ہم اپنے گریبانوں میں جھانک کر فیصلہ کریں کہ خواص تو درکنار، کیا ہم انفاق کے معاملے میں عوام کے معیارِ ایمان پر بھی پورے اُترتے ہیں یا نہیں؟

# فصلِ دوم انفاق فی المال اور فعلِ احسان

مذکورۃ الصدر ضروری توضیحات کے بعد اب ہم "انفاق فی المال" کا جائزہ حصولِ نصب العین کے لائحہ عمل کے طور پر لیتے ہیں۔ جیسے کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے کہ "رضائے الٰہی کے حصول" کا طریق فعلِ احسان ہے اور حقیقت یہ ہے کہ احسانِ کامل "انفاق فی المال" کے بغیر ممکن نہیں۔ اس سلسلے میں قرآنِ حکیم کا فیصلہ ملاحظہ فرمائیں۔ ارشاد ہوتا ہے :-

| | |
|---|---|
| اَلَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ فِى السَّرَّآءِ وَالضَّرَّآءِ وَالْكٰظِمِيْنَ الْغَيْظَ وَالْعَافِيْنَ عَنِ النَّاسِ ۗ وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ (آلِ عمران، ۱۳۴) | جو لوگ (اللہ کی راہ میں) اپنا مال خرچ کرتے ہیں۔ فراخدستی کی حالت میں بھی اور تنگدستی میں بھی اور غصہ پی جاتے ہیں اور لوگوں کو معاف کرتے ہیں۔ پس اللہ تعالیٰ (ان) احسان کرنے والوں سے محبت کرتا ہے۔ |

اس آیت میں اصل بیان "انفاق فی المال" کرنے والوں کا ہو رہا ہے اور انہی کی دو خصوصیات مزید بیان کی گئی ہیں۔ ایک غصہ پینا، دوسری لوگوں کو معاف کرنا۔ حقیقت میں ان دو صفات کا تعلق بھی "الذین ینفقون" (یعنی انفاق کرنے والوں) سے ہی ہے۔ کیونکہ پہلے یہ بیان کیا گیا ہے کہ "پرہیزگار لوگ وہ ہیں جو خوشی اور تنگی و رنج ہر حال میں خدا کی راہ میں اپنا مال خرچ کرتے ہیں" ——

"اَلضَّرَّاء" کا لفظ صراحت کے ساتھ حالتِ رنج کی نشاندہی کرتا ہے۔ ایسی حالتیں کئی مرتبہ انسانی زندگی میں آتی رہتی ہیں۔ چنانچہ اس حالت کو بیان کرنے کے فوراً بعد کہا گیا۔ "والکاظمین الغیظ" یعنی رنج والم اور غم وغصّہ کی حالت بھی انہیں "انفاق فی سبیل اللہ" سے باز نہیں رکھ سکتی۔ بلکہ وہ اس حال میں بھی راہِ خدا میں معمول کے مطابق عملِ انفاق جاری رکھتے ہیں۔ اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ وہ رنج والم کے لمحات میں غصّے اور پریشانی سے مغلوب ہو کر احسان وانفاق کا وطیرہ ترک نہیں کرتے بلکہ رنج کو گویا پی جاتے ہیں اور اس طرح ان کا شعارِ حیات ہرگز متاثر نہیں ہونے پاتا۔

اسی طرح دوسری صفت "والعافین عن الناس" بیان کی گئی ہے۔ یعنی اگر کچھ لوگ ان سے درشتی وتلخی اور غیر مہذّب انداز سے پیش آئیں۔ یہاں تک کہ ان سے زیادتی بھی کریں، تب بھی وہ انتقاماً فعلِ انفاق کو ترک نہیں کرتے بلکہ ان کی روشِ احسان کا عالم یہ ہے کہ زیادتی کرنے والوں کو بھی معاف کر کے ان کے معاشی تعطّل کو رفع کرنے کے لیے ان پر اپنا مال خرچ کرتے رہتے ہیں۔ حدیثِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے مطابق احسان اسی طرزِ عمل کا نام ہے جو دوسروں کی طرف سے زیادتی کے باوجود ان سے حُسنِ سلوک اور مہربانی کے طور پر قائم رکھا جائے۔ خلاصۂ کلام یہ ہوا کہ خوشی ومسرّت کی حالت ہو یا تنگی وعُسرت کی، رنج والم اور غم وغصّہ کی حالت ہو یا کسی کی طرف سے ظلم وزیادتی کی، ہر حال میں "انفاق فی المال" کے عمل کو جاری رکھنا "احسان" ہے اور انہی احسان والوں سے اللہ تعالیٰ محبت کرتے ہیں۔

یہاں یہ نکتہ بخوبی سمجھ لیا جائے کہ اللہ تعالیٰ کا کسی سے محبت کرنا بغیر اس کے راضی ہوئے نہیں ہو سکتا۔ جس کو باری تعالیٰ اپنا محبوب بنا لیں وہی شخص "انسانِ

مرتضٰی کہلاتا ہے۔ اسی کو قرآنی اصطلاح میں "محسن" بھی کہتے ہیں اور "متقی" بھی، "صالح" بھی کہتے ہیں اور "ولی" بھی۔ لہٰذا "انفاق فی المال" حقیقی احسان بھی ہوا اور رضائے الٰہی کے حصول کا عملی طریق کار بھی۔

## عملِ انفاق بنائے تزکیہ ہے

ہم نے شروع میں عرض کیا تھا کہ رضائے الٰہی کے نصب العین کا محرک "تزکیہ" ہے۔ تزکیہ دو طرح کا ہوتا ہے۔ تزکیۂ مال اور تزکیۂ نفس۔ قرآن حکیم کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ تزکیہ کی دونوں صورتیں "انفاق" پر منحصر ہیں اور دونوں آپس میں لازم و ملزوم ہیں۔ آئیے اب ہم دونوں کا مختصر سا جائزہ لیں۔

- **انفاق تزکیۂ مال کا باعث ہے اور تزکیۂ مال کے بغیر تزکیۂ نفس ناممکن ہے۔**

قرآنِ مجید میں ارشاد ہوتا ہے :-

| | |
|---|---|
| خُذْ مِنْ اَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً تُطَهِّرُهُمْ وَتُزَكِّيْهِمْ بِهَا وَصَلِّ عَلَيْهِمْ ۭ اِنَّ صَلٰوتَكَ سَكَنٌ لَّهُمْ ۭ وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ۝ اَلَمْ يَعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ هُوَ يَقْبَلُ التَّوْبَةَ عَنْ عِبَادِهٖ وَيَاْخُذُ الصَّدَقٰتِ وَاَنَّ اللّٰهَ هُوَ التَّوَّابُ | آپ ان کے مال میں سے صدقہ حاصل کریں (اور) اس کے ذریعے آپ انہیں ستھرا اور پاک و صاف کر دیں اور (پھر) ان کے حق میں دعائے خیر کریں بیشک آپ کی دعا ان کے دلوں کا چین ہے اور اللہ سنتا جانتا ہے۔ کیا انہیں معلوم نہیں کہ اللہ ہی اپنے بندوں کی توبہ (معافی) قبول کرتا ہے اور صدقات (خدا کی راہ میں کیا گیا انفاق فی المال) خود اپنے دستِ |

| | |
|---|---|
| الرَّحِيْمُ | قدرت کے ذریعے وصول کرتا ہے تاکہ اپنے بندوں تک پہنچاتے، اور یقیناً اللہ تعالیٰ ہی توبہ قبول کرنے والا نہایت مہربان ہے۔ |
| ( التوبۃ ، ۱۰۳، ۱۰۴ ) | |

پہلی آیت نے صراحت کے ساتھ مذکورہ بالا امر کی تائید کردی کہ راہِ خدا میں اِنفاق (یعنی صدقہ) کے بغیر طہارت وتزکیہ ناممکن ہے۔ یہاں یہ نکتہ قابلِ غور ہے کہ "صدقہ" تو اہلِ ثروت کے مال سے حاصل کیا جارہا ہے اور صاف ظاہر ہے کہ انفاق کا محل مال و دولت ہی ہوسکتی ہے۔ اب چاہیئے تو یہ تھا کہ اس صدقہ و اِنفاق سے حاصل ہونے والی "طہارت وتزکیہ" کی اضافت بھی ان لوگوں کے مال کی طرف ہوجاتی۔ یعنی الفاظ یوں ہوتے :-

| | |
|---|---|
| تطھر اموالھم و تزکی اموالھم | کہ اس صدقہ کے ذریعے آپ ان کے مال و دولت کو ستھرا اور پاک صاف کردیں۔ |

یعنی جس مال میں سے صدقہ لے لیا گیا ہے وہ پاک صاف اور ستھرا ہو گیا۔ اب بھی یقیناً یہ معنی تو موجود ہی ہے۔ اس کی نفی نہیں ہوسکتی۔ لیکن عبارتِ قرآن یوں ہے :-

| | |
|---|---|
| تُطَهِّرُهُمْ وَتُزَكِّيهِمْ بِهَا | اس صدقہ کے ذریعے آپ ان کو ستھرا اور پاک وصاف کردیں۔ |

دونوں جگہ "ھم" کی ضمیر کا مرجع ظاہراً وہ لوگ ہیں جن کا مال راہِ خدا میں خرچ کرنے کے لیے حاصل کیا جارہا ہے۔ اس اسلوبِ بیان سے یہ واضح کرنا مقصود تھا کہ "صدقہ و انفاق" مال و دولت کا تزکیہ وطہارت تو کرتا ہی ہے۔ مزید یہ کہ اس عمل سے اِنفاق اور صدقہ کرنے والوں کے نفوس کو بھی تزکیہ وطہارت

نصیب ہوجاتی ہے۔"

گویا عملِ انفاق نہ صرف تزکیۂ مال کا بلکہ تزکیۂ نفس کا بھی باعث ہوتا ہے۔ مستزاد یہ کہ تزکیۂ نفس کی تمام دوسری کوششیں جو انفاق سے خالی ہوں اور دوسرے لوگوں کے حق میں بخل و اکتناز پر مبنی ہوں۔ کبھی بھی "تزکیۂ نفس" کے حصول میں کامیاب نہیں ہوسکتیں۔

## عملِ انفاق اجابتِ دعا کا باعث ہے

اسی آیتِ متذکرہ میں ترتیبِ الفاظ پر دوبارہ غور فرمائیے:۔

- خُذْ مِنْ اَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً — ان کے مال میں سے راہِ خدا میں خرچ کرنے کے لیے صدقہ حاصل کیجئے۔
- تُطَهِّرُهُمْ وَتُزَكِّيهِمْ بِهَا — اس طرح ان کے اموال اور ان کے نفوس پاک و صاف ہوجائیں گے۔
- وَصَلِّ عَلَيْهِمْ ۖ إِنَّ صَلٰوتَكَ سَكَنٌ لَّهُمْ ۗ وَاللّٰهُ سَمِيعٌ عَلِيمٌ — اور اب ان کے لیے دعائے خیر فرمائیے۔ بیشک آپ کی دعا انہیں سکونِ قلب عطا کردے گی اور اللہ تعالیٰ (دعاؤں کو) سننے والا اور (اعمال کو) جاننے والا ہے۔

سب سے پہلے صدقہ و انفاق کا عمل جاری کرنے کی تلقین کی گئی ہے اور بتایا گیا ہے کہ اس "انفاق" کے ذریعے تمہاری ظاہری و باطنی میل کچیل دُور ہو جائے گی۔ تمہارا قلب و باطن اور نفس، رُوحانی آلودگیوں سے پاک و صاف ہوجائے گا۔ تزکیہ و تجلیہ کا یہ عمل جو محض "انفاق فی المال" کا نتیجہ و ثمرہ ہے۔ تمہیں ظلماتِ نفسانی سے نجات دلا دے گا۔ گویا خلقِ خدا کی منفعت اور فیض رسانی

کو اپنا شعار بنا کر جب تم اپنے لیے بارگاہِ ایزدی کی طرف متوجّہ ہو گے تو تمہاری دعائیں قبولیت کے ساتھ نوازی جائیں گی اور یہ قبولیتِ دعا کا احساس تمہیں قلبی سکون عطا کرے گا۔ بیشک اللہ تمہاری ان دعاؤں کو بھی سُنتا ہے جو اپنی منفعت کے لیے دعا مانگتے ہو اور تمہارے اس عمل کو بھی جانتا ہے جو تم دوسروں کی منفعت کی خاطر کرتے ہو (یا نہیں کرتے) گویا خلقِ خدا کے حق میں صدقہ و انفاق جتنا کثیر ہوگا اسی قدر اجابتِ دعا نصیب ہوگی اور اگر انسان دوسروں کی منفعت سے صرفِ نظر کرتے ہوئے، دوسروں کے حقوق پامال کرتے ہوئے دوسروں کے حق میں نفع بخشی، فیض رسانی اور دردمندی کا عمل نظر انداز کرتے ہوئے خود کو اپنے ذاتی مفادات اور حقوق و منافع کے تنگ حصار میں محصور کرے تو دُعائیں شانِ اجابت سے بہرہ ور نہیں ہوا کرتیں، رائیگاں تو وہ بھی نہیں جاتیں کیونکہ دعا خود عبادت ہے۔ اس لیے ان کا اجر کسی نہ کسی طور پر مل ہی جاتا ہے۔ لیکن دعا کا مطلوبہ نتیجہ برآمد نہیں ہو سکتا۔

## ہم دعاؤں کی عدمِ قبولیت کا شکوہ کیوں کرتے ہیں؟

عام طور پر یہ سُننے میں آتا ہے کہ "ہماری تو دعائیں بھی قبول نہیں ہوتیں۔ خدا جانے ہم نے کیا خطا کی ہے کہ ہمیں معافی بھی نصیب نہیں ہوتی۔ ہماری پریشانیاں ہی دُور نہیں ہوتیں وغیرہ وغیرہ۔

ہم اپنی دعاؤں کی عدمِ قبولیت کا شکوہ تو کرتے ہیں لیکن اس امر کو نظرانداز کر دیتے ہیں کہ دعاؤں کی قبولیت کے لیے ایک عمل بطور شرط مقدم ہے اور ہم نے اس کو اپنی زندگی میں سے کلیتہً خارج کر دیا ہے۔ شرط پوری نہ ہو تو صلے کی کیا توقع ہو سکتی ہے؟ وہ شرط یہی ہے۔ جس کا ذکر مجملاً اوپر کیا جا چکا ہے۔ قرآن مجید آیتِ مذکورہ بالا کے بعد اگلی آیت میں اس شرط کو نئے انداز سے پُرزور طریقے

سے دوبارہ بیان کر رہا ہے :۔

أَلَمْ يَعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ هُوَ يَقْبَلُ التَّوْبَةَ عَنْ عِبَادِهِ وَ يَأْخُذُ الصَّدَقٰتِ وَ أَنَّ اللَّهَ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيمُ ۝ وَ قُلِ اعْمَلُوا فَسَيَرَى اللَّهُ عَمَلَكُمْ وَ رَسُولُهُ وَ الْمُؤْمِنُونَ ۝

(التوبہ، ۱۰۴، ۱۰۵)

کیا انہیں معلوم نہیں کہ اللہ ہی اپنے بندوں کی توبہ (اور دُعا) قبول کرتا ہے لیکن (انہیں یہ بھی معلوم ہونا چاہیئے کہ، وہ اپنی مستحق اور پریشان حال مخلوق کی خاطر) تمہارے صدقات (اور انفاق مال) خود اپنے دستِ قدرت سے وصول کرتا ہے وہ اپنے بندوں کے حق میں تمہارے ہمدردانہ عمل اور انفاق کی صورت میں تمہارا مالی ایثار دیکھ کر) یقیناً توبہ بھی قبول کرتا ہے اور مہربانی بھی فرماتا ہے۔ اے محبوب صلی اللہ علیہ وسلم فرما دیجئے۔ عمل کرو (خلقِ خدا کے لیے ایثار و قربانی کرو) پس اللہ تعالیٰ، اس کا رسول اور مومنین سب تمہارے اعمال کو دیکھ لیں گے۔

مدعائے آیت یہ ہے کہ اے خدا کے بندو! بے شک اللہ تعالیٰ تمہاری دعائیں سُنتے اور توبہ قبول فرماتے ہیں۔ لیکن تمہاری دعاؤں کی قبولیت و اجابت کے لیے ایک شرط مقرر کر دی گئی ہے۔ وہ یہ کہ ہم نے تمہیں جس مال و دولت سے نوازا ہے وہ ہماری امانت ہے۔ تمہارے ہی معاشرے اور گرد و پیش میں ہمارے کتنے بندے ایسے ہیں جو معاشرتی ناانصافیوں کا شکار ہو کر معاشی تعطل کی نذر ہو گئے ہیں تم اگر ان کی پریشانیوں کی پرواہ نہ کرو، ان کے معاشی تعطل کو رفع کرنا اپنا فرض نہ

نہ سمجھو، انہیں ضروریاتِ زندگی بہم پہنچا کر ان کی تخلیقی جدوجہد بحال کرنے کی سعی نہ کرو، اور ان سے دل سوزی و دردمندی کا عملی مظاہرہ نہ کرو، تو ہم سے کیسے توقع رکھتے ہو کہ ہم تم پر راضی ہو جائیں گے۔ کیونکہ ان پریشان حال لوگوں کا ہماری ذات سے اتنا گہرا تعلق ہے کہ جو کچھ بھی صدقہ و خیرات تم انہیں دینا چاہو وہ ہم براہِ راست اپنے دستِ قدرت سے وصول کرتے ہیں اور اپنی طرف سے انہیں عطا کرتے ہیں تاکہ ان کی عزتِ نفس مجروح نہ ہونے پائے۔ تمہاری حالت یہ ہے کہ تم یا تو ان کی پریشانیوں سے صرفِ نظر کیے رہتے ہو اور اگر کبھی اُن پر ترس کھا کر ان کی مالی اعانت کرتے بھی ہو تو اس قدر رعونت اور فخر و تمکنت کے ساتھ کرو کہ عمر بھر تمہارے احسان مند بنے رہیں۔ اس وقت تمہیں یہ خیال نہیں رہتا کہ یہ متکبرانہ اور مفتخرانہ سلوک تم ان سے نہیں بلکہ اپنے خالق و مالک سے کر رہے ہو کیونکہ تمہارے صدقات وصول کرنے والا ہاتھ ان لوگوں کا نہیں "اللہ کا ہاتھ" ہوتا ہے۔

غور تو کرو! اپنے رب سے ایسا نازیبا سلوک کرنے کے بعد تم تو بہ اور دعا کی عدمِ قبولیت کا شکوہ بھی کرتے ہو۔ وہ ذات تواب و رحیم ہے۔ تمہیں پھر بھی بخش دیتی ہے۔

ذرا سوچو تو سہی کیا اس طرزِ عمل کے بعد تم کسی قسم کے انعام و اکرام کے مستحق قرار دیئے جا سکتے ہو؟ لہٰذا اجابت و قبولیتِ دعا کی متعدد صورتوں میں سے سب سے نمایاں صورت یہی ہے کہ انسان خلقِ خدا کے حق میں رحیم و کریم بن جائے۔ پھر اس کے رحم و کرم کے بے کنار نظاروں سے لطف اندوز ہو سکے گا۔ اس لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:۔

مَنْ يَرْحَمْ يُرْحَمْ — جو بندوں پر رحم کرتا ہے اسی پر خدا کی طرف سے بھی رحم کیا جاتا ہے۔

(الحدیث)

## ۲- عملِ انفاق تزکیۂ نفس کا باعث ہے

جس طرح کہ ہم نے پہلے واضح کر دیا ہے کہ عملِ انفاق سے حاصل ہونے والا تزکیۂ مال بلا شک وشبہ "تزکیۂ نفس" کا باعث بنتا ہے۔ اس لیے یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ عملِ انفاق تزکیۂ نفس کی یقینی صورت ہے۔ ارشادِ ربّانی ہے:-

وَسَيُجَنَّبُهَا الْأَتْقَى ۝ الَّذِي يُؤْتِي مَالَهُ يَتَزَكَّى ۝ وَمَا لِأَحَدٍ عِنْدَهُ مِنْ نِعْمَةٍ تُجْزَى ۝ إِلَّا ابْتِغَاءَ وَجْهِ رَبِّهِ الْأَعْلَى ۝ وَلَسَوْفَ يَرْضَى

(الیل، ۱۷ تا ۲۱)

اور دوزخ سے یقیناً بچا لیا جائیگا وہ سب سے بڑا متقی، جو اپنا مال (خدا کی راہ میں) خرچ کرتا ہے تاکہ اس کا تزکیہ ہو (یعنی وہ خوب پاک وصاف ہو جائے)، اور کسی کا اس پر کوئی احسان نہیں جس کا وہ بدلہ چکا رہا ہو، بلکہ وہ تو اپنا مال صرف ربِّ عظیم کی رضا جوئی کے لیے خرچ کرتا ہے اور اس صورت میں جلد ہی اللہ اس سے راضی ہوگا۔

مذکورہ بالا آیات سے درج شدہ اُصول مستنبط ہوتے ہیں:-

۱- "اِنفاق فی المال" تقویٰ کی سب سے بڑی صورت ہے۔

۲- یہ دوزخ کے عذاب سے بچاؤ کی ضمانت ہے۔

۳- اِنفاق فی المال سے حقیقی تزکیۂ نفس نصیب ہوتا ہے۔

۴- عملِ اِنفاق محض رضائے الٰہی کی خاطر ہونا چاہیئے۔

۵- رضائے الٰہی کے حصول کی غرض سے اپنایا ہوا عملِ انفاق انسان کو یقیناً "مرتضائے الٰہی" بنا دیتا ہے۔

خلاصۂ کلام یہ ہوا کہ عملِ انفاق تزکیۂ نفس کے ذریعے رضائے الٰہی کے نصب العین کے حصول کی ضمانت عطا کرتا ہے بلکہ تزکیۂ نفس اور رضائے الٰہی کی اصل اور عملی اساس ہی "انفاق فی المال" ہے۔

## "انفاق فی المال" ہی اصل نیکی اور تقویٰ ہے

کوئی شخص اس تصور کو انتہا پسندی سے تعبیر کر سکتا ہے۔ لیکن ایسا سوچنا قرآنی تعلیمات کے منافی ہوگا۔ حقیقت یہ ہے کہ ہم نے "انفاق" کو معیشت کا مسئلہ اور "نیکی اور تقویٰ" کو مذہب کا مسئلہ بنا کر انہیں ایک دوسرے سے بالکل جدا کر دیا ہے۔ آج کے مذہبی فکر کا یہی التباس نوجوان نسل کو معاشی مسئلے کی سنگینی کی بناء پر اشتراکیت کی طرف مائل ہونے پر مجبور کر رہا ہے اور اگر کسی سمت سے "معیشت و مذہب" کی حقیقی وحدت و عینیت کی بناء پر "استحکامِ معیشت" کی ضرورت کا نعرہ بلند کیا جاتا ہے تو مذہبی فکر کے نام نہاد علمبردار اور خود ساختہ اجارہ دار اسے الحاد و اشتراکیت کا نام دے دیتے ہیں۔ جس سے یہ تصور عام ہو جاتا ہے کہ شاید اسلام "معاشی مسئلے" کو اس قدر بنیادی اہمیت دینے کے لیے تیار نہیں۔ اسلام کے نزدیک بنیادی مسئلہ "اخلاق و مذہب کا مسئلہ" ہے۔ اس تصور نے تعلیماتِ اسلام کا چہرہ مسخ کر دیا ہے اور یہی وجہ ہے کہ معاشی الجھنوں میں گرفتار ذہن، اسلام سے وہ قلبی و عملی اور فکری و نظریاتی وابستگی اور وفاداری محسوس نہیں کرتا جو فی الحقیقت اسے بحیثیت مسلمان ہونی چاہیئے تھی۔ اسلام سے اس فکری بُعد اور نظریاتی لاتعلقی کی ذمہ داری جدید نسل یا عوام پر نہیں، بلکہ ان نام نہاد مبلغینِ اسلام اور عمائدینِ مذہب پر عائد ہوتی ہے۔ جنہوں نے اپنے ذہنی التباس کے باعث اسلام میں معاشی مسئلے کی صحیح اہمیت اور معیشت و مذہب کے اصل تعلق کو نہیں سمجھا اور اس وجہ سے وہ عصرِ حاضر کے

انسان کے پریشان کن مسائل کی صحیح تشخیص نہیں کر سکے۔ یہ موضوع بالالتزام اس وقت ہمارے پیش نظر نہیں۔ اس پر تفصیلی روشنی مناسب موقع پر ڈالی جائے گی۔ موضوع مذکورہ بالا کے حوالے سے یہاں بھی اس امر پر کچھ نہ کچھ روشنی ضرور پڑ جائیگی۔

۱۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے :۔

لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰى تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ ؕ (آلِ عمران ، ۹۲)

تم ہرگز نیکی کو نہیں پا سکتے جب تک تم اپنی پسندیدہ اور مرغوب دولت (خدا کے راستے میں) خرچ نہیں کرتے

یہاں "برّ" یعنی نیکی اور دینداری کا حصول "اِنفاق فی المال" کے بغیر ناممکن قرار دے دیا گیا ہے۔ قرآن کا اس سے زیادہ صریح اعلان اور کیا ہو سکتا ہے کہ تمہاری نیکی صرف اور صرف خدا کے راستے میں اِنفاقِ مال پر منحصر ہے۔ گویا عام لفظوں میں "اِنفاق" ہی کو "برّ" یعنی نیکی قرار دے دیا گیا۔ اس آیت میں دو افراد کا ذکر ہے :۔

مُنْفِق ــ (اِنفاق کرنے والا مالدار) یعنی وہ شخص جو اپنا مال دوسرے پر خرچ کر رہا ہے۔

اور مُنْفَقْ علیہ ــ (جس کے حق میں اِنفاق کیا گیا ہو۔ ضرورت مند) یعنی وہ شخص جس پر مال خرچ کیا جا رہا ہے۔

کیونکہ "منفق علیہ" یا مستحقِ صدقہ جسے ضرورت مند کہتے ہیں موجود نہ ہو تو فعلِ اِنفاق کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اب قابلِ غور بات یہ ہے کہ آیت مذکورہ کے حوالے سے حصولِ برّ کے لیے "عملِ انفاق" ضروری ہے۔ عمل صرف ایک ہی ہے اور وہ ہے "اِنفاق"۔ منفِق یعنی مال دار اس کا فاعل ہے اور "منفق علیہ" یعنی ضرورت مند اس کا مفعول لہ ہے۔ اگر آپ فعلِ اِنفاق کے نتائج پر

پر غور فرمائیں تو آپ کو تسلیم کرنا پڑے گا کہ جب مالدار اپنی دولت راہِ خدا میں کسی ضرورتمند پر خرچ کرے گا تو اس فعل کا نتیجہ اس مالدار کے حق میں "نیکی اور دینداری" کی صورت میں برآمد ہوگا۔ جب کہ اس ضرورت مند کے حق میں اسی فعل کا نتیجہ "استحکامِ معیشت" کی صورت میں برآمد ہوگا۔ نیکی اور دینداری ـــ مذہب کا دوسرا نام ہے۔ گویا "عملِ انفاق" سے مالدار کا مذہب وابستہ ہے اور ضرورتمند کی معیشت، عمل ایک ہی ہے۔ لیکن اس کی ایک جہت "مذہب" ہے اور دوسری "معیشت" اس کا مطلب یہ ہوا کہ قرآن یہ اعلان کر رہا ہے کہ لوگوں کے مسئلہ "معیشت" کو نظرانداز کر کے تم اپنے "مذہب" کی سلامتی حاصل نہیں کر سکتے۔ مذہبی فضائل کا حصول لوگوں کو معاشی تعطل سے نجات دلائے بغیر ناممکن ہے۔ یہ تو مذہب و معیشت کے باہمی تعلق اور ان کے استحکام کا فلسفہ تھا۔ لیکن انفرادی طور پر جو اصول اس آیت سے وضع کیا وہ یہ ہے کہ "اصل نیکی" انفاق سے ہی ممکن ہے۔ اس کے بغیر کوئی بھی عمل نیکی قرار نہیں پا سکتا۔ حقیقی نیکی خدا کے نزدیک انفاق فی المال کے عمل سے میسر آتی ہے۔

۲۔ سورۂ بقرہ کی آیت ۱۷۷ جسے ہم "عبادت کے صحیح تصور" کے تحت بیان کر چکے ہیں، کے الفاظ بھی اسی حقیقت کی تائید کر رہے ہیں کہ اصل نیکی "انفاق فی المال" ہے۔ ارشاد فرمایا گیا:۔

| | |
|---|---|
| وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ | بلکہ نیکی یہ ہے کہ انسان، اللہ پر اور |
| وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ | آخرت، فرشتوں، کتابوں اور پیغمبروں |
| وَالْكِتٰبِ وَالنَّبِيّٖنَ | پر ایمان لائے اور پھر اپنے اس |
| وَاٰتَى الْمَالَ عَلٰى حُبِّهٖ | ایمان کا ثبوت فراہم کرتے ہوئے اللہ |
| ذَوِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى | کی محبت میں اپنا سرمایہ، دولت مستحق |

| | |
|---|---|
| وَالْمَسٰكِيْنَ وَابْنَ السَّبِيْلِ وَالسَّآئِلِيْنَ وَفِي الرِّقَابِ | رشتہ داروں، یتیموں، مسکینوں، مسافروں، حاجتمند سائلوں اور محکومی و غلامی میں جکڑے ہوئے انسانوں کی آزادی اور معاشی بحالی و استحکام پر خرچ کرے |

اس آیت میں جیسا کہ پہلے تفصیل سے بیان ہو چکا ہے۔ جملہ احکام و اعمال کو "تصورِ نیکی" میں بطور ضروری اجزاء کے شامل کیا گیا ہے۔ لیکن قابلِ غور پہلو یہ ہے کہ قرآن شرطِ ایمان پوری کرنے کے بعد نیکی کے حصول کا سب سے اوّلین تقاضا "اِنفاق فی المال" ہی کو قرار دے رہا ہے اور اس آیت کے آخر میں ارشاد فرمایا گیا :-

| | |
|---|---|
| اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُتَّقُوْنَ | یہی لوگ صاحبِ صدق ہیں اور یہی لوگ صاحبِ تقویٰ ہیں۔ |

(البقرہ : ۱۷۷)

گویا بِرّ، صدق اور تقویٰ تمام تصورات کا تقاضائے اوّلین "اِنفاق فی المال" ہے۔ اس کے بغیر انسان صالحیت کے کسی مقام کو حاصل نہیں کر سکتا۔

۳۔ قرآنِ حکیم میں جس جگہ بھی "تقویٰ" اور "متقین" کی تعریف بیان کی گئی ہے۔ یہ امر بڑا غور طلب ہے کہ "اِنفاق فی المال" کی صفت کو کہیں بھی نظر انداز نہیں کیا گیا۔ بلکہ اس عمل کو اس قدر نمایاں انداز سے پیش کیا گیا ہے کہ یہ "عینِ تقویٰ" یا تقویٰ کا جزوِ لاینفک معلوم ہوتا ہے۔ قرآنِ مجید میں سب سے پہلے "متقین" کی اصطلاح اور اس کی تعریف سورۂ بقرہ کے آغاز میں وارد ہوئی ہے ملاحظہ فرمائیے :-

| | |
|---|---|
| هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِالْغَيْبِ وَيُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ (البقرۃ: ۲، ۳) | یہ قرآن ہدایت ہے متقین کے لیے (اور متقین کون لوگ ہیں؟) یہ وہ لوگ ہیں جو غیب پر ایمان رکھتے ہیں۔ نماز قائم کرتے ہیں اور جو کچھ (تھوڑا یا زیادہ) ہم نے انہیں عطا کیا ہے اس میں سے انفاق کرتے ہیں۔ |

آپ نے ملاحظہ فرمایا کہ "ایمان بالغیب" اور "اقامتِ صلوٰۃ" یہ دو اوصاف توضروریاتِ دین میں سے ہیں۔ اجزائے ایمان اور ارکانِ اسلام کا اہم حصہ انہی پر مبنی ہے۔ ان کے بغیر توکسی شخص کا ایمان اور اسلام ہی متحقق نہیں ہوسکتا۔ اس لیے یہ دو شرائط توکسی کے "صحیح مسلمان" ہونے کے لیے مقدم تھیں۔ اب رہ گئی بات ان میں سے "متقین" کے انتخاب کی تو اس کے لیے صرف ایک شرط اور علامت کا اضافہ کیا گیا۔ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ (کہ ہمارے عطاکردہ رزق میں سے انفاق کرتے ہیں) گویا "ایمان بالغیب" سے کوئی شخص دائرۂ اسلام میں داخل ہوا۔ اقامتِ صلوٰۃ سے اس کا مسلمان ہونا بالفعل متحقق ہوا اور "انفاق فی المال" کے ذریعے حقیقت میں وہ صاحبِ تقویٰ قرار پاگیا۔

۴۔ اسی طرح "سورۂ آلِ عمران" میں جنت کے استحقاق کا بیان ہے۔ جس کے الفاظ اس طرح ہیں:۔

| | |
|---|---|
| وَجَنَّةٍ عَرْضُهَا السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ اُعِدَّتْ لِلْمُتَّقِيْنَ، الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ فِى السَّرَّآءِ وَالضَّرَّآءِ (۱۳۳، ۱۳۴) | اور جنت جس کی چوڑائی میں آسمان اور زمین آجائیں "متقین" کے لیے تیار کی گئی ہے۔ یہ متقین وہ لوگ ہیں جو خوشی اور غمی (ہر حال) میں راہِ خدا |

میں انفاقِ مال کرتے ہیں۔

اس آیت کا مفہوم اور اس میں بیان ہونے والے دیگر اوصاف کی حقیقت پہلے واضح کی جا چکی ہے۔ یہاں صرف اتنا بتانا مقصود ہے کہ خدا کے ہاں "متقین" کی سب سے پہلی اور ضروری خصوصیت "اِنفاق فی المال" ہے۔ اس کے بغیر قرآنی اصطلاح کے مطابق کسی بھی صاحبِ عمل کو "متقی" قرار نہیں دیا جا سکتا۔

۵۔ سیدنا صدیقِ اکبرؓ کی شان میں قرآنِ حکیم "الاتقیٰ" (بہت زیادہ متقی) کی اصطلاح استعمال کرتا ہے۔ یہ تقویٰ سے اسمِ تفضیل کا صیغہ ہے۔ اس کی تعریف بھی قرآن ہی کے الفاظ میں ملاحظہ فرمائیے:

وَ سَيُجَنَّبُهَا الْاَتْقَى ٥ الَّذِيْ يُؤْتِيْ مَالَهٗ يَتَزَكّٰى ٥

(اللیل، ۱۷، ۱۸)

اور دوزخ سے یقیناً بچا لیا جائے گا جو سب سے زیادہ متقی ہے اور یہ (سب سے زیادہ متقی) وہ شخص ہے جو اپنا مال راہِ خدا میں خرچ کرتا ہے تاکہ پاک و صاف ہو۔

اس آیت نے "تقویٰ" کا مبالغہ بھی "اِنفاق" کے عمل ہی سے متعین کیا اور ساتھ ہی اس کا نتیجہ ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے۔

وَلَسَوْفَ يَرْضٰى

(اللیل، ۲۱)

اور یقیناً اللہ تعالیٰ اس سے راضی ہو جائے گا۔

یہی ہمارے موضوع کا ماحصل تھا کہ فعلِ اِنفاق رضائے الٰہی کے نصب العین کے حصول کی ضمانت مہیا کرتا ہے۔ یعنی جو شخص "اِنفاق فی المال" کے ذریعے زیورِ تقویٰ سے آراستہ ہو گا۔ وہ نعمتِ رضائے الٰہی سے بھی ضرور بہرہ ور ہو کر رہے گا۔

# "انفاق" تصدیقِ دین اور ترکِ انفاق "تکذیبِ دین" ہے

ہمارا مدعا یہ واضح کرنا تھا کہ رضائے الٰہی کے نصب العین کا حصول "فعلِ احسان" سے ہی ممکن ہے اور فعلِ احسان کی عملی اساس اور حقیقی صورت "انفاق فی المال" ہے۔ مذکورہ بالا عنوان اس امر پہ دلالت کرتا ہے کہ "انفاق فی سبیل اللہ" دینِ حق کے جملہ مقاصد کی تائید و تصدیق ہے اور اس سے انحراف، دینِ حق کے جملہ مقاصد کی تکذیب و تردید۔ اگر یہ حقیقت ہو تو پھر اس بات کے تسلیم کرنے میں کوئی تامل نہیں ہو سکتا کہ فعلِ انفاق ہی حصولِ نصب العین کا واحد ذریعہ ہے اور اس کے بغیر مقصدِ حیات کو پانے کی کوئی صورت بھی ممکن نہیں۔ سب سے پہلے ہم اس کی شہادت دو ایسی قرآنی آیات سے پیش کرتے ہیں جن میں "نیکی" کی تصدیق اور تکذیب دونوں صورتوں کا موازنہ کیا گیا ہے۔ بلکہ اس موازنے سے قبل بڑے حکیمانہ انداز سے ہر جنس میں تضاد کا ذکر کیا گیا ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:-

وَالَّيْلِ إِذَا يَغْشٰى ۝ وَالنَّهَارِ إِذَا تَجَلّٰى ۝ (الیل: ۱، ۲)
قسم ہے رات کی جب چھا جائے اور قسم ہے دن کی جب چمک اُٹھے۔

ان دو آیات میں رات اور دن کا تضاد مذکور ہے اور ان کی الگ الگ علامتیں بھی بیان کی گئی ہیں۔ اسی طرح "انسان" کی جنس کو بھی دو مختلف انواع میں تقسیم کر کے بیان کیا گیا ہے:-

وَمَا خَلَقَ الذَّكَرَ وَالْاُنْثٰى ۝ (الیل: ۳)
اور قسم ہے اس کی جس نے ایک نر پیدا کیا اور اس کے مقابلے میں ایک مادہ

"رات اور دن" اور "نر اور مادہ" کی مذکورہ بالا دو مثالیں اور ان کے تضادات کو حکیمانہ انداز میں بیان کرنے کے بعد اب ارشاد فرمایا گیا:-

إِنَّ سَعْيَكُمْ لَشَتّٰى
(الیل ، ۴)

بیشک تمہاری کوششیں اور جدوجہد کی سمتیں بھی (اسی طرح) مختلف اور متضاد ہیں

یعنی کچھ لوگ اپنے عمل اور جدوجہد سے نیکی اور دین کی تصدیق کریں گے جب کہ کچھ لوگوں کی تگ ودو نیکی اور دین کی تکذیب سے عبارت ہوگی۔ لیکن سوال یہ ہے کہ اس امر کا فیصلہ کس طرح ہوگا کہ کون نیکی کی تصدیق کر رہا ہے اور کون تکذیب؟

قرآن نے اس امر کا دو ٹوک فیصلہ فرما دیا :-

فَأَمَّا مَنْ أَعْطٰى وَاتَّقٰى
وَصَدَّقَ بِالْحُسْنٰى
فَسَنُيَسِّرُهُ لِلْيُسْرٰى
وَأَمَّا مَنْ بَخِلَ وَاسْتَغْنٰى
وَكَذَّبَ بِالْحُسْنٰى
فَسَنُيَسِّرُهُ لِلْعُسْرٰى
(الیل ، ۵ : ۱۰)

پس جس نے (مستحقین کو) اپنا مال دیا اور صاحب تقویٰ ہوا اور اس نے (اس طرح) نیکی کی تصدیق کی۔ پس ہم اس کے لیے راحت کی منزل کا حاصل کرنا آسان کردیں گے اور جس نے بخل کیا۔ یعنی انفاق نہ کیا اور حاجتمندوں کی معاشی ضروریات سے بے پرواہ رہا اور اس نے (اس طرح) نیکی کو جھٹلایا، پس ہم اس کے لیے جلد ہی تنگی و دشواری کی منزل مہیا کردیں گے۔

ان آیات کی تصریح کے بعد موضوع متذکرہ کی تائید میں مزید کسی دلیل کی حاجت نہیں رہتی۔ قرآنِ حکیم نے بڑے واشگاف لفظوں میں "انفاق" کو نیکی کی تصدیق اور "بخل" کو نیکی کی تکذیب قرار دے دیا ہے۔ لہٰذا دینِ حق کی تصدیق و تکذیب کا معیار بھی لامحالہ یہی امتیاز قرار پائے گا۔ یہاں یہ پہلو بھی قابلِ توجہ ہے کہ مذکورہ بالا آیات میں نہ صرف انفاق کو "تصدیقِ حسنٰی" اور ترکِ انفاق کو "تکذیبِ حسنٰی"

قرار دیا گیا ہے بلکہ یہ بھی واضح کر دیا گیا ہے کہ جو شخص بھی "فعلِ انفاق" اپنائے گا، اس کے لیے اس کی منزل اور نصب العین کا حصول نہایت آسان کر دیا جائے گا اور اس کے برعکس جو شخص بھی ترکِ انفاق یعنی بُخل اور ارتکازِ دولت کے راستے پر گامزن ہوگا اس کے لیے منزلِ حق کا حصول دُشوار کر دیا جائے گا۔ اس قرآنی فیصلے میں کسی کے لیے کسی قسم کا کوئی استثنیٰ یا رعایت روا نہیں رکھی گئی۔ یہاں دو لفظ بڑے معنی خیز استعمال ہوئے ہیں:۔

مَنْ بَخِلَ وَ اسْتَغْنٰی (الیل: ۸)

جس نے بُخل کیا اور دوسروں کی ضروریات سے بے نیاز اور بے پرواہ رہا۔

"بخل" سے مراد اپنے سرمایہ و دولت کو خرچ نہ کرنا ہے۔ یہ "انفاق" کی متضاد حالت ہے جو ارتکاز اور اکتناز کی تمام صورتوں کو محیط ہے اور "استغناء" سے یہاں مراد معاشرے کے حاجتمند طبقے کی معاشی ضروریات سے صرفِ نظر کرنا ہے۔ اس میں ایک خاص نقطۂ نظر کی طرف نشاندہی کی گئی ہے اور وہ یہ کہ بعض لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ اگر معاشرے میں کچھ لوگ معاشی تعطل کا شکار ہوں اور ان کی یہ حاجتمندی اور اضطراری حالت انہیں ضمیر فروشی، مصلحت کوشی اور عصمت فروشی تک مجبور کر رہی ہو تو یہ ان کی اپنی لادینیت اور بے ضمیری ہے۔ اس کے ذمہ دار وہ خود ہیں یا معاشرہ ہے۔ ہمارے اوپر کوئی ذمہ داری ان کے معاملے میں عائد نہیں ہوتی۔ وہ لوگ ان کو اسی حالت میں چھوڑ کر اپنی دینداری اور پارسائی کے تحفظ میں مصروف رہنا چاہتے ہیں۔ قرآن ایسے نام نہاد دینداروں اور پارساؤں کو جھنجھوڑ جھنجھوڑ کر کہہ رہا ہے کہ جو شخص اپنی ذات اور انفرادی نیکیوں کے گنبد میں محصور رہ کر معاشرے کے دیگر پریشان حال لوگوں کے معاشی تعطل کو رفع کرنے کی کوئی کوشش نہیں کرتا بلکہ انہیں اپنے حال پہ چھوڑ کر مستغنی

اور بے نیاز" رہنا چاہتا ہے ـــــ وہ جان لے کہ اس کا عمل نیکی اور دین کی تصدیق نہیں بلکہ تکذیب ہے۔ رضائے الٰہی کا نصب العین اس طرح حاصل نہیں ہوگا بلکہ رضائے الٰہی کا نصب العین ذاتی نیکیوں کے علاوہ اپنے وسائل کو خلقِ خدا کی خدمت اور بہتری میں لُٹا دینے سے نصیب ہوگا۔ قرآن کا وعدہ ہے:۔

| | |
|---|---|
| فَسَنُيَسِّرُهٗ لِلْحُسْنٰى ، (الیل : ۱۰) | اسی طرح ہم اس پر راحت کی منزل کو پانا بہت جلد آسان کر دیں گے ۔ |

## موضوعِ متذکرہ کا سورۃ الماعون سے استدلال

جیسا کہ ہم پہلے عرض کر چکے ہیں کہ حقیقت میں "اِنفاق فی المال" ہی تصدیق و تکذیبِ دین کا معیارِ امتیاز ہے۔ "سورۃ الماعون" کا پورا مضمون اسی امر کی تائیدی شہادت فراہم کرتا ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے :۔

| | |
|---|---|
| اَرَءَيْتَ الَّذِيْ يُكَذِّبُ بِالدِّيْنِ ۞ فَذٰلِكَ الَّذِيْ يَدُعُّ الْيَتِيْمَ ۞ وَلَا يَحُضُّ عَلٰى طَعَامِ الْمِسْكِيْنِ ۞ فَوَيْلٌ لِّلْمُصَلِّيْنَ ۞ الَّذِيْنَ هُمْ عَنْ صَلَاتِهِمْ سَاهُوْنَ ۞ الَّذِيْنَ هُمْ يُرَآءُوْنَ ۞ وَيَمْنَعُوْنَ الْمَاعُوْنَ ۞ (الماعون) | کیا آپ نے وہ شخص دیکھا ہے جو دین کو جھٹلاتا ہے (یعنی دین سے کفر کرتا ہے) پس (جان لیجئے کہ) یہ وہی شخص ہے جو یتیموں کو دھکے دیتا ہے (یعنی ان سے نفرت کرتا ہے اور انہیں اپنے قریب نہیں آنے دیتا) اور مسکینوں (یعنی محتاجوں اور ضرورت مندوں) کو نہ خود کھانا دیتا نہ دوسروں کو اس کی عملی ترغیب دیتا ہے (گویا ان کی معاشی ضروریات سے بالکل بے نیاز رہتا ہے اور ان کے |

اقتصادی تعطل کو دُور کرنے کی کوشش
نہیں کرتا) پس تباہی و ہلاکت یا دوزخ کا
اذیت ناک درجہ ہے ان نمازیوں کے لیے جو
اپنی نماز (کی روح) کو فراموش کیے بیٹھے ہیں۔
(یہ نمازی) ایسے لوگ ہیں جو محض دکھلاوا
(یعنی ریاکاری) کرتے ہیں اور (ان کی بے دینی
کا یہ عالم ہے کہ) وہ گھر کے برتنے کی چیزوں
سے بھی دوسروں کو فائدہ نہیں اٹھانے دیتے

آپ نے مذکورہ بالا سورت کا مضمون اوّل سے آخر تک ملاحظہ فرمالیا۔ اس میں "دین کے جھٹلانے والوں" کی اصل پہچان بیان کی گئی ہے۔ یوں تو بدقسمتی سے ہمارے معاشرے کے اکثر لوگ اور بالخصوص مذہبی لیڈر ایک دوسرے کو یا عام گنہ گار مسلمانوں کو "مکذّب بالدّین" یعنی دین کو جھٹلانے والا اور دین سے کفر کرنے والا قرار دیتے ہی رہتے ہیں لیکن اس سُورت کے ذریعے "تکذیبِ دین" کا قرآنی معیار بھی جان لیجئے کہ وہ کیا ہے؟

قرآن سوالیہ انداز میں اپنی بات کا آغاز کر رہا ہے کہ "کیا آپ نے دین کو جھٹلانے والا شخص دیکھا ہے؟ یا کیا آپ جانتے ہیں کہ دین کو جھٹلانے والے کون لوگ ہیں؟ پھر خود ہی اس کا جواب دیتا ہے۔ یہاں تصدیقِ دین اور تکذیبِ دین کے معیار کے طور پر کسی مسلک یا اعتقاد کی بات نہیں کی گئی۔ توحید اور شرک کے مسائل کا بیان نہیں کیا گیا۔ کیونکہ عقائدِ صحیحہ تو ہر مسلمان کے لیے شرطِ اوّلین ہیں۔ یہاں بات ہو رہی ہے ان لوگوں کی جو مسلمان ہیں۔ عقیدۃً کافر یا ملحد و مشرک نہیں۔ بلکہ نمازی بھی ہیں۔ قرآن یہ واضح کرنا چاہتا ہے کہ مسلمانوں اور دینِ حق کے نام نہاد

علمبرداروں میں بھی "دین کو جھٹلانے والے" موجود ہیں اور وہ کون ہیں؟ ان کی علامات کے طور پر قرآن نے بقیہ آیات بیان کی ہیں۔

- **فَذٰلِكَ الَّذِيْ يَدُعُّ الْيَتِيْمَ**

یہ وہ لوگ ہیں جو معاشرے کے بے سہارا یتیموں سے نفرت کرتے ہیں۔ ان کی بھلائی اور ہمدردی و بہی خواہی کی کوئی تڑپ ان کے دلوں میں موجود نہیں ہوتی۔ "دھکے دینے" کا مطلب یہ ہے کہ انھیں اپنے "STATUS" یعنی معاشرتی حیثیت کے برابر نہ سمجھتے ہوئے خود سے دُور رکھتے ہیں۔ ان سے لاتعلقی، بیگانگی اور کبر و نخوت کا سلوک کرتے ہیں بلکہ انھیں معاشرے پر بوجھ تصوّر کرتے ہیں۔ اس آیت کے ذریعے قرآن نے ایک مخصوص ذہنیت کی نشاندہی کی ہے جو نام نہاد "بڑے لوگوں" میں فراوانی کے ساتھ پائی جاتی ہے۔

- **وَلَا يَحُضُّ عَلٰى طَعَامِ الْمِسْكِيْنِ**

اور ان کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ حاجتمندوں اور مسکینوں کی معاشی کفالت کرنے کے لیے نہ خود تیار ہوتے ہیں اور نہ اس کے لیے دوسروں کو تیار کرتے ہیں۔ یعنی ان ضرورت مندوں کو معاشی تعطّل سے نجات دلانے کے لیے "اِنفاق فی المال" نہیں کرتے۔ "وَلَا يَحُضُّ" میں یہ نکتہ بھی قابلِ غور ہے کہ ان کی جد وجہد کا رُخ کبھی بھی یہ نہیں ہوتا کہ معاشرے کے اہلِ ثروت افراد کا رویّہ غریب اور بے سہارا لوگوں کی نسبت بدلا جائے۔ "ترغیب دلانے" سے مراد یہ ہے کہ اپنے قول و فعل اور سعی و کاوش سے دوسرے لوگوں کو اس امر کا قائل کیا جائے کہ ہمارے مال و دولت میں صرف ہمارا ہی نہیں بلکہ معاشرے کے دیگر مستحق افراد کا بھی حق ہے۔ جیسے قرآنِ حکیم میں مذکور ہے:

وَفِيْٓ اَمْوَالِهِمْ حَقٌّ ۔۔۔ اور ان کے مال و دولت میں محتاجوں

لِلسَّائِلِ وَالْمَحْرُوْمِ (الذاریات: ۱۹) اور محروموں کا بھی) حق ہے۔

جس چیز کو قرآن ایجابی اور وجوبی طور پر "حق" سے تعبیر کر رہا ہے۔ دنیا کی کوئی طاقت اسے غیر ضروری یا محض نفل و استحباب قرار دے کر اس کی اہمیت کم نہیں کر سکتی۔ "حق" اسے کہتے ہیں جس کا ادا کیا جانا ہر صورت میں ضروری ہو۔ اگر دینے والا رضا و رغبت سے کسی کا حق ادا نہ کرے تو حقدار اپنا حق جبراً بھی لے سکتا ہے۔ لیکن اس کی صورت بھی باضابطہ ہوگی، بے ضابطہ نہیں۔ حق بہرحال حق ہوتا ہے، کوئی مانے یا نہ مانے، ادا کرے یا نہ کرے، اس سے اس کی حقیقت متاثر نہیں ہو سکتی اور نہ اس طرح قانون کسی حقدار کو اس کے حق سے محروم گردان سکتا ہے۔ اگر کچھ لوگ اپنی مجبوریوں اور معذوریوں کی بنا پر جائز طریقے سے اپنی ضروریات کے کفیل نہ ہو سکیں تو ان کی معاشی کفالت کا انتظام ان کا معاشرتی حق ہے۔ یہ اہلِ ثروت کے ذمے فرض اور لازم ہے۔ اگر وہ اپنا فرض ادا کریں تو اس میں کسی کا کوئی احسان نہیں ہوگا بلکہ حقدار کو اس کا حق مہیا کیا جا رہا ہوگا۔ ہاں اگر ان کا معاشرتی مقام بلند کرنے کے لیے ان پر زائد از ضرورت کچھ خرچ کیا جائے تو یہ "فعلِ احسان" ہوگا۔ جو انسان کو "انسانِ مرتضیٰ" کے مقام پر فائز کر دیتا ہے۔

گویا جو لوگ نہ اپنے اندر ایسا داعیہ اور عمل رکھتے ہیں اور نہ ہی اپنی تحریک سے دوسروں کو خود غرضانہ اور مفاد پرستانہ رویّے سے ہٹاتے ہیں بلکہ مسکینوں اور سفید پوش محتاجوں کو اسی مجبوری کی حالت میں گرفتار دیکھ کر بے نیازی سے اپنا وقت گزار رہے ہیں۔ یہی وہ لوگ ہیں جو دین کو جھٹلانے والے ہیں۔ خواہ وہ بزعم خویش کتنے ہی دین دار بنتے پھریں۔

● فَوَيْلٌ لِّلْمُصَلِّيْنَ ۝ الَّذِيْنَ هُمْ عَنْ صَلَاتِهِمْ سَاهُوْنَ ۝ الَّذِيْنَ هُمْ يُرَآءُوْنَ ——— یہاں قرآن نے

"اَلْمُصَلِّیْنَ" کی اصطلاح استعمال کر کے ایک اور عقدہ حل کر دیا۔ وہ یہ کہ تکذیب دین (یعنی دین کو جھٹلانے) کا فعل ظاہری عبادات کے التزام کے باوجود بھی ہو سکتا ہے۔ یہ عین ممکن ہے کہ کچھ لوگ نماز وغیرہ کا اہتمام بھی کرتے ہوں لیکن اس کے باوجود ان کا طرزِ عمل دینِ حق کو جھٹلانے کے مترادف ہو۔ قرآن حکیم اس امر کی وضاحت بڑے زوردار الفاظ میں کر رہا ہے ۔ کہ تباہی اور ہلاکت یا عذاب آخرت کے حقدار ہیں وہ لوگ جو نماز تو پڑھتے ہیں لیکن نماز کی رُوح ان کے عمل میں نہیں ہوتی۔ یعنی روحِ نماز کو فراموش کیے ہوئے ہیں اگر اس جگہ "هُمْ عَنْ صَلَاتِهِمْ سَاهُوْنَ" سے مراد ہو نماز کا یہ معنی ہوتا کہ وہ نماز باقاعدگی سے نہیں پڑھتے یا نماز کو ترک کیے ہوئے ہیں۔ تو ایسے لوگوں کو قرآن کبھی بھی "المصلین" یعنی نمازی کی اصطلاح سے تعبیر نہ کرتا۔ قرآن کا ان لوگوں کے حق میں "نمازی" کا لقب استعمال کرنا اس حقیقت کو صراحت کے ساتھ واضح کر رہا ہے کہ وہ فریضہ صلوٰۃ ادا کرتے ہیں کیونکہ تارکِ صلوٰۃ کو قرآن "مصلی" نہیں کہہ سکتا اسی طرح اگر کوئی شخص بالالتزام یعنی باقاعدگی سے نماز نہ پڑھتا ہو تو اسے بھی قرآن "المصلین" (نمازیوں) کے زمرے میں شامل نہیں کر سکتا اور پھر ایسے لوگوں کو "سَاهُوْنَ عَنِ الصَّلٰوۃ" (نماز کو بھولے ہوئے) بھی نہیں کہا جا سکتا۔

"سَاهُوْنَ عَنِ الصَّلٰوۃ" کی اصطلاح تقاضا کرتی ہے کہ نماز کو کلیتہً فراموش کر دیا گیا ہو۔

اور "المُصَلِّین" کی اصطلاح اس بات کا تقاضا کرتی ہے کہ وہ لوگ نماز پڑھتے ہوں۔

لہٰذا "المصلّین" اور "سَاهُوْنَ عَنِ الصَّلٰوۃ" دونوں کا اکٹھا ہونا

سوائے اس کے اور کسی صورت میں صحیح نہیں ہو سکتا کہ "وہ ایسے لوگ ہیں جو نماز تو پڑھتے ہیں مگر اس کے باوجود نماز کو فراموش کیے ہوئے ہیں"۔ اس سے یہ ثابت ہوا کہ نماز پڑھ کر بھی نماز کو بھلایا جا سکتا ہے"۔ اور یہ اس طرح ممکن ہے کہ نماز تو پڑھی جائے لیکن نماز کی اصل روح کو نظر انداز کر دیا جائے۔ الفاظِ قرآنی بھی اسی مفہوم کی تائید کرتے ہیں :۔

| | |
|---|---|
| اَلۡمُصَلِّیۡنَ ۝ الَّذِیۡنَ هُمۡ عَنۡ صَلَاتِهِمۡ سَاهُوۡنَ | تباہی ہے ایسے نمازیوں کے لیے جو اپنی نمازوں (کی روح) کو بھولے ہوئے ہیں۔ |
| (الماعون: ۶/۵) | |

اس کا مقصد یہ ہے کہ "وہ لوگ نماز تو پڑھتے ہیں لیکن نماز ان سے جس چیز اور طرزِ عمل کا تقاضا کرتی ہے اس کو کلیتہً پسِ پشت ڈالے ہوئے ہیں"۔ اسی کو روحِ صلوٰۃ کا فراموش کرنا کہتے ہیں اور اسی وجہ سے ان کی نمازیں بارگاہِ ایزدی میں محض ریاکاری اور دکھلاوا قرار پا گئی ہیں۔

## روحِ نماز کیا ہے؟

سوال یہ ہے کہ آخر وہ روحِ نماز کیا ہے جسے فراموش کر کے پڑھی جانے والی تمام نمازیں خدا کے نزدیک ریاکاری بن جاتی ہیں اور بجائے بھلائی یا ثواب کے آخرت میں اذیت ناک عذاب یا تباہی و بربادی کا باعث بن جاتی ہیں؟

اس روحِ نماز کو فراموش کرنے کا ذکر قرآن اسی سورت میں پہلے ہی واضح کر چکا ہے "فَذٰلِكَ الَّذِيۡ يَدُعُّ الۡيَتِيۡمَ ۝ وَ لَا يَحُضُّ عَلٰى طَعَامِ الۡمِسۡكِيۡنِ" یعنی اگر لوگ نماز پڑھ کر یہ سمجھیں کہ ہم نے اپنا فرضِ بندگی اور تقاضائے دین پورا کر دیا۔ درآں حالیکہ وہ اپنے معاشرے کے ضرورت مندوں اور بے سہارا لوگوں کی معاشی پریشانیوں کی کوئی پرواہ نہ کریں

اور نہ انھیں ابتلا کی اذیتوں سے نجات دلانے کی کوشش کریں۔ قرآن ان لوگوں کو للکار کر کہہ رہا ہے ـــــ "کہ اس طرح فریضۂ بندگی اور تقاضائے دین پورا نہیں ہو سکتا۔ ایسا طرزِ عمل خدا کے نزدیک "دین کی تکذیب" ہے ـ ایسی نمازیں دکھلاوا اور ریاکاری ہیں اور یہ ریاکارانہ عبادات جنّت کا نہیں دوزخ کا باعث ہوں گی۔"

خدا کی ذات تمہاری نمازوں اور دیگر عبادات کی محتاج نہیں اور نہ یہ عبادات مقصود بالذات ہیں۔ نماز ہو یا کوئی اور عبادت وہ اسی لیے فرض کی جاتی ہے کہ وہ کسی اور اعلیٰ مقصد اور نصب العین کے حصول کا ذریعہ بنے اگر مقصد نظر انداز ہو جائے اور ذریعہ بجائے خود مقصود و مطلوب قرار پا جائے تو اس ذریعے کی اپنی افادیت بھی ختم ہو جاتی ہے ـ جیسے دولت انسانی زندگی میں حصولِ آسائش کا ذریعہ ہے ـ اگر مقصدِ آسائش پیشِ نظر نہ رہے اور دولت بجائے خود مقصد بن جائے تو اسے "بخل" کہیں گے اور ایسی دولت بخیل کے لیے کسی افادیت و منفعت کا باعث نہ رہے گی۔ بلکہ اس شخص کے لیے ایسی دولت کا وجود بھی عذاب بن جائے گا۔ اسی طرح نماز اور دیگر عبادات کا مقصد یہ ہے کہ ان کے ذریعے انسانی طرزِ عمل میں انقلاب آئے۔ انسان جس رب کے سامنے سربسجود ہو کر اس کی خالقیت و مالکیت اور اپنی غلامی و بندگی کا اعتراف کر رہا ہے ـ اسے چاہیئے کہ اب اس کی مخلوق کی خدمت کرے اور اسی کے حکم اور رضا کی خاطر اس کے پریشان حال بندوں کو آسودگی اور آسائش مہیا کرنے کے لئے خود کو وقف کر دے ـ حتیٰ کہ اپنے وسائلِ دولت بھی سب سے پہلے خلقِ خدا کی معاشی ضروریات پر خرچ کرے ـ دردمندی اور نفع بخشی کے اسی طرزِ عمل کا نام "عینِ ایمان اور روحِ نماز" ہے ـ جس کا

ذکرِ "نیکی" کی تعریف میں قرآن کے حوالے سے پہلے ہی کیا جا چکا ہے۔

● وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ ــــ وَاٰتَى الْمَالَ عَلٰى حُبِّهٖ ذَوِى الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنَ وَابْنَ السَّبِيْلِ وَالسَّآئِلِيْنَ وَفِى الرِّقَابِ ــــ

اور نیکی یہ ہے کہ انسان اللہ پر ایمان لائے ــــ اور اس کی محبت میں اپنا مال و دولت، مستحق رشتہ داروں، یتیموں، مسکینوں، مسافروں، محتاجوں اور غلامی کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے لوگوں پر خرچ کر دے۔

گویا بندگی ــــ یہ ہے کہ انسان کس حد تک اپنے خالق و مالک کی رضا کی خاطر اس کے پریشان حال بندوں سے عملی ہمدردی اور بہی خواہی کا مظاہرہ کرتا ہے۔ اگر دل میں انسانیت کا یہ درد اور جذبۂ خدمت نہ ہو بلکہ اس کے برعکس زندگی کا طرزِ عمل خود غرضانہ، مفاد پرستانہ اور بہیمانہ ہو تو کوئی عبادت عبادت نہیں اور نہ کوئی نماز، نماز ہے۔ سب دکھلاوا ہے اور ریاکاری ہے، جو انسان کو بجائے خدا کے قریب کرنے کے، جہنّم کا ایندھن بنا دے گا۔

نماز کی روح اور دینِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کی اصل یہی ہے کہ محبتِ الٰہی میں بندگانِ خدا کی ہر ممکن خدمت کی جائے۔ معاشرے کے بے سہارا اور محتاج لوگوں کی خدمت و کفالت درحقیقت رضائے الٰہی اور قربِ الٰہی کا باعث ہے اور یہی مقصودِ صلوٰۃ ہے۔

● حضور علیہ السلام نے حضرت عائشہؓ سے فرمایا:۔

یا عائشۃ لا تردی المسکین ولو بشق تمرۃ یا عائشۃ احبی المساکین

اے عائشہ! کسی بھی محتاج اور ضرورتمند کو مایوس نہ کر خواہ کھجور کی گٹھلی ہی کیوں نہ دے سکو۔ مزید یہ کہ

وقربهم فان الله يقربك يوم القيامة
(ترمذی)

غریب اور محتاج لوگوں سے محبت کیا کرو اور ان سے قربت حاصل کیا کرو۔ بے شک اس کے صلے میں اللہ تعالیٰ روزِ قیامت تمہیں اپنے قرب سے نوازیں گے۔

- اسی طرح ابوہریرہؓ روایت کرتے ہیں۔ حضور علیہ السلام نے فرمایا:۔

الساعی علی الارملة والمساکین کالمجاهدین فی سبیل الله اوکالذی یصوم النهار ویقوم اللیل
(بخاری ومسلم)

بیوہ عورتوں اور محتاجوں کی خدمت و اعانت کرنے والا اللہ کی راہ میں جہاد کرنے والوں کے برابر ہے یا اس نیکوکار کے برابر ہے جو عمر بھر دن کو روزے رکھے اور ساری رات عبادت کرے

- سہل بن سعدؓ روایت کرتے ہیں کہ حضور علیہ السلام نے فرمایا:۔

انا وکافل الیتیم فی الجنة هکذا وقال باصبعیه السبابة والوسطی
(صحیح بخاری)

میں اور یتیم کی کفالت کرنے والا جنت میں اس طرح ہوں گے جیسے یہ دو انگلیاں۔ آپؐ نے انگشتِ شہادت اور درمیانی انگلی سے اشارہ فرمایا

- قرآن مجید میں ایک اور مقام پر سورۃ ماعون کی تعلیم کو اس طرح دہرایا گیا ہے:۔

وَيُطْعِمُونَ الطَّعَامَ عَلَىٰ حُبِّهِ مِسْكِينًا وَيَتِيمًا وَأَسِيرًا
(الدہر ۸)

(اللہ تعالیٰ کے مقبول بندے وہ ہیں) جو اس کی محبت میں محتاجوں، یتیموں اور اسیروں کو کھانا کھلاتے ہیں۔

## اصل دینداری کی قرآنی تعبیر

جس طرح اوپر بیان ہو چکا ہے کہ روحِ نماز درحقیقت وہ جذبہ اور طرزِ عمل ہے جو معاشرے کے بے سہارا ضرورت مند اور پریشان حال لوگوں کی زندگی سنوارنے سے عبارت ہو۔ یہی عمل اصلِ دین ہے۔

۱۔ قرآنِ حکیم میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے:۔

مَا اَدْرٰىكَ مَا الْعَقَبَةُ ۝
فَكُّ رَقَبَةٍ ۝ اَوْ اِطْعٰمٌ
فِيْ يَوْمٍ ذِيْ مَسْغَبَةٍ ۝
يَّتِيْمًا ذَا مَقْرَبَةٍ ۝
اَوْ مِسْكِيْنًا ذَا مَتْرَبَةٍ ۝
ثُمَّ كَانَ مِنَ الَّذِيْنَ
اٰمَنُوْا وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ
وَتَوَاصَوْا بِالْمَرْحَمَةِ ۝
اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ الْمَيْمَنَةِ ۝
وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِاٰيٰتِنَا
هُمْ اَصْحٰبُ الْمَشْـَٔمَةِ ۝

(البلد، ۱۲ تا ۱۹)

کیا آپ جانتے ہیں کہ گھاٹی (اعمالِ صالحہ کا بجالانا یا صحیح معنوں میں دینی مشقت کرنا) کیا ہے؟ یہ کسی کو زنجیرِ غلامی سے آزاد کرانا ہے یا کسی کو بھوک والے دن کھانا کھلانا ہے (اپنی کسی کو فقر وافلاس کی حالت سے نجات دلا کر اس کی معیشت سنوارنا ہے) خواہ کوئی قرابت دار یتیم ہو یا خاک نشین مسکین، تب وہ شخص (جس نے دوسروں کی معیشت سنوارنے میں اس قدر مشقت کی) اہلِ ایمان میں سے ہوگا جنہوں نے آپس میں صبر و تحمل کی ہدایتیں کیں اور باہمی مودت و رحمت کی تاکید اور برتاؤ کیا۔ (لہٰذا) یہی لوگ دائیں طرف والے (اصل دیندار اور جنتی) ہیں اور جن لوگوں نے ہماری (ان) ہدایات سے انحراف

کیا، وہ بائیں طرف والے (یعنی بےدین
اور جہنمی) ہیں۔

مذکورہ بالا آیات نے "اَلْعَقَبَۃ" (دینِ حق کی پیروی کا وہ اصل راستہ جو شہادت گہِ اُلفت ہے) کے عنوان سے جس عمل کا ذکر کیا ہے وہ صرف اور صرف ضرورت مندوں اور محتاجوں کے معاشی ابتلاء و تعطّل کو دُور کر کے انہیں زندگی میں آسودگی و آسائش مہیا کرنا ہے تاکہ وہ آزادی کے ساتھ اپنی تخلیقی جدوجہد جاری رکھ سکیں۔ بالآخر اسی عمل کو شرطِ ایمان قرار دے کر صبر و تحمل اور باہمی مودت و رحمت کی تلقین کی گئی ہے اور ایسے لوگوں کو "اصل دیندار اور جنّتی" قرار دیا گیا ہے۔ جب کہ اس طرزِ عمل اور ہدایاتِ ربانی سے انکار و انحراف کرنے والوں کو لادین اور جہنمی قرار دیا گیا ہے۔

یہ ہے "اصل دینداری کی قرآنی تعبیر" جس کو ہم نے اپنے مزعومہ مفادات کی خاطر محض نفل نیکی اور فعلِ مستحب کے کھاتے میں ڈال کر خالقِ قرآنی سے صرفِ نظر کر لیا ہے۔

۲- اسی طرح قومِ ثمود کی تباہی و ہلاکت کا بیان کرتے ہوئے قرآنِ مجید "سورۃ الماعون" کے مضمون کو پھر دہراتا ہے۔ جس سے "بے دینی" کے قرآنی تصور کا اندازہ ہوتا ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے :-

| | |
|---|---|
| كَلَّا بَلْ لَا تُكْرِمُونَ الْيَتِيمَ ○ وَلَا تَحَاضُّونَ عَلَىٰ طَعَامِ الْمِسْكِينِ ○ وَتَأْكُلُونَ التُّرَاثَ أَكْلًا لَمًّا ○ وَتُحِبُّونَ الْمَالَ حُبًّا | ہرگز نہیں۔ بلکہ اس لیے کہ تم یتیموں (یعنی بے سہارا لوگوں) کی عزت نہیں کرتے۔ آپس میں محتاجوں اور ضرورتمندوں کو کھانا کھلانے کی ترغیب نہیں دیتے (یعنی ان کو معاشی تعطّل سے نجات دلانے |

حُبًّا جَمًّا (الفجر: ۱۷۔۲۰)

کی کوئی انفرادی یا اجتماعی کوشش نہیں کرتے، اور (تمہاری اپنی خود غرضی اور مفاد پرستی کا یہ حال ہے کہ) میراث کا مال ہپ ہپ کھاتے ہو اور مال و دولت سے بے پناہ محبت رکھتے ہو۔

ان آیات کے بعد یہ فرمایا گیا کہ ایسے لوگ جہنم کے سخت عذاب میں مبتلا ہوں گے۔ قرآن نے صراحت کے ساتھ اس طرز عمل کو بے دینی اور قوم ثمود کی تباہی کا باعث قرار دیا ہے۔

● وَيَمْنَعُوْنَ الْمَاعُوْنَ ـــ ـــ سورۃ ماعون میں "دین کو جھٹلانے والوں" کی آخری علامت یہ بیان کی گئی ہے کہ ان کی دسیسہ کاری کا یہ عالم ہے کہ وہ گھر کے برتنے کی معمولی چیزیں بھی اپنی ذات تک روک رکھتے ہیں۔ ان سے استفادہ و استعمال میں دوسروں کو شریک نہیں ہونے دیتے۔ یہاں "عام نفع بخش اور فیض رسانی" کا تصور اپنے منتہائے کمال کو پہنچ گیا۔ قرآن نے انسانی بہبود اور مفادِ عامہ کا وہ دینی ضابطہ مہیا کیا ہے کہ اشتراکیت سمیت دنیا کا کوئی اور نظامِ معیشت اس کی گرد کو بھی نہیں پہنچ سکتا۔ اشتراکیت تو صرف "ذرائع پیداوار" کو مشترکہ عوامی افادیت کی چیز بنانا چاہتی ہے اور جہاں تک ذاتی استعمال کی چیزوں یعنی "اشیائے صرف" کا تعلق ہے ان میں ہر مالک کو مکمل آزادی اور غیر مشروط و غیر محدود تصرف کا حق دیتی ہے لیکن اسلام "تصورِ انفاق" کی صورت میں دین کا جو "وجوبی ضابطہ" عطا کرتا ہے۔ اس میں "اشیائے صرف" یعنی گھر کے استعمال کی چیزوں میں بھی دوسروں کو حقِ انتفاع دیتا ہے۔ کوئی مالک ان اشیاء کی ملکیت بھی اس طرح غیر محدود اور غیر مشروط نہیں رکھ سکتا کہ دوسروں کی ضرورت کے

باوجود انہیں ان سے محروم رکھا جا سکے۔ بلکہ ایسا طرزِ عمل قرآن کے واضح اعلان کے مطابق "تکذیبِ دین" ہے۔ جسے سادہ لفظوں میں اسلام کے ساتھ کفر کہا جا سکتا ہے۔

مذکورہ بالا دلائل و شواہد کے مطابق اس امر کو تسلیم کرنے میں کوئی تامل باقی نہیں رہنا چاہیے کہ "انفاق فی المال" ہی حقیقت میں تصدیقِ دین اور اس کا ترک تکذیبِ دین ہے۔ لہٰذا فعلِ احسان کی وہ صورت جو رضائے الٰہی کے لیے "عملِ اساس" کا درجہ رکھتی ہے۔ "انفاق فی المال" ہی قرار پاتی ہے۔

## عملِ انفاق ہی حصولِ رضائے الٰہی کی حقیقی اساس ہے

اس اٹل اور ناقابلِ تردید حقیقت کو قرآن نے ایک شاندار تمثیل کے ساتھ بیان کیا ہے۔

۱۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے :-

| | |
|---|---|
| مَثَلُ الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ أَمْوَالَهُمُ ابْتِغَاءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ وَتَثْبِيْتًا مِّنْ أَنْفُسِهِمْ كَمَثَلِ جَنَّةٍ بِرَبْوَةٍ أَصَابَهَا وَابِلٌ فَآتَتْ أُكُلَهَا ضِعْفَيْنِ فَإِنْ لَّمْ يُصِبْهَا وَابِلٌ فَطَلٌّ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ (البقرۃ: ۲۶۵) | جو لوگ انفاق کرتے ہیں (یعنی اپنا مال دوسروں پر خرچ کرتے ہیں) خدا کی رضا چاہتے ہوئے اور اپنے دلوں کو مطمئن رکھتے ہوئے، ان کی مثال ایسے ہے جیسے ایک باغ اونچائی پر ہو اور اس پر زوردار بارش ہو تو وہ دوگنا پھل لاتا ہے اور اگر اس پر زوردار بارش نہ بھی ہو تب بھی اس کے لیے اوس (پھل لانے کو) کافی ہوتی |

ہے اور اللہ تعالیٰ تمہارے اعمال دیکھ رہا ہے۔

اس آیت نے موضوعِ متذکرہ کی صحت و حقانیت پر مزید مہرِ تصدیق ثبت کر دی ہے۔ مدعائے آیت یہ ہے کہ جس طرح مرطوب آب و ہوا کے کسی علاقے میں اونچائی پر واقع باغ، بارش ہو یا نہ ہو، ہر حال میں پھل دیتا ہے۔ اسی طرح "انفاق فی المال" تھوڑا ہو یا زیادہ ہر صورت میں رضائے الٰہی کا پھل لاتا ہے۔ رضائے الٰہی کے حصول کی حتمی ضمانت جس انداز سے "عملِ انفاق" کے نتیجے میں بیان کی گئی ہے۔ کسی اور عمل کے نتیجے میں نہیں کی گئی۔ اس تمثیل کے ذریعے دراصل یہ واضح کیا گیا ہے کہ یہ ممکن ہی نہیں کہ کوئی شخص رضائے الٰہی کی خاطر "انفاق" کرے اور اسے بالیقین رضائے الٰہی کا ثمر نصیب نہ ہو۔ گویا "اِنفاق فی المال" اور "رضائے الٰہی" دونوں لازم و ملزوم ہیں۔ یا "شرط" اور "صلہ" ہیں۔ اگر مطلوبہ شرط پوری کی جائے تو صلہ بہرصورت میسر آ کر رہے گا۔

۲۔ قرآنِ حکیم نے اسی تصور کو ایک اور مقام پر یوں بیان کیا ہے:

| | |
|---|---|
| وَمِنَ الْاَعْرَابِ مَنْ يُّؤْمِنُ | اور (صحابہ میں سے) کچھ گاؤں والے |
| بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ | ایسے ہیں کہ اللہ اور آخرت پر ایمان |
| وَيَتَّخِذُ مَا يُنْفِقُ | رکھتے ہوئے جو "انفاق" کرتے ہیں۔ |
| قُرُبٰتٍ عِنْدَ اللّٰهِ وَ | اسے اللہ کا زیادہ سے زیادہ قرب اور |
| صَلَوٰتِ الرَّسُوْلِ ۞ اَلَآ | رسول کی دعائیں حاصل کرنے کا ذریعہ |
| اِنَّهَا قُرْبَةٌ لَّهُمْ ؕ | سمجھتے ہیں۔ (اے محبوب صلی اللہ علیہ |
| سَيُدْخِلُهُمُ اللّٰهُ فِيْ | وسلم انہیں بتا دیجئے کہ) ہاں تمہارا |

رَحْمَتِهٖ ؕ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝ وَالسّٰبِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ مِنَ الْمُهٰجِرِيْنَ وَالْاَنْصَارِ وَالَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُمْ بِاِحْسَانٍ رَّضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ وَاَعَدَّ لَهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ تَحْتَهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا ؕ ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ

(التوبہ : ۹۹، ۱۰۰)

انفاق یقیناً قربِ الٰہی کا باعث ہوگا اور اللہ تعالیٰ (اس کے نتیجے میں) جلد ہی انہیں اپنی رحمت میں داخل فرمائیں گے۔ بیشک اللہ بخشنے والا مہربان ہے اور (اس معاملے میں) سب سے پہلے سبقت لینے والے مہاجر اور انصار صحابہ ہیں اور جو لوگ "فعلِ احسان" کے ذریعے (قیامت تک) ان کی پیروی کریں گے۔ اللہ ان سے راضی ہو جائے گا اور وہ اللہ سے راضی رہیں گے اور ان کے لیے جنتیں (یعنی باغات) تیار کر رکھی ہیں۔ جن کے نیچے نہریں رواں ہیں۔ وہ ہمیشہ کے لیے ان میں رہیں گے۔ یہی سب سے بڑی کامیابی ہے۔

پہلی آیت نے "انفاق" کو اجمالی طور پر قربِ الٰہی جل مجدہٗ اور قرب و رضائے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا باعث قرار دیا ہے اور دوسری آیت نے اس عمل کو "اِحسان" کے ساتھ تعبیر کرتے ہوئے "رضائے الٰہی" کی حقیقی اساس قرار دیا ہے۔

- خلاصہ کلام یہ ہوا کہ حیاتِ انسانی کا اصل نصب العین اور مقصدِ وحید "رضائے الٰہی کا حصول ہے۔ اس کے لیے تحریک "تزکیہ نفس کی آرزو" کی صورت میں شروع ہوتی ہے اور اس کا حصول "فعلِ احسان" سے ہوتا ہے لیکن

فعلِ احسان کی واحد عملی اساس اور حقیقی صورت "انفاق فی المال" ہے۔ اس کے بغیر نہ "احسان" کا کوئی مفہوم باقی رہتا ہے اور نہ حصولِ نصب العین کی کوئی سبیل۔

فَاعْتَبِرُوْا يٰٓاُولِي الْاَبْصَار

باب ششم

# انسانی جدّوجُہد کا نمونۂ کمال

# حصولِ نصب العین کی جدوجہد کا نمونۂ کمال

یہاں یہ واضح کرنا درکار ہے کہ "حصولِ نصب العین کی جدوجہد" کا "نمونۂ کمال" کیا ہے؟ نمونۂ کمال صاف ظاہر ہے۔ اس لیے ہوتا ہے کہ اس کی اتباع کر کے مطلوبہ معیارِ عمل تک پہنچا جائے۔ لہٰذا نمونۂ کمال اسی طرزِ عمل کو قرار دیا جا سکتا ہے۔ جو قابلِ تقلید بھی ہو اور بلندی و کمال کے تمام تقاضوں کو فی نفسہٖ پورا بھی کرتا ہو۔ چونکہ نصب العین "رضائے الٰہی کا حصول" ہے۔ اس لیے نمونۂ کمال اسی کو قرار دیا جائے گا۔ جس میں اس شرط کے پورا کرنے کی بتمام و کمال ضمانت موجود ہو۔

## نمونۂ کمال کا قرآنی تصور

جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے۔ جب بندہ بارگہِ ایزدی سے "صراطِ مستقیم" کی ہدایت طلب کرتا ہے تو گویا وہ بیک وقت تین چیزوں کا مطالبہ کرتا ہے :-

- ایک نصب العین کا تعین
- دوسرے اس کے حصول کا لائحہ عمل
- اور تیسرے اس کے حصول کی حتمی ضمانت

اب ان تینوں تقاضوں کی تکمیل کے لیے قرآن یہ جواب دیتا ہے :۔

صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ ۝ غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّيْنَ

(الفاتحۃ : ۶،۷)

وہ راستہ جو ان تینوں تقاضوں کی تکمیل کرتا ہے، (صراطِ مستقیم ہے اور) یہ ان لوگوں کا راستہ ہے جن پر (اے باری تعالیٰ) تو نے انعام فرمایا۔ (پھر تیرے انعام یافتہ بندے ہونے کی بنا پر) نہ وہ کبھی تیرے غضب کا شکار ہوئے اور نہ راہِ ہدایت سے بھٹکے۔

یہاں انعام یافتہ بندوں کو مطلوبہ ہدایت کے لیے بطور "نمونۂ کمال" بیان کیا گیا ہے۔ سوال یہ ہے کہ باری تعالیٰ نے نصب العین کے تعین، اس کے حصول کے لائحہ عمل اور اس کی حتمی ضمانت کے لیے اپنے انعام یافتہ بندوں کو بطور "نمونۂ کمال" کیوں پیش کیا۔ کیا ان کے حوالے کے بغیر مقصد بیان نہیں ہو سکتا تھا؟ اس کا واضح جواب یہ ہے کہ "نمونہ" کسی ایسے طرزِ عمل کو کہتے ہیں۔ جو انسانی صورت میں مشخص اور معین ہو، جسے دیکھا، سنا اور سمجھا جا سکے، جس میں مطلوبہ معیارِ عمل واقعۃً اپنے کمال کو پہنچا ہوا دکھائی دے اور پیکرِ محسوس ہونے کی بنا پر اس میں حصولِ کمال کے عمل کا مشاہدہ بھی کیا جا سکے تاکہ پیروی کرنے والے حصولِ نصب العین کی جدوجہد میں آغاز سے انجام تک اسے دیکھ کر "اس کے نمونۂ حیات" کو اپنا سکیں۔

اگر تعلیم، کردار اور عمل کی صورت میں ڈھل کر سامنے نہ آئے تو نہ اس کا صحیح فہم ممکن ہوتا ہے اور نہ مخاطبین پر اس کے مطلوبہ اثرات مترتب ہوتے

ہیں۔ اس لیے والدین اور اساتذہ کی تعلیم سے زیادہ اولاد اور تلامذہ پر ان کی عملی سیرت و کردار کا اثر ہوتا ہے اور وہی نمونہ کردار ان کی زندگیوں میں بھی انقلاب پیدا کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ اگر "نمونۂ کمال" صرف مواعظ و تعلیمات کے ذریعے فراہم کیا جا سکتا تو شاید بنی نوعِ انسان میں انبیاء کرام مبعوث کرنے کی ضرورت نہ ہوتی۔ ہر فرد کو براہِ راست ہدایتِ ربّانی سے نواز دیا جاتا۔ ہر شخص کو بلاواسطہ شریعت کے اوامر و نواہی بتا دیئے جاتے اور اسے ان پر عمل پیرا ہونے کا حکم دے دیا جاتا۔ لیکن یہ ہدایتِ ربانی محض تعلیمات پر مشتمل ہوتی کیونکہ باری تعالیٰ خود پیکرِ محسوس سے پاک ہونے کی بنا پر "عملی نمونۂ کردار" مہیا نہ فرماتے اور "عملی نمونے" کے بغیر مقصدِ ہدایت پایۂ تکمیل کو نہ پہنچ سکتا۔ اس اصول کو ایک مثال کے ذریعے آسانی سے سمجھا جا سکتا ہے۔

قرآنِ مجید نے متعدد مقامات پر نماز ادا کرنے کا حکم صادر فرمایا ہے۔ لیکن چونکہ وہ کتاب ہے اور تعلیماتِ الٰہیہ کا مجموعہ۔ بنا بریں وہ احکامِ خداوندی کو عمل میں ڈھال کر بطور واقعہ "نمونہ" مہیا کرنے سے قاصر ہے۔ اس لیے جو لوگ حکمِ الٰہی کی اطاعت کرتے ہوئے نماز پڑھنے کے آرزو مند تھے۔ ان کا مسئلہ یہ تھا کہ "نماز پڑھی کس طرح جائے"؟ اس کے لیے انہیں "نمونۂ عمل" کی ضرورت تھی جو بغیر پیکرِ محسوس کے میسر نہ آ سکتا تھا۔ چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

صَلُّوا كَمَا رَأَيْتُمُونِي أُصَلِّي — تم نماز اس طرح پڑھو جیسے مجھے پڑھتے ہوئے دیکھو (بخاری)

اسی طرح اگر انبیائے کرام نمونۂ کمال کے طور پر بنی نوعِ انسان کی طرف مبعوث نہ کیے جاتے تو قرآن یا دیگر ماسبق کے جملہ احکام لوگوں کی عملی زندگی میں واقعہ نہ بن سکتے اور منشاء ہدایت کبھی بھی پورا نہ ہو سکتا۔ یہ انبیاء کرام کی

تھے۔ یہ وہ پیکرِ محسوس ہی تو تھے۔ جن کے ذریعے تعلیمِ ایزدی نہ صرف انسانوں تک پہنچائی جاتی تھی بلکہ منشائے الٰہی کا عملی مشاہدہ بھی انہی کے نمونۂ حیات سے میسّر آتا تھا اور لوگوں کے لیے ان کی اتباع کی صورت میں حصولِ کمال ممکن بلکہ واقع ہوجاتا تھا۔

یہی وجہ ہے کہ طالبانِ ہدایت کو اللہ تعالیٰ نے اپنے انعام یافتہ بندوں کی طرف متوجہ کر دیا کہ ان کا عمل اور سیرت و کردار نمونۂ کمال ہے۔ انکی پیروی کروگے تو منزلِ مقصود کو پالوگے۔ پھر ان انعام یافتہ بندوں کی دو خصوصیات بھی بیان کی گئیں :۔

ا۔ غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ ان پر کبھی بھی باری تعالیٰ کی ناراضگی اور غضب نہیں ہوا اور نہ وہ کبھی صراطِ مستقیم سے بھٹکے ہیں۔

ب۔ وَلَا الضَّآلِّيْنَ

● باری تعالیٰ کے ناراض نہ ہونے اور اس کے غضب سے محفوظ و مامون رہنے کا مطلب یہ ہے کہ اللہ ان سے ہمیشہ راضی رہتا ہے۔ یعنی وہ "رضائے الٰہی کے حصول" میں کامیاب و کامران ہیں۔

● اور صراطِ مستقیم سے نہ بھٹکنے کا مطلب یہ ہے کہ وہ بہرصورت اپنی منزلِ مقصود کو پاکر رہتے ہیں۔ انہیں کوئی بھی باطل طاقت صحیح راستے سے بھٹکا نہیں سکتی۔

گویا اس آیت میں حصولِ کمال کے تمام تقاضوں کی تکمیل کی ضمانت بھی مہیّا کردی گئی ہے۔ لہٰذا نمونۂ کمال کے قرآنی تصوّر کے مطابق باری تعالےٰ کے مقبول و محبوب اور مرتضیٰ و مجتبیٰ بندے حصولِ نصب العین کی جدوجہد میں پیروی کے قابل ہیں اور انہی کی شخصیات اہلِ اسلام کے لیے نمونۂ کمال

کا درجہ رکھتی ہیں۔

## نمونۂ کمال اور اسوۂ انبیاء و صالحین

اب دیکھنا یہ ہے کہ باری تعالیٰ کے وہ انعام یافتہ بندے جنہیں سورۂ فاتحہ میں "بطور نمونۂ کمال" بیان کیا گیا ہے کون ہیں؟ اس کا جواب بھی قرآن خود مہیا کرتا ہے :۔

۱۔ فَأُولَٰئِكَ مَعَ الَّذِينَ أَنْعَمَ اللَّهُ عَلَيْهِمْ مِنَ النَّبِيِّينَ وَالصِّدِّيقِينَ وَالشُّهَدَاءِ وَالصَّالِحِينَ وَحَسُنَ أُولَٰئِكَ رَفِيقًا

(النساء، ۶۹)

انہیں ان لوگوں کی معیت نصیب ہوگی جن پر اللہ تعالیٰ نے انعام فرمایا ہے یہ (انعام یافتہ بندے) انبیاء، صدیقین، شہداء اور صالحین ہیں (اور) یہ کیا ہی اچھے ساتھی ہیں۔

قرآنِ حکیم نے انعام یافتہ بندوں کے چار طبقات بیان کیے ہیں۔

**انبیاء، صدیقین، شہداء اور صالحین**، ان کے اُسوہ و عمل کو قرآن "نمونۂ کمال" قرار دیتا ہے اور انہی کی پیروی سے حصولِ نصب العین کی ضمانت میسر آتی ہے۔

۲۔ قرآنِ مجید ایک اور مقام پر حضرت ابراہیم علیہ السلام کے حوالے سے یہی مُدعا یوں بیان کرتا ہے :۔

قَدْ كَانَتْ لَكُمْ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ فِي إِبْرَاهِيمَ وَالَّذِينَ مَعَهُ

(الممتحنہ، ۴)

بیشک تمہارے لیے ابراہیمؑ اور ان کے ساتھیوں (یعنی صحابہ) میں نمونۂ کمال تھا (جس کی پیروی کا تمہیں حکم ہے)

یہاں بھی حضرت ابراہیمؑ اور ان کے علاوہ ان کے اصحاب و متوسلین کی سیرت و کردار کو "اُسوۂ حسنہ" یعنی نمونۂ کمال قرار دیا گیا ہے۔ گویا قرآن اتباع و تقلید کے لیے نمونۂ کمال کو صرف ذواتِ انبیاء تک ہی محصور قرار نہیں دیتا بلکہ جو لوگ ان کے فیضانِ نبوت سے مستفید ہو کر ان کے نمونۂ حیات پر ڈھل گئے ہیں۔ وہ بھی امتِ مسلمہ کے لیے "نمونۂ کمال" اور "اُسوۂ حسنہ" کا درجہ رکھتے ہیں۔

۳۔ اسی طرح نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے جاں نثار صحابہ کی زندگیوں کو "نمونۂ کمال" قرار دیتے ہوئے قرآنِ حکیم میں ان کی اتباع کی بھی تلقین کی گئی ہے۔ ارشاد ہوتا ہے :۔

| | |
|---|---|
| وَالسّٰبِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ مِنَ الْمُهٰجِرِيْنَ وَالْاَنْصَارِ وَالَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُمْ بِاِحْسَانٍ رَّضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ (التوبۃ، ۱۰۰) | اور سب سے پہلے سبقت لینے والے مہاجرین و انصار (صحابہ) ہیں اور جو لوگ احسان کے ساتھ ان کی پیروی اور اتباع کریں گے۔ اللہ تعالیٰ ان سے راضی ہو جائے گا اور وہ اللہ تعالیٰ سے۔ |

یہاں بھی طبقۂ انبیاء کے علاوہ ان کے صحابہ و متبعین کو بطور "نمونۂ کمال" متعارف کرایا گیا ہے اور ان کی سیرت و کردار کو لائقِ اتباع و تقلید بھی گردانا گیا ہے۔

۴۔ ایک اور مقام پر قرآنِ مجید مومنین کے راستے کو "نمونۂ کمال" قرار دیتے ہوئے ان کی پیروی کو باعثِ نجات اور ان کی خلاف ورزی کو باعثِ ہلاکت و عذاب گردانتا ہے۔ ارشادِ ایزدی ملاحظہ ہو :۔

| | |
|---|---|
| وَمَنْ يُّشَاقِقِ الرَّسُوْلَ | اور جو کوئی راہِ ہدایت کے آشکار ہو جانے |

مِنْ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُ الْهُدٰى
وَيَتَّبِعْ غَيْرَ سَبِيْلِ
الْمُؤْمِنِيْنَ نُوَلِّهٖ مَا
تَوَلّٰى وَنُصْلِهٖ جَهَنَّمَ
وَسَاءَتْ مَصِيْرًا" (نساء: ۵)

کے بعد رسول کی مخالفت کرے اور ایسی راہ کی پیروی کرے جو مومنوں کی نہیں ہے ہم اسے اس کے حال پر چھوڑ دیں گے اور اسے جہنم میں داخل کریں گے جو بہت ہی بُرا ٹھکانا ہے۔

اس آیت میں رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت کو عملاً مومنین کے راستے سے ہٹ جانے سے تعبیر کیا گیا ہے۔ یعنی مومنینِ کاملین کا راستہ اور ان کی اتباع بالواسطہ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہی کی پیروی ہے اور اس سے انحراف رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہی کی اطاعت و اتباع سے انحراف ہے گویا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا اُسوۂ مبارکہ مومنین کی سیرت و کردار سے عیاں ہوتا ہے۔ اس لیے ان کی زندگی بھی کمالِ اتباعِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے باعث "نمونۂ کمال" قرار پا جاتی ہے۔

## اُسوۂ مومنین و صالحین کو مثالی نمونۂ ہدایت قرار دینے کی وجہ

اس امر میں شک کی گنجائش نہیں کہ انبیاء علیہم السلام کے علاوہ کسی اور کا طرزِ عمل بالذّات نمونۂ ہدایت یا نمونۂ کمال قرار نہیں پا سکتا۔ کیونکہ مستقل بالذات اور غیر مشروط اطاعت و اتباع صرف انبیاء علیہم السلام ہی کی ہوتی ہے۔ باقی سب کی عارضی اور مشروط۔ لیکن کیا وجہ ہے کہ قرآن انبیاء علیہم السلام کے علاوہ ان کے صحابہ و متبعین اور مومنین و صالحین کی زندگیوں کو بھی لائقِ تقلید نمونۂ عمل قرار دیتا ہے بلکہ ہدایت و فلاح بھی ان کی پیروی پر منحصر قرار دیتا ہے؟ یہاں بھی وہی فلسفہ کارفرما ہے جو ذواتِ انبیاء کی بعثت سے متعلق تھا۔ جس طرح محض تعلیماتِ ایزدی مقصدِ ہدایت کو پورا نہ کر سکتی تھیں۔ لہٰذا اس غرض سے انبیاء علیہم السلام

کو نسلِ انسانی کی طرف مبعوث کیا گیا تاکہ وہ تعلیماتِ الٰہیہ کا نمونۂ کامل، پیکرِ محسوس کی صورت میں پیش کر سکیں۔ اسی طرح جن لوگوں کو بُعدِ زمانی یا بُعدِ مکانی کی وجہ سے براہِ راست، حضراتِ انبیاء علیہم السلام کے دیدار کا شرف نصیب نہ ہو سکا اور وہ ان کے نمونہ حیات کو بالمشافہ نہ دیکھ سکے بلکہ ان تک صرف وحیِ ربانی اور سُنّتِ انبیاء کی تعلیمات پہنچیں، ان کے لیے بھی پیکرِ محسوس کی صورت میں "نمونۂ عمل" درکار تھا۔ جب تک سلسلۂ نبوت چلتا رہا اور یکے بعد دیگرے انبیاء علیہم السلام مبعوث ہوتے رہے۔ اس وقت ممکن ہے اس امر کی ضرورت کم ہو کہ مومنین و صالحین کی سیرتوں کے ذریعے اُسوۂ انبیاء کو آگے پہنچایا جائے کیونکہ یہ کام براہِ راست انبیاءِ کرام کی بعثت سے پورا ہو رہا تھا۔ لیکن جس طرح ہم حضرت ابراہیمؑ کے حوالے سے قرآنی آیت کی بناء پر واضح کیا اس وقت بھی مومنین و صالحین کی سیرت و کردار کو سرچشمہ ہدایت قرار دیا جاتا رہا ہے کیونکہ یہ ہر دور کی انسانی ضرورت تھی۔ مگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر سلسلۂ نبوت ختم ہو جانے کے بعد جب انسانیت کو ابدالآباد تک نئی بعثت کی احتیاج سے بے نیاز کر دیا گیا تو اس دور میں قرآن و سنت کی تعلیمات کو زیادہ موثر اور متشخص صورت میں پھیلانے کے لیے یہ اور بھی زیادہ ضروری ہو گیا کہ اُمتِ محمدیہ کے کامل افراد کی سیرتوں کو کمالِ اتباعِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے باعث خود "نمونۂ کمال" قرار دے دیا جائے تاکہ تبلیغِ حق کا منصوبہ منشاءِ ایزدی کے عین مطابق بہ تمام و کمال ہمیشہ کے لیے جاری رہ سکے۔

حضراتِ انبیاء کے علاوہ دیگر "انعام یافتہ بندوں" کی راہ کو بھی "صراطِ مستقیم" قرار دینے کی یہی وجہ تھی کہ ان کی زندگیاں حیاتِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے خصائص و فضائل کی آئینہ دار ہیں۔ لہٰذا ان کی پیروی بھی ہدایت کے "نمونۂ کمال" کی پیروی

قرار پا گئی۔ ورنہ اصل "نمونہ کمال" تو انبیاء کرام ہی کی سیرت و کردار ہے، جیسا کہ قرآنِ مجید میں مذکور ہے :۔

| | |
|---|---|
| وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا لِيُطَاعَ بِاِذْنِ اللّٰهِ (النساء : ۶۴) | اور ہم نے کوئی رسول نہیں بھیجا مگر اس لیے کہ اذنِ الٰہی سے اس کی اطاعت و پیروی کی جائے۔ |

لہٰذا اہلِ ایمان کے لیے جہدِ حیات کے ہر مرحلے پر "نمونہ کمال" انبیاء کرام ہی کا اسوہ و عمل ہوتا ہے۔

## ذاتِ مصطفوی صلی اللہ علیہ وسلم

## نمونۂ کمال کا پیکرِ اتم

ہر چند کہ تمام انبیاء کرام کی سیرتیں انسانیت کے لیے اصلاً نمونۂ کمال کا درجہ رکھتی ہیں۔ لیکن اسوۂ محمدی صلی اللہ علیہ وسلم نمونۂ کمال کا ایسا پیکرِ اتم ہے۔ جو ابدالآباد تک ہر زمان و مکان میں بلا کم و کاست واجب الاتباع رہے گا۔ اس کی وجہ وہ فضیلتِ مطلقہ ہے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو بلا استثنیٰ تمام انبیاء پر عطا کی گئی۔ جیسا کہ ارشادِ ربانی ہے :۔

| | |
|---|---|
| ۱۔ تِلْكَ الرُّسُلُ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ مِنْهُمْ مَّنْ كَلَّمَ اللّٰهُ وَرَفَعَ بَعْضَهُمْ دَرَجٰتٍ ط (البقرہ، ۲۵۳) | یہ رسول ہیں۔ ہم نے ان میں سے بعض کو بعض پر فضیلت دی، انہی میں سے کوئی باری تعالیٰ سے ہمکلام ہوا اور کوئی وہ ہے جسے دوسروں پر درجوں بلند کر دیا۔ |

مدارک، جمل، خازن، بیضاوی وغیرہ میں منقول ہے کہ اگرچہ نفسِ نبوت میں سب باہم یکدگر اور برابر ہیں۔ مگر خصائص و کمالات میں انبیاء کے درجات متفاوت ہیں اور اس لحاظ سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا درجہ سب انبیاء و مرسلین پر بالاتفاق بلند و برتر ہے۔

| | |
|---|---|
| ۲۔ فَكَيْفَ إِذَا جِئْنَا مِنْ كُلِّ أُمَّةٍ بِشَهِيدٍ وَجِئْنَا بِكَ عَلَىٰ هَٰؤُلَاءِ شَهِيدًا | پس کیا حال ہوگا جب ہم ہر اُمت میں سے (اس کے نبی کو بطور) گواہ لائیں گے اور آپ کو ان سب پر (اوّل سے آخر تک) بطور گواہ و نگہبان لائیں گے۔ |
| (النساء ، ۴۱) | |

حضور علیہ السلام کی فضیلتِ مطلقہ کا یہ امر احادیثِ مبارکہ سے اور زیادہ واضح ہو جاتا ہے۔ عبداللہ بن عباسؓ روایت کرتے ہیں۔ چند صحابہ ایک مجلس میں بیٹھے سابقہ انبیاء علیہم السلام اور ان کے فضائل و کمالات کا تذکرہ کر رہے تھے۔ اتنے میں حضور علیہ السلام تشریف لے آئے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:۔

| | |
|---|---|
| ۳۔ قد سمعت کلامکم وعجبکم ان ابراهیم خلیل الله وهو کذالك وموسیٰ نجی الله وهو کذالك وعیسیٰ روحهٗ وکلمتهٗ وهو کذالك و آدم اصطفاه الله وهو | میں نے تم لوگوں کا کلام اور تعجب کرنا سُن لیا ہے۔ ابراہیمؑ اللہ کے خلیل ہیں۔ بیشک وہ ایسے ہی تھے موسیٰؑ اللہ سے سرگوشی کرنے والے ہیں۔ بیشک وہ ایسے ہی تھے عیسیٰؑ اس کی روح اور اس کا کلمہ ہیں بیشک وہ ایسے ہی تھے اور آدمؑ کو اللہ تعالےٰ |

كذلك ، الا وانا حبيب الله ولا فخر وانا حامل لواء الحمد يوم القيامة ولا فخر، وانا اوّل شافعٍ و اوّل مشفّعٍ يوم القيامة ولا فخر، وانا اوّل من يحرّك حلق الجنّة فيفتح الله لي فيدخلنيها ومعي فقراء المومنين ولا فخر، وانا اكرم الاوّلين والآخرين ولا فخر

( ترمذی )

نے منتخب کیا، بیشک وہ بھی ایسے ہی تھے۔ لیکن تم لوگ آگاہ ہو جاؤ کہ میں محبوبِ خدا ہوں اور میں فخر نہیں کرتا۔ میں قیامت کے دن حمد کا جھنڈا اٹھانے والا ہوں گا اور میں فخر نہیں کرتا۔ میں قیامت کے دن سب سے پہلا شفیع (شفاعت کرنے والا) اور سب سے پہلا مشفّع (جس کی شفاعت قبول کی جائے گی) ہونگا اور میں فخر نہیں کرتا۔ میں وہ پہلا شخص ہوں گا جو جنّت کا حلقہ ہلائے گا تو اللہ تعالےٰ اسے میرے لیے کھول دیگا۔ پھر مجھے بہشت میں داخل کرے گا اور میرے ساتھ غریب و مسکین مومنین کی جماعت ہوگی اور میں فخر نہیں کرتا۔ میں سب اوّلین و آخرین سے زیادہ محترم و مکرم (برگزیدہ) ہوں اور میں اس پر بھی فخر نہیں کرتا۔

اسی نوعیت کی ایک اور حدیث انس بن مالکؓ سے مروی ہے جس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:۔

۴۔ انا اوّل الناس خروجًا اذا بعثوا ، وانا قائدهم

قیامت کے دن سب سے پہلے میں ہی مزار سے باہر آؤنگا اور جب سب

اذا وفدوا، وانا خطیبهم اذا انصتوا وانا مستشفعهم اِذا حُبِسُوا وَ انا مبشّرهم اذا ایسوا، الکرامۃ وَالمفاتیح یومئذٍ بیدی، ولواء الحمد یومئذٍ بیدی ما من نبیٍ یومئذٍ وفی روایۃٍ آدم فمن سواہ الّا تحت لوائیٓ وانا اکرم وُلد آدم علی ربی، ویطوف علیّ الف خادمٍ کَاَنَّھُمْ بَیْضٌ مَّکْنُوْنٌ اولؤلؤٌ منثورٌ

(ترمذی، دارمی)

لوگ بارگاہ ایزدی میں اکٹھے ہو کر حاضر ہوں گے تو میں ہی ان کا پیشوا ہوں گا اور جب سب خاموش ہوں گے تو میں ہی کلام کر رہا ہوں گا اور جب سب (ہیبت و جلالت ایزدی کے سامنے) دَب چلے ہوں گے اور کوئی بھی لب کشائی نہ کر سکے گا تو میں ہی ان کی شفاعت کروں گا اور جب سب لوگ مایوس ہوں گے تو میں ہی ان کو (نجات اور بخشش کی) خوشخبری دوں گا۔ بزرگی اور جنت و رحمت کی کنجیاں اس روز میرے ہاتھ میں ہوں گی اور حمد کا جھنڈا بھی اس روز میرے ہاتھ میں ہوگا۔ (ایک روایت کے مطابق) آدم اور ان کے علاوہ تمام انبیاء میرے جھنڈے کے نیچے ہوں گے۔ میری عزت خدا کے نزدیک تمام اولادِ آدم سے زیادہ ہوگی اور ہزاروں خادم میرا طواف کرتے پھر رہے ہوں گے۔ ایسا معلوم ہوگا کہ وہ گرد و غبار سے محفوظ سفید خوبصورت انڈے ہیں یا بکھرے ہوئے چمکدار موتی۔

یوم آخرت میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اس قدر جاہ و عزت اور قدر و

منزلت کا بیان اکابر علمائے اہل حدیث میں سے جناب نواب صدیق حسن بھوپالی اپنے لفظوں میں یوں بیان کرتے ہیں :-

" پس فردا ظاہر شود کہ او را در درگاہِ خداوندی چہ قدر عزّت و جاہ بودہ است۔ روز روزِ اوست و جاہ جاہِ او ، اللّٰھم بحق جاہ محمدٍ اغفر لنا ؎

گر زفتم طریقِ سنّتِ او ہستم از عاصیانِ امّتِ تو

غرض کہ مقام مقامِ اوست و سخن سخنِ او ، او مہمانِ اوست و دیگران طفیلی اند۔ و در قرآنِ کریم خطاب شدہ ـــ وَلَسَوْفَ يُعْطِيكَ رَبُّكَ فَتَرْضٰى ـــ عَسٰٓى اَنْ يَّبْعَثَكَ رَبُّكَ مَقَامًا مَّحْمُوْدًا

پس کل یہ آشکار ہو جائے گا کہ بارگاہِ ایزدی میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو کیا عزّت وجاہ اور قدر و منزلت حاصل ہے۔ قیامت کا دن (درحقیقت) حضور علیہ السلام ہی کا دن ہو گا۔ اور اس دن عزت حضور علیہ السلام ہی کی ہو گی۔ اے اللہ ہمیں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے وسیلے سے بخش دے۔ یا رسول اللہ بیشک ہم آپ کی سنّت کی راہ پر نہیں چلتے۔ لیکن ہم آپ کی امّت کے گنہگاروں میں تو ہیں۔ الغرض روزِ قیامت صاحبِ مقام و منصب حضور علیہ السلام ہی کی ذات ہو گی اور صاحبِ کلام بھی آپ ہی ہوں گے۔ حضور علیہ السلام باری تعالیٰ کے مہمان ہوں گے اور باقی سب مخلوق حضور علیہ السلام کی طفیل ہو گی۔ قرآنِ حکیم میں ارشاد فرمایا گیا ہے :-

" (قیامت کے دن) اے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم آپ کو آپ کا رب اتنا کچھ عطا کرے گا کہ آپ راضی ہو جائیں گے " ـــ اور ایسے ہو گا کہ آپ کا رب آپ کو روزِ قیامت مقامِ محمود پر فائز کرے گا۔ جہاں آپ کی زبان سے نکلی ہوئی ہر بات پوری ہو گی " (بغیۃ الرائد فی شرح العقائد ص ۹۹)

دنیا و آخرت میں حضور علیہ السلام کا یہ امتیازی شرف و مقام اسی وجہ سے ہے کہ جو فضائل و کمالاتِ انسانیت وجودِ نبوت کی صورت میں اپنے منتہائے کمال کو پہنچے تھے۔ وہ تمام گروہِ انبیاء میں منتشر طور پر پائے گئے اور ان کے باعث وہ انسانیت کے لیے بالعموم اور اپنی اپنی اُمتوں کے لیے بالخصوص نمونۂ کمال قرار پا گئے۔ لیکن یہ تمام کمالاتِ نبوت اور فضائلِ رسالت جو ایک لاکھ چوبیس ہزار یا کم و بیش انبیاء و رسل کی ذواتِ مقدسہ میں موجود تھے۔ مجتمع ہو کر جس وجود کی صورت میں اپنے آخری نقطۂ کمال اور منزلِ عروج کو پہنچے۔ وہ وجودِ محمدی صلی اللہ علیہ وسلم تھا۔ اس لیے ذاتِ مصطفوی صلی اللہ علیہ وسلم اولین و آخرین سب کے لیے ابدالآباد تک نمونۂ کمال کا پیکرِ اتم قرار پا گئی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات میں نبوت و رسالت کے تمام درجات و مراتب اس آخری حد تک پہنچ گئے جس سے آگے کوئی اور مرتبہ باقی نہ رہا کہ جس کے لیے وہ مزید حرکت کر سکیں۔ گویا نبوت اپنے علمی و اخلاقی اور روحانی و معجزاتی کمالات کے ساتھ ایک ایسے انتہائی مقام پر آ گئی کہ انسانیت، بشریت اور نورانیت الغرض مخلوقیت کے دائرہ میں نہ علمی و اخلاقی اقدار کا کوئی درجہ باقی رہا، نہ روحانی و معجزاتی کمال کا کوئی مرتبہ کہ جس کے لیے نبوت وجودِ محمدی صلی اللہ علیہ وسلم سے گزر کر آگے بڑھے، اس درجہ کو پائے اور نمونۂ کمال کا کوئی دیگر "پیکرِ اتم" معرضِ وجود میں لا سکے۔ اس کا قدرتی نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ نبوت جب سے شروع ہوئی اور جن جن کمالات و فضائل کو لے کر کائنات میں ظہور پذیر ہوتی رہی اور آخر کار جس نقطۂ آخریں پر آ کر رکی اور ختم ہوئی۔ اس (نبوت) کے اول سے آخر تک جس قدر بھی کمالات دنیا میں وقتاً فوقتاً ظاہر ہوتے رہے اور طبقۂ انبیاء میں سے کسی کو ملتے رہے وہ سب کے سب اس منتہائے کمال

میں آکر جمع ہو گئے اور اس طرح جمع ہوئے کہ اس سے پہلے نہ کوئی ایک کمال اس رفعت و عظمت کے ساتھ اور نہ وہ تمام کمالات اس جامعیت کے ساتھ کسی میں جمع ہوئے تھے۔ اس لیے ذاتِ محمدی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بلا اتبیاز کائنات کے آغاز سے انجام تک ہر ایک کے لیے نمونۂ کمال کا پیکرِ اتم قرار پا گئی۔

اس کی وجہ یہ بھی ہے کہ جس پر عنایتِ ایزدی سب سے پہلے اور بلا واسطہ متوجہ ہوئی۔ وہ جس درجہ کا اثر اور استعدادِ کاملیت اپنے اندر پیدا کرے گا۔ یقیناً دوسرے اس درجے کو نہیں پا سکتے۔ لہٰذا وہ مخلوقِ اول جو "اَوَّلُ مَا خَلَقَ اللّٰہُ نُوْرِیْ" کی مصداق اور نورِ خدا کا نقشِ کامل ہے۔ اپنے ظاہرو باطن اور سیرت و صورت کے لحاظ سے جس قدر باکمال ہوگی۔ دوسروں سے اس حدِ کمال تک پہنچنے کی توقع ہی نہیں کی جا سکتی۔ اسی وجہ سے کسی نے کیا خوب کہا ہے ؎

حُسنِ یوسف، دمِ عیسٰے، یدِ بیضا داری
آنچہ خوباں ہمہ دارند تو تنہا داری

بنا بریں حضور علیہ السلام کی نبوت۔ نہ صرف مرجعِ اقوام و ملل بلکہ مرجعِ انبیاء و رسل قرار دی گئی ہے اور قرآنِ حکیم میں تمام انبیاء علیہم السلام کو خطاب کرتے ہوئے کہا گیا:۔

۵۔ وَاِذْ اَخَذَ اللّٰہُ مِیْثَاقَ النَّبِیّٖنَ لَمَآ اٰتَیْتُکُمْ مِّنْ کِتٰبٍ وَّحِکْمَۃٍ ثُمَّ جَآءَکُمْ رَسُوْلٌ مُّصَدِّقٌ لِّمَا مَعَکُمْ لَتُؤْمِنُنَّ بِہٖ

اور جب اللہ تعالیٰ نے انبیاء سے یہ وعدہ کیا کہ جب تمہیں کتاب و حکمت عطا کردوں پھر تمہارے پاس وہ آخر الزماں رسول تشریف لے آئیں جو تمہاری تعلیمات (اور نبوت و رسالت) کی تصدیق کردیں تو

وَلَتَنْصُرُنَّهٗ ؕ — تم ضرور بالضرور ان پر ایمان لے آنا اور ان کی مدد کرنا۔

(آلِ عمران ، ۸۱)

مذکورہ بالا گفتگو کی روشنی میں یہ امر اچھی طرح سمجھا جا سکتا ہے کہ حضور علیہ السلام کی ذاتِ اقدس اور آپ کے اُسوۂ حسنہ مبارکہ کو کیوں "دائمی نمونۂ کمال" تصور کیا جاتا ہے ۔ قرآنِ مجید نے اس حقیقت کا اظہار ان لفظوں میں کیا :۔

۶۔ لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ — بیشک تمہارے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ گرامی میں بہترین نمونۂ کمال (نمونۂ حیات) موجود ہے۔

(الاحزاب : ۲۱)

حضور علیہ السلام کے نمونۂ کمال کو "اسوۂ حسنہ" یا نمونۂ حیات قرار دینے کا مقصد یہ ہے کہ وہ قابلِ اتباع بھی ہے اور واجب الاتباع بھی ۔ اسی لیے قرآنِ مجید آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نسبت یہ حکم صادر کرتا ہے :۔

۷۔ مَاۤ اٰتٰىكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ وَمَا نَهٰىكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا — رسول علیہ السلام تمہیں جو کچھ بھی عطا کریں (جس کی اجازت دیں) وہ قبول کر لو اور جس چیز سے بھی منع کریں اس سے رُک جاؤ۔

(الحشر ، ۷)

● کیونکہ حضور علیہ السلام کا ہر حکم ، امرِ شریعت اور ہر منع ، نہیِ شریعت ہے ۔ آپ ہی کا قول و عمل اسلام اور اس کی مخالفت کفر ہے ۔ آپ ہی کی غلامی ، حق اور اس سے انحراف ، باطل ہے ۔ حضور علیہ السلام ایسے نمونۂ کمال ہیں کہ آپ کے علاوہ کائناتِ ہستی میں حق و باطل اور ایمان و کفر کے درمیان کوئی چیز بھی حدِ فاصل اور سندِ امتیاز کا درجہ نہیں رکھتی ۔ اسی لیے قرآنِ حکیم میں ارشاد ہوتا ہے :۔

۸۔ فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُوْنَ — پس ہرگز نہیں ، آپ کے رب کی قسم لوگ

| | |
|---|---|
| حَتّٰى يُحَكِّمُوْكَ فِيْمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوْا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَ يُسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا (النساء : ۶۵) | اس وقت تک صاحبِ ایمان نہیں ہو سکتے جب تک اپنے تمام نزاعی معاملات میں آپ کو حاکم (اور آخری سند) تسلیم نہ کریں۔ پھر آپ کے صادر شدہ حکم پر اپنے دلوں میں کوئی تنگی بھی محسوس نہ کریں اور (آپ کے حکم کے سامنے) سرِ تسلیم خم کرنے کا حق ادا کر دیں۔ |

قرآن مجید حضور علیہ السلام کے ابدی نمونۂ کمال ہونے کی بنا پر ایک اور مقام پر اعلان کرتا ہے :۔

| | |
|---|---|
| ۹۔ مَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ وَ مَنْ تَوَلّٰى فَمَآ اَرْسَلْنٰكَ عَلَيْهِمْ حَفِيْظًا (النساء : ۸۰) | جس شخص نے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کی (یعنی حکم مانا) بیشک اسی نے اللہ کی اطاعت کی اور جس نے اطاعتِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے روگردانی کی، پس ہم نے آپ کو انہیں (عذاب سے بھی) بچانے کا ذمہ دار نہیں بنایا۔ |

اس آیت نے صراحت کے ساتھ یہ واضح کر دیا کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت اور پیروی، اللہ تعالیٰ ہی کی اطاعت ہے اور حضور علیہ السلام کی غلامی سے انحراف عذابِ جہنم کا باعث ہے۔ جس سے بچانا حضور علیہ السلام کے فرائضِ نبوت میں شامل نہیں۔

۱۰۔ اسی تصور کو حدیثِ نبوی میں اس طرح بیان کیا گیا ہے :۔

| | |
|---|---|
| فمن اطاع محمداً فقد | جس نے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم |

اطاع اللہ ومن عصیٰ محمداً فقد عصی اللہ ومحمدٌ فرقٌ بین الناس (صحیح بخاری، ترمذی، صحیح ابن خزیمہ، دارمی، طبرانی وغیرہ)

کی اطاعت کی بیشک اسی نے خدا کی اطاعت کی اور جس نے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی نافرمانی کی۔ بیشک اس نے خدا کی نافرمانی کی اور ذاتِ محمدی صلی اللہ علیہ وسلم، لوگوں کے درمیان (یعنی حق و باطل اور اسلام و کفر کے درمیان) فرق و امتیاز پیدا کرنے والی ہے۔

اس حدیث کی شرح میں تمام علماء و محدثین متفق ہیں کہ حق و باطل، ایمان و کفر اور صالحیت و فسق کے درمیان حدِ فاصل اور خطِ امتیاز ذاتِ مصطفوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے (کما فی اللمعات والمرقاۃ وغیرہا) حضور علیہ السلام کے نمونۂ کمال ہونے کا بیان اس حدیث میں مزید دلنشین انداز میں موجود ہے۔

۱۱۔ ابنِ عمرؓ حضور علیہ السلام سے روایت کرتے ہیں :۔

قال لا یؤمن احدکم حتیٰ یکون ھواہ تبعاً لما جئت بہ (شرح السنۃ)

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ تم میں سے کوئی شخص ایماندار نہیں ہو سکتا جب تک وہ اپنی خواہشاتِ نفسانی کو اس ہدایت اور تعلیم کے تابع نہ کر دے جو میں لایا ہوں۔

۱۲۔ ایک اور مقام پر عبداللہ بن مسعودؓ روایت کرتے ہیں :۔

قال خطّ لنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ثم قال ھذا سبیل اللہ

وہ کہتے ہیں کہ حضور علیہ السلام نے ہمارے سامنے ایک خط کھینچا اور فرمایا۔ یہ اللہ کا راستہ ہے۔ پھر اس

ثم ـــــــــــ

| | |
|---|---|
| خطَّ خطوطاً عن يمينه و شماله و قال هذه سبل على كل سبيلٍ منها شيطانٌ يدعوا اليه و قرأ اِنَّ هٰذا صِرَاطِیْ مُسْتَقِيمًا فَاتَّبِعُوْهُ (مسند احمد، دارمی، نسائی) | کے دائیں بائیں کئی خطوط کھینچے اور فرمایا۔ یہ متعدد راستے ہیں۔ جن میں سے ہر ایک پر شیطان کھڑا تمہیں اپنی طرف بُلا رہا ہے۔ پھر آپ نے یہ آیت تلاوت فرمائی۔ بیشک یہ میرا راستہ ہے جو بالکل سیدھا یعنی "صراطِ مستقیم" ہے۔ پس اسی کی پیروی کرو۔ |

مذکورہ بالا شواہد کی روشنی میں یہ امر متحقق ہو گیا کہ اسوۂ محمدی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہی نمونۂ کمال کا پیکرِ اتم ہے۔ اسی کی اتباع فلاح و نجات کی بھی باعث ہے اور حصولِ نصب العین کی ضمانت کی بھی۔ کیونکہ حضور علیہ السلام نے اپنے "اسوہ و عمل" کو صراطِ مستقیم قرار دیا ہے اور صراطِ مستقیم اسی راستے کو کہتے ہیں جو مسافروں کو منزلِ مقصود اور نصب العین تک پہنچا دے۔ بایں وجہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:۔

| | |
|---|---|
| ۱۴۔ فان خیر الحدیث کتاب اللہ و خیر الھدی ھدی محمدٍ صلی اللہ علیہ وسلم (رواہ مسلم عن جابرؓ) | بیشک سب سے بہتر کلام کتاب الٰہی ہے اور سب سے بہتر ہدایت، ہدایت محمدی صلی اللہ علیہ وسلم ہے۔ |

علامہ اقبالؒ اسی راہِ ہدایت کی نسبت فرماتے ہیں:۔

تا شعارِ مصطفےٰؐ از دست رفت
قوم را رمزِ بقا از دست رفت

# حیاتِ نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا نجی پہلو اور نمونہ کمال

اب یہ دیکھنا ہے کہ حصولِ نصب العین کے طریق کار (فضل احسان) اور اس کی عملی اساس (انفاق فی المال) کا وہ نمونۂ کمال کیا ہے جس کی نشاندہی اُسوۂ محمدی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ہوتی ہے؛ اس سلسلے میں ہم نے سب سے پہلے حیاتِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے نجی پہلو کے بیان کو منتخب کیا ہے تاکہ اس ہدایت کو اخذ کرنے کا آغاز حضور علیہ السلام کی ذاتی زندگی سے کیا جا سکے۔

● حضرت خدیجۃ الکبریٰؓ عرب کی سب سے زیادہ مالدار عورت تھیں آپ کا سامانِ تجارت شام کی منڈیوں تک فروخت ہوتا تھا۔ جب وہ حضور علیہ السلام کے عقدِ مبارک میں آئیں تو انہوں نے سارا مال و دولت نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہِ اقدس میں نذر کر دیا اور آپ نے اسے مشن پر خرچ کرنے کا عزم کر لیا۔ لہٰذا یہ شادی دیگر مصلحتوں اور حکمتوں کے علاوہ اس لحاظ سے بھی نمایاں اہمیت کی حامل تھی کہ اس سے حضور علیہ السلام کی معاشی زندگی میں آسودگی کا سامان فراہم ہو گیا۔ اسی امر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے قرآن مجید میں ارشاد ہوتا ہے:۔

وَوَجَدَكَ عَائِلًا فَأَغْنَىٰ ۝ فَأَمَّا الْيَتِيمَ فَلَا تَقْهَرْ ۝ وَأَمَّا السَّائِلَ فَلَا تَنْهَرْ ۝ وَأَمَّا بِنِعْمَةِ رَبِّكَ فَحَدِّثْ ۝
(الضحیٰ: ۸-۱۱)

اور اللہ تعالےٰ نے آپ کو ضرورتمند پایا، پس غنی اور مالدار کر دیا۔ اب اگر آپ کے پاس کوئی یتیم آئے تو (اس کے مانگنے پر) ناراض نہ ہوں اور اگر کوئی سائل آئے تو اسے خالی

نہ موڑیں (یعنی جو کچھ وہ مانگے اسے عطا
کردیں) اور اپنے رب کی عطاؤں اور
نعمتوں کا خوب چرچا کریں۔

لہٰذا حضور علیہ السلام کے ظاہراً مالدار ہوجانے کا ثبوت بھی خود نصِ قرآنی سے میسر آگیا۔ لیکن ساتھ ہی ایسے طرزِ عمل کو اپنانے کی تلقین کی گئی جس کے باعث آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ طیبہ عالمِ انسانیت کے لیے نمونہ کمال قرار پاگئی ایک طرف حضور علیہ السلام کے غنی اور مالدار ہوجانے کا ذکر ہے۔ دوسری طرف اپنی دولت اور نعمتِ الٰہیہ کا فیضان ہر ضرورت مند اور طلبگار میں لٹا دینے کا حکم ہے۔ احادیث اور سیر کی کتابوں کا مطالعہ کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس اذنِ الٰہی کو اپنی عملی زندگی میں ایسا مقام دیا کہ سب کچھ مستحقین اور غرباء و سائلین میں تقسیم فرما دیا۔ یہاں تک کہ دوسروں کا فقر و فاقہ مٹانے کی خاطر اپنی ساری زندگی فقر و فاقہ میں گزار دی۔ اگر کسی کو کبھی ایک لقمے کا بھی حاجتمند پایا تو وہی لقمہ اسے دے کر خود اس کے بغیر وقت بسر فرماتے رہے۔ حضور علیہ السلام نے معاشرے کے ضرورتمند افراد کی خاطر جس طرز کی زندگی خود بسر فرمائی۔ اس کی نظیر دنیائے انسانیت میں ابدالآباد تک نہیں مل سکتی۔

۱۔ نعمان بن بشیر بیان کرتے ہیں:۔

السـتم فی طعامٍ وشرابٍ مَاشئتم لقد رأیت نبیکم وَمَا یجد من الدقَلِ مایملأ بطنہ

(ترمذی)

اے لوگو! کیا تمہیں تمہاری ضرورت کے مطابق کھانا پینا میسر نہیں ہے؟ بیشک میں نے تمہارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا ہے۔ ان کے پاس اس قدر سوکھی کھجور بھی نہ ہوتی تھی۔ جس سے

آپ کا پیٹ بھر سکتا۔

۲۔ حضرت عائشہؓ روایت کرتی ہیں:۔

ما شبع رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم من خبز الشعیر یومین متتابعین حتی قبض (بخاری، مسلم، ترمذی)

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے اپنی وفات تک کبھی متواتر دو دن جَو کی روٹی سے بھی سیر ہو کر کھانا نہیں کھایا۔

۳۔ حضرت ابوہریرہؓ ایک دن کچھ لوگوں کے پاس سے گزرے۔ ان کے پاس بکری کا گوشت پکا ہوا تھا۔ انھوں نے آپ کو کھانے کی دعوت دی لیکن آپ نے معذرت کرلی اور فرمایا:۔

خرج النبی صلی اللہ علیہ وسلم من الدنیا ولم یشبع من خبز الشعیر (بخاری)

(میں یہ گوشت کس طرح کھاؤں، میرے سامنے حضور علیہ السلام کی زندگی کا نقشہ ہے) آپ اس دنیا سے اس حال میں رخصت ہو گئے کہ جَو کی روٹی بھی پیٹ بھر کر کبھی نہ کھائی تھی۔

۴۔ حضرت ابوطلحہؓ روایت کرتے ہیں:۔

شکونا الی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم الجوع فرفعنا عن حَجَرٍ حَجَرٍ فَرَفَعَ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عن بَطنِہٖ عن حَجَرین (ترمذی)

ہم نے حضور علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہو کر (کئی دنوں کے) فاقے کا ذکر کیا اور ہم میں سے ہر ایک نے اپنے اپنے پیٹ پر سے کپڑا ہٹا کر ایک ایک پتھر بندھا ہوا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو دکھایا۔ یہ دیکھ کر حضور علیہ السلام نے

اپنے بطنِ مبارک سے کپڑا ہٹایا تو اس
پر (فاقے کا اثر زائل کرنے کے لیے)
دو پتھر بندھے ہوتے تھے۔

اور اگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمتِ اقدس میں کوئی چیز پیش کی جاتی تو اسے بچا کر رکھنا مناسب نہ سمجھتے۔

۵۔ حضرت انس روایت کرتے ہیں :۔

کان النبی صلی اللہ علیہ وسلم لا یدخر شیئاً لغد — نبی اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کوئی چیز بھی صبح کے لیے بچا کر نہ رکھتے تھے۔

آپ غور فرمائیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ذاتی سرمایہ و دولت جو مکی زندگی میں بذریعہ تجارت حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے خود کمایا تھا۔ جو خدیجۃ الکبریٰؓ کے اموالِ تجارت کی صورت میں آپ کو ملا تھا۔ جو مدنی زندگی میں اموالِ غنیمت اور اموالِ فے کے حصص کے طور پہ آپ کو ملتا رہتا تھا اور جو مدنی زندگی میں ہی کبھی کبھار خود محدود پیمانے پر کاروبار اور تجارت کے ذریعے وصول ہوتا تھا سب کا سب کہاں گیا۔ اگر حضور علیہ السلام کی حیاتِ طیبہ کے شب و روز کا بنظرِ غائر جائزہ لیا جائے تو یہ حقیقت کھل کر سامنے آجاتی ہے کہ آپ نے اپنی ساری دولت معاشرے کے مستحق افراد کے معاشی تعطل کو ختم کرنے اور ان کی تخلیقی جدوجہد کو بحال کرنے پر خرچ کر دی تھی۔ یہ "عملِ احسان و انفاق" اس درجہ کمال پر آپ کی ساری زندگی میں اس طرح جاری رہا کہ خود فقر و فاقہ کی حالت کو اپنا لیا اور دوسروں کو اس سے بچانے کا سامان فراہم کر دیا۔

## حیاتِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کا عائلی پہلو اور نمونۂ کمال

اگر کوئی شخص اپنی ذاتی زندگی ایثار و قربانی کے اس منتہائے کمال تک تو

پہنچا دے لیکن وہ اپنے اہل وعیال کی تربیت اس ڈھب پر نہ کر سکا ہو کہ وہ اس راستے کے مصائب و آلام کو خندہ پیشانی کے ساتھ قبول کر سکیں تو اندریں صورت اس شخص کی عائلی زندگی اس کے مشن میں تقویت کا باعث ہونے کے بجائے قدم قدم پر اس کے لیے مشکلات کا باعث بنتی ہے۔ اس لیے ضروری ہے کہ راہِ حق میں قدم رکھنے سے پہلے اپنے اہل وعیال کو بھی پیکرِ ایثار واحسان بنا لیا جائے ان کی سیرت و کردار کو بھی اسی رنگ میں رنگ لیا جائے۔ جس سے اس کی اپنی زندگی آراستہ ہے اور ان کے فکر و نظر کے پیمانے بھی وہی مقرر کر دیئے جائیں جو خود اسے نصیب ہو چکے ہیں۔ اس طرح اس کے راستے کی نہ صرف بہت سی رکاوٹیں از خود دُور ہو جائیں گی بلکہ اس کی جدوجہد کو ہر گھڑی تازگی اور تقویت میسر آتی رہے گی۔ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ اقدس اور ان کی نجی زندگی جس قدر بلند و برتر نمونۂ کمال کی حامل تھی آپ کی عائلی زندگی بھی اسی عظمت و رفعت کی آئینہ دار تھی۔ آپ کی ازواجِ مطہرات اور اولادِ اطہار نے ایثار و انفاق کی روش کو اپنی حقیقی زندگی کے طور پر اس طرح قبول کر لیا تھا کہ ان کے شب و روز کا عالم بھی حضور علیہ السلام ہی کی طرح فقر و فاقہ کا مظہر بن گیا تھا۔

۱۔ حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضؓ کے سامنے ایک مرتبہ گوشت اور روٹی پر مشتمل کھانا رکھا گیا تو وہ رو پڑے اور فرمانے لگے:۔

| | |
|---|---|
| خرج النبی صلی اللہ علیہ وسلم من الدنیا ولم یشبع ھو و اھل بیتہ من خبز الشعیر (صحیح بخاری) | حضور علیہ السلام دنیا سے اس حال میں رخصت ہوئے کہ آپ اور آپ کے اہلِ عیال نے کبھی بھی جو کی روکھی روٹی سے سیر ہو کر کھانا نہ کھایا تھا۔ |

۲۔ حضرت عائشہ رضؓ کی اس روایت سے مذکورہ بالا حقیقت کی تائید ہوتی ہے:۔

| | |
|---|---|
| ما شبع آل محمد صلی اللہ علیہ وسلم من خبز الشعیر یومین متتابعین حتی قبض رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم (متفق علیہ) | آل نبی صلے اللہ علیہ وسلم نے حضور علیہ السلام کی وفات تک جو کی روٹی سے بھی مسلسل دو دن سیر ہو کر کھانا نہیں کھایا۔ |

۳۔ حضرت عائشہ رضہ سے ہی روایت ہے:۔

| | |
|---|---|
| کان یاتی علی آل محمد صلی اللہ علیہ وسلم الشھر لم یرای فی بیت من بیوتہ الدخان (ترمذی) | اہلبیت نبی صلے اللہ علیہ وسلم پر بسا اوقات ایک ایک مہینہ گزر جاتا مگر حضور علیہ السلام کے گھروں میں سے کسی ایک گھر میں بھی دھواں اٹھتا دکھائی نہ دیتا تھا۔ |

۴۔ اسی حالت کا تذکرہ ایک اور حدیث میں اس طرح ملتا ہے۔

| | |
|---|---|
| انا کنا آل محمد صلی اللہ علیہ وسلم نمکث شھراً ما نستوقد بنار ان ھو الا التمر والماء (شمائل الترمذی) | ہم اہلبیت نبوی صلے اللہ علیہ وسلم ہیں اور ہمارے شب و روز کا یہ عالم ہے کہ ہم پر پورا پورا مہینہ گزر جاتا تھا۔ مگر ہمارے گھر کے چولہے میں آگ نہیں سلگتی تھی۔ ہمارے کھانے کے لیے سوائے کھجور اور پانی کے اور کوئی غذا نہ ہوتی۔ |

۵۔ امام یوسف بن اسماعیل نبہانی نقل فرماتے ہیں کہ عائشہ صدیقہ رضہ نے جب عروہ سے ارشاد فرمایا۔ اے بھتیجے! خدا کی قسم ہم ایک چاند دیکھتے ہیں۔ پھر وہ مہینہ ختم ہو جاتا ہے۔ دوسرا چاند دیکھتے ہیں وہ بھی ختم ہو جاتا ہے۔ پھر

تیسرے مہینے کا چاند دیکھتے ہیں مگر حضور علیہ السلام کی ازواج کے گھروں میں چولہا نہیں جلتا۔ تو عروہ نے عرض کیا۔ خالہ جان! پھر آپ لوگوں کا گزر کیسے ہوتا ہے؟ اس پر حضرت عائشہ صدیقہؓ نے فرمایا۔ کھجور اور پانی سے۔ ہمارے دو انصاری ہمسایہ ہیں جو صاحبِ وسعت ہیں۔ وہ کبھی کبھی دودھ وغیرہ بھیج دیتے ہیں تو ہم حضور علیہ السلام کی خدمتِ اقدس میں پیش کر دیتے ہیں۔

۶۔ امام ترمذیؒ حضرت انسؓ سے روایت کرتے ہیں کہ حضور علیہ السلام اپنے گھر میں کبھی بھی کوئی چیز صبح کے لیے بچا کر نہ رکھتے تھے۔ حضور علیہ السلام جب رات کا کھانا تناول فرما لیتے تو صبح کے لیے کچھ نہ ہوتا اور اگر صبح کا کھانا تناول فرما لیتے تو رات کے لیے کچھ نہ ہوتا۔ کان النبی لا یدخر شیئاً لغد (ترمذی)

۷۔ ابوہریرہؓ روایت کرتے ہیں:۔

ما شبع رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم واھلہ ثلاثا تباعاً من خبز البر حتی فارق الدنیا (جامع ترمذی)

حضور علیہ السلام اور آپ کی ازواج نے تا دمِ وفات کبھی بھی تین وقت کا کھانا پے در پے نہیں کھایا۔

۸۔ عبداللہ بن عباسؓ روایت کرتے ہیں:۔

کان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یبیت اللیالی المتتابعۃ طاویاً واھلہ لا یجدون عشاءً وکان اکثر خبزھم خبز الشعیر۔ (ترمذی)

نبی اکرم صلے اللہ علیہ وسلم اور آپ کے اہل وعیال کئی کئی راتیں اور دن مسلسل بغیر کھائے اس طرح گزار دیتے کہ ان کے پاس رات کا کھانا بھی نہ ہوتا، ویسے ان کا کھانا اکثر جو کی روٹی ہوتا تھا

۹۔ حضرت عائشہؓ مسروق سے بیان فرماتی ہیں :۔

اُذکر الحال التی فارق علیہا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم واللہ ما شبع من خبزٍ ولحمٍ مرتین فی یومٍ (جامع ترمذی)

مجھے حضور علیہ السلام کی وہ حالتِ زندگی یاد آرہی ہے جس میں آپ صلے اللہ علیہ وسلم اس دنیا سے رخصت ہوئے۔ خدا کی قسم آپ نے عمر بھر کبھی بھی ایک دن میں گوشت اور روٹی پر مشتمل کھانا دو مرتبہ نہ کھایا تھا۔

۱۰۔ حضرت ابنِ عباسؓ سے مروی ہے کہ ایک روز نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم [illegible] صنعا پہاڑ پر کھڑے تھے۔ حضور علیہ السلام نے ارشاد فرمایا۔ قسم اس ذات کی جس نے تمہیں حق دے کر بھیجا۔ آلِ محمد صلے اللہ علیہ وسلم کے گھر میں شام اسی حالت میں آتی ہے کہ ان کے پاس ایک چٹکی آٹا بھی نہیں ہوتا۔ آپ کا یہ کلام اس سے بھی زیادہ صاف سنائی دیا۔ جیسے آسمان سے کسی دھماکے کی آواز سُنی جاتی ہے۔ اسی طرح حضرت امام حسنؓ فرماتے ہیں کہ آلِ محمد صلے اللہ علیہ وسلم کے گھر میں ایک صاع کھانے نے بھی کبھی شام نہیں گزاری

۱۱۔ حضرت انسؓ روایت کرتے ہیں :۔

قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لقد اُخِفتُ فی اللہ وما یخاف احدٌ ولقد اُوذِیتُ فی اللہ وَمَا یؤذٰی احدٌ ولقد اتت علیّ ثلثون مِن بینِ لیلۃٍ وَیومٍ وَمَالی وَلِبلالٍ

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا قسم ہے اللہ کے راستے میں جتنا میں ڈرایا گیا ہوں۔ آتنا کسی کو بھی نہیں ڈرایا گیا اور قسم ہے اللہ کے راستے میں جتنا مجھے دُکھ دیا گیا ہے آتنا کسی کو نہیں دیا گیا اور قسم ہے مجھ پر تیس تیس دن رات ایسے

طعاماً یاکلہٗ ذو کبدٍ الّا شئی یواریہ ابطُ بلالٍ

(شمائلِ ترمذی)

گزر جاتے تھے کہ میرے اور بلال کے لیے اتنا کھانا بھی نہ ہوتا تھا جو کسی بھی جاندار کے کھانے کے لیے ہو۔ بجز اس کے جو کچھ بلال کی بغل میں کبھی کبھی چھُپا ہوتا۔

## فقرِ محمّدی صلے اللہ علیہ وسلم اضطراری نہیں، اختیاری تھا

مذکورہ بالا احادیث و اقوالِ صحابہ سے اس امر کا بخوبی علم ہو گیا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم کی تنگی اور عائلی زندگی کا عالم کیا تھا۔ حضور علیہ السلام کی فقر و فاقہ پر مبنی اس زندگی کا نقشہ دیکھ کر کوئی شخص یہ گمان نہ کرے کہ یہ حالت اضطراری تھی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم مجبور و بے بس تھے۔ آپ کو اپنے اور اپنے اہل و عیال کے لیے کھانے کو کچھ میسر ہی نہ آتا تھا۔ لہٰذا کچھ نہ پاتے ہوئے زندگی اس فقر سے عبارت ہو گئی تھی۔ نہیں نہیں، یہ تصور شانِ رسالتِ مآب صلی اللہ علیہ وسلم سے ناآشنائی کی بنا پر پیدا ہو سکتا ہے۔ اگر اضطراری حالت میں بامرِ مجبوری فاقہ آئے اور زندگی اس حال میں بسر ہو تو یہ کوئی ایسا کمال نہیں جو انسانیت کے لیے ابدالآباد تک نمونہ قرار پاسکے۔ انسان کچھ نہ پاتے ہوئے خاموشی سے وقت گزار لے تو یہ "مقامِ صبر" ہے۔ جو اپنی جگہ ایک فضیلت ہے لیکن سرورِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم تو مقامِ صبر کے بجائے "مقامِ شکر" کی بھی ان بلندیوں پہ فائز تھے جہاں مردِ حق کے لیے "صبر" ایک ادنیٰ درجہ رہ جاتا ہے۔

کچھ نہ ہوتے ہوئے فاقہ کرنا اتنی عظمت کی بات نہیں جتنی کہ سب کچھ ہوتے ہوئے فاقہ کرنا ہے۔ جیسا کہ کمزوری و ناتوانی کے سبب کسی زیادتی کرنے والے کو معاف کر دینا اتنی بڑی فضیلت نہیں جتنی کہ طاقت ور اور مضبوط استعداد کا مالک ہوتے

ہوئے کسی کو معاف کرنا ہے۔ لہٰذا فقرِ اضطراری میں وہ کمال مضمر نہیں جو فقرِ اختیاری میں ہے۔ حضور علیہ السلام کی وہ عظمت جو ہمیشہ کے لیے عالمِ انسانیت کے سامنے "نمونۂ کمال" کے طور پر موجود رہے گی یہ ہے کہ آپؐ نے سب کچھ ہوتے ہوئے اپنے اور اپنے گھر کے لیے فقر و فاقہ کو منتخب فرما لیا۔ باری تعالیٰ نے آپؐ کو دنیا و آخرت کی تمام نعمتوں کا تقسیم کرنے والا بنایا تھا۔ آپ کو دُنیوی خزانوں کی وسعت سے بھی بہرہ ور فرمایا تھا۔ جیسا کہ حضور علیہ السلام کے اپنے ارشاد سے ثابت ہے جو حضرت ابوہریرہؓ سے مروی ہے :-

| | |
|---|---|
| ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال بعثت بجوامع الکلم و نصرت بالرّعب و بینا انا نائمٌ رأیتنی اُتیت بمفاتیح خزائن الارض فوضعت فی یدی (متفق علیہ) | بے شک رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں تمام کلاموں کی جامعیت کے ساتھ مبعوث کیا گیا ہوں، میری مدد رُعب اور دبدبہ وجلال سے کی گئی ہے اور میں نے حالتِ خواب میں دیکھا کہ میرے پاس زمین کے تمام خزانوں کی چابیاں لائی گئی اور میرے ہاتھ میں دے دی گئیں۔ |

اس امر میں کوئی شک نہیں کہ انبیاء علیہم السلام کے خواب وحی الٰہی اور زندہ حقیقت ہوتے ہیں۔ اس لیے آپ کو دنیا کے تمام خزانوں اور نعمتوں کے ملکیت و تقسیم کا شرف فی الحقیقت عطا کیا گیا تھا نہ کہ محض بشارت۔ یہی وجہ تھی کہ آپ کو بالتخصیص یہ حکم بھی دیا گیا :-

| | |
|---|---|
| وَ اَمَّا السَّآئِلَ فَلَا تَنْهَرْ (الضحٰی: ۱۰) | : اور جو کوئی سائل آپ کی خدمت میں آئے اسے خالی نہ موڑیئے (یعنی جو کچھ |

بھی مانگے اسے عطا کیجیے)

بس اسی قرآنی حکم کی تعمیل میں آپ صلے اللہ علیہ وسلم نے دنیوی مال و دولت کے تمام ذرائع اور وسائط خلقِ خدا کی بہتری اور فلاح وبہبود پر خرچ کر دیئے اور خود ساری زندگی اپنے لیے حالتِ فقر کو منتخب کیے رکھا۔ جو کچھ بھی مختلف وسائل سے آپ کو میسر آتا بجائے اپنے اُوپر خرچ کرنے کے معاشرے کے دیگر افراد پر خرچ فرمادیتے۔ "اِنَّمَا اَنَا قَاسِمٌ وَاللّٰہُ یُعْطِی" کے مصداق سب کچھ سائلین و محرومین میں تقسیم فرمادیتے اور خود شکر و تفویض کے اس مقام پر فائز تھے کہ فقر و فاقہ میں لُطف محسوس کرتے، ظاہراً اور باطناً کسی لحاظ سے بھی آپ مجبور، بے بس اور تنگدست نہ رہے تھے۔ کیونکہ آپ کی غنا و دولت مندی پر نصِ قرآنی شاہدِ عادل ہے :-

وَوَجَدَكَ عَائِلًا فَأَغْنَىٰ (الضحیٰ ۸) اور اس نے آپ کو (ابتداء میں) ضرورتمند پایا، پس اس نے آپ کو غنی اور مالدار کر دیا۔

قرآن جس کی غنا اور دولت مندی کی شہادت دے۔ اس ہستی کے گھر میں تین تین ماہ تک آگ کا نہ جلنا "نمونۂ کمال کا نقطۂ آخریں" نہیں تو اور کیا ہے؟ اس حقیقت کی عملی تائید حضور علیہ السلام کے اس معاشرتی طرزِ عمل سے ہوتی ہے۔ جس کا تذکرہ احادیث میں کثرت کے ساتھ ملتا ہے۔

## حیاتِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کا معاشرتی پہلو اور نمونۂ کمال

معاشرتی زندگی میں حضور علیہ السلام کا طرزِ عمل نفع بخشی، فیض رسانی اور ایثار و انفاق کا اس قدر نمونۂ کامل تھا کہ آپ نے معاشرے سے فقر و فاقہ اور معاشی تعطل رفع کرنے کے لیے اپنی ساری کی ساری دولت لُٹا دی تھی۔ اس حقیقت کا اندازہ

حضور علیہ السلام کے اس ارشادِ گرامی سے ہوتا ہے۔ جسے حضرت ابوہریرہؓ نے روایت کیا :۔

| | |
|---|---|
| ۱۔ قال صلی اللہ علیہ وسلم لو کان لی مثل اُحدٍ ذھبًا لسرّنی ان لا یمرّ علیّ ثلاث لیالٍ وعندی منہ شیٔ الّا شیٔ اُرصدُہٗ لِدَینی (صحیح بخاری) | آپؐ نے فرمایا اگر میرے پاس اُحد کے پہاڑ کے برابر سونا ہو تو مجھے اس بات میں دلی مسرت ہوگی کہ تین راتیں گزرنے سے پہلے اس میں سے کچھ نہ بچے سوائے اس کے کہ جس سے میں قرض ادا کر سکوں |

یہ تھا حضور علیہ السلام کا وہ اُصولِ زندگی جس نے آپؐ کے طرزِ عمل کو ابدالآباد تک "نمونۂ کمال" بنا دیا۔

قرآنِ حکیم نے اہلِ ایمان کو دوسروں کے لیے ایثار و انفاق پر آمادہ کرنے کی خاطر یہ حکم دیا تھا :۔

| | |
|---|---|
| یَسْئَلُوْنَکَ مَاذَا یُنْفِقُوْنَ۔ قُلِ الْعَفْوَ (البقرۃ ، ۲۱۹) | آپ سے پوچھتے ہیں کیا خرچ کریں فرما دیجیے۔ جو کچھ تمہاری ضرورتوں سے زائد ہے دوسروں کے لیے خرچ کردو۔ |

نبی اکرم صلے اللہ علیہ وسلم نے اس حکمِ الٰہی کی جو تفصیل صورت صحابہ سے بیان فرمائی وہ درج ذیل ہے۔ ابوسعید خدری رض روایت کرتے ہیں کہ ایک مرتبہ سفر کے دوران حضور علیہ السلام نے صحابہ کو حکم دیا :۔

| | |
|---|---|
| "من کان عندہٗ فضل ظھرٍ فلیعد بہٖ علیٰ من لا ظھر لہٗ و من کان عندہٗ فضل زادٍ | تم میں سے جس کے پاس ضرورت سے زائد کپڑا ہو وہ اس شخص کو لوٹا دے جسے اس کی ضرورت ہے اور جس کے پاس ضرورت سے زائد کھانا ہو وہ اس شخص کو لوٹا دے جسے |

فليعد به على من لا زاد له " حتى ظننا انه لاحق لاحدٍ منا في الفضل (ابوداؤد)

اس کی ضرورت ہے۔ حضرت ابوسعید خدریؓ فرماتے ہیں) حتیٰ کہ ہم نے یہ سمجھا کہ زائد از ضرورت کسی چیز میں بھی ہمارا کوئی حق نہیں ہے۔

## فَلْیَعُدْ بِہٖ کے حکم کا فلسفہ

اس ارشادِ نبوی صلے اللہ علیہ وسلم نے ایک ایسے نمونۂ عمل کی بنیاد فراہم کردی۔ جس کے ذریعے صحیح اسلامی معاشرت کی نہ صرف تشکیل بلکہ تکمیل کی ضمانت میسّر آسکتی ہے۔ صاف ظاہر ہے کہ یہ حکم ایسی حالت میں دیا گیا تھا جب معاشی تفریق طبقاتی تفاوت کا باعث ہوسکتی تھی۔ کچھ لوگ ایسے تھے جن کے پاس ضرورت سے زائد بچ رہتا تھا اور کچھ لوگ ایسے تھے جو ان بنیادی ضرورتوں سے محروم تھے۔ یہ امتیازِ معیشت اگر اسلام کے لیے قابلِ قبول ہوتا اور اس کے باقی رہتے ہوئے اسلامی اقدار کا پنپنا ممکن ہوتا تو آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم ایسا وجوبی اور صریح حکم کبھی بھی صادر نہ فرماتے۔ پھر جنابِ رسالت مآب صلے اللہ علیہ وسلم کے مبارک الفاظ قابلِ غور ہیں۔ حضور علیہ السلام نے فرمایا :۔

فليعد به على من لا ظهر له — فليعد به على من لا زاد له (ابوداؤد)

ضرورت سے زائد کپڑا اس شخص کو لوٹادو جس کے پاس ضرورت کے مطابق نہیں ہے — اور ضرورت سے زائد کھانا اس شخص کو لوٹادو جس کے پاس ضرورت کے مطابق نہیں ہے۔

یہاں دونوں مرتبہ حضور علیہ السلام نے " لوٹا دینے " کا حکم صادر فرمایا ہے۔ یہ نہیں کہا کہ " ضرورت مند کو دے دو "۔ اگر الفاظ پر غور کیا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ " لوٹایا تو اسی چیز کو جاتا ہے جو پہلے آئی بھی اسی سمت سے ہو "۔ اگر کوئی چیز

اس سمت سے آئی ہو تو "پھیر دینے" کا لفظ استعمال کرتے ہیں "لوٹانے" کا نہیں ۔ حضور علیہ السلام کا یہ لفظ منتخب فرمانا خالی از حکمت نہ تھا ۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم دراصل صحابہ کرام کو یہ باور کرانا چاہتے تھے کہ معاشرے میں معاشی تفاوت کا عالم یہ ہو کہ بعض کے پاس ضرورتوں سے بہت زیادہ ہو اور بعض کو ضرورتیں بھی میسر نہ ہوں تو اہل ثروت کو یہ جان لینا چاہیئے کہ جو کچھ ان کے پاس ان کی ضرورتوں سے زائد ہے وہ یقیناً کسی نہ کسی کا حق چھین کر آیا ہے ۔ خواہ حق تلفی کا یہ عمل بالواسطہ ہو یا بلاواسطہ، لیکن اتنی بات اٹل ہے کہ وہ کسی ضرورتمند کا حق تھا جو کسی نہ کسی صورت میں اہل دولت کے پاس ان کی ضرورتوں سے زائد بچا پڑا ہے ۔ اگر ہر شخص کو اس کا حق مل جاتا تو کسی کے پاس اس قدر زائد نہ بچتا ۔ اسی لیے حکم فرمایا گیا ۔ "فلیعد بہ" ۔ یہ لوٹا دو اس شخص کو جس کا حق ہے اور جو کہ تمہارے پاس آن پہنچا ہے ۔"

قرآن مجید اس تصور کو یوں واضح کرتا ہے :-

وَفِيْٓ اَمْوَالِهِمْ حَقٌّ مَّعْلُوْمٌ لِّلسَّآئِلِ وَالْمَحْرُوْمِ
(المعارج ۲۴)

اور ان دولت مندوں کے اموال میں سائلین و محرومین کا حق بھی شامل ہے ۔

اس حقیقت کو نظر انداز نہیں کیا جانا چاہیئے کہ کسی کا حق ہوتا ہی اسی لیے ہے کہ اسے ادا کیا جائے ۔ اگر وہ ادا نہ ہو تو صریح ظلم ہوگا اور جس دولت میں ظلم اور حق تلفی کی آمیزش ہوگی وہ جائز نہیں ہو سکتی ۔ اس لیے قرآن مجید نے گردشِ دولت کا ایسا منصفانہ نظام قائم کرنے کی تلقین کی ہے، جس میں کسی قسم کے ظلم و استحصال اور حق تلفی کی گنجائش نہیں ہو سکتی ۔

ارشاد ہوتا ہے :-

| | |
|---|---|
| كَيْ لَا يَكُوْنَ دُوْلَةً بَيْنَ الْاَغْنِيَآءِ مِنْكُمْ (الحشر: ۷) | یہ مال و دولت تم میں سے صرف امراء کے ہاتھوں میں ہی گردش نہ کرتی رہے۔ |

چنانچہ صحابہ کرام رضؓ نے حضور علیہ السلام کے اس ارشاد کا کیا خوب مطلب سمجھا "کہ جب تک معاشی تفاوت کی یہ صورتِ حال قائم رہے گی۔ زائد از ضرورت ایک دانے میں بھی ہمارا کوئی حق نہیں ہوگا"۔

۳۔ ایک اور مقام پر آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا :۔

| | |
|---|---|
| یا ابن آدم انک ان تبذل الفضل خیرٌ لک وان تمسکہٗ شرٌ لک ولا تلام علیٰ کفافٍ وابدأ بمن تعول (رواہ ابو امامۃ، صحیح مسلم، جامع ترمذی) | اے بنی آدم اگر تو اپنی ضرورت سے بچا ہوا مستحقین پر خرچ کردے تو یہ تیرے لیے بہتر ہے اور اگر تو اسے بچا کر رکھے تو یہ تیرے لیے نقصان دہ ہے۔ اپنی ضرورت کے لیے بچا رکھنے پر کوئی ملامت نہیں اور تو انفاق و احسان ان لوگوں سے شروع کر جن کی ذمہ داری تجھ پر عائد ہوتی ہے۔ |

۴۔ حضرت عثمان رضؓ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں۔ آپؐ نے فرمایا :۔

| | |
|---|---|
| لیس لابن آدم حقٌ فی سوی ھذہ الخصال بیت یسکنہٗ و ثوب یواری عورتہٗ وجلف الخبز | بنی آدم کے لیے سوائے تین چیزوں کے اور کوئی حق نہیں، ایک گھر جس میں رہ سکے اور کپڑا جس سے اس کا ستر چھپ جائے اور ایک وقت کا |

والماء (جامع ترمذی) کھانا اور پانی۔

اس حدیث کے ذریعے حضور علیہ السلام نے معاشی تفاوت اور ناہمواری کی حالت میں کم ازکم ضروریاتِ زندگی بیان فرمادی ہیں۔ جس کا مدعا یہ ہے کہ اگر کسی شخص کو یہ تینوں چیزیں حاصل ہوں اور اسی معاشرے کے بعض دیگر افراد ان سے بھی محروم ہوں تو کسی کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ ان سے زائد اپنے پاس رکھے، زائد رکھنے کا حق تب ملے گا۔ جب یہ تینوں چیزیں ہر ایک کو جائز اور باعزت طریقے سے میسر آجائیں، ورنہ دینِ مصطفوی صلے اللہ علیہ وسلم معاشرے میں ایسا تفاوت گوارا نہیں کرسکتا کہ کچھ لوگ ان ضرورتوں سے محروم ہوں اور اگر ان کو حاصل کریں تو ناجائز ذرائع سے، بے ضمیری اور بے عزتی کے طریق پر، اپنی دیانت، شرافت اور عصمت فروخت کرکے، یعنی کچھ تو اپنی مسلمانی اور دینداری کے عوض زندگی خریدیں اور کچھ لوگ نہ صرف ضروریات سے زائد بلکہ تحسینات اور تعیشاتِ حیات سے بھی زائد کے مالک ہوں۔ یہ تفریق اسلامی معاشرے کا شیوہ نہیں بلکہ اسوۂ مصطفوی صلے اللہ علیہ وسلم کے خلاف کھلی بغاوت اور تعلیماتِ اسلام کے خلاف زبردست چیلنج ہے۔

۵۔ جو نمونۂ کمال تاجدارِ کائنات صلے اللہ علیہ وسلم نے عالمِ انسانیت کے سامنے پیش فرمایا۔ اس کا معیار یہ تھا کہ "اگر کوئی شخص صبح اس حال میں کرے کہ اس کے پیٹ میں ضرورت کی غذا ہو اور وہ اس کے ہوتے ہوئے دن کا کھانا سنبھال کر رکھے تو وہ یہ سمجھے کہ اس نے دنیا جمع کررکھی ہے۔" حدیث کے الفاظ یہ ہیں۔

فکانما حیزت له الدنیا (جامع ترمذی)

۶۔ حضرت ابن عباس رضہ سے مروی ہے کہ حضور علیہ السلام نے فرمایا:۔

لیس المؤمن الذی یشبع وہ شخص ایمان دار نہیں ہوسکتا جو رات

وجارہٗ جائع (بخاری) | کو پیٹ بھر کر سو جانے دے آنحالیکہ اس کا پڑوسی بھوکا ہو۔

۷۔ حضور علیہ السلام کے پیش کردہ نمونۂ کمال کی عملی جھلک حضرت ابوہریرہؓ سے مروی اس حدیث سے ملتی ہے اور اس بات کا بھی اندازہ ہوتا ہے کہ آپ کی زندگی فقر و فاقہ میں کیوں بسر ہوتی تھی۔ وہ فرماتے ہیں:۔

فلما فتح الله علیه الفتوح قام فقال انا اولیٰ بالمومنین من انفسهم فمن توفی من المؤمنین فترك دينا فعلی قضاؤه و من ترك مالا فهو لورثته (متفق علیہ)

جب فتوحات کے ذریعے حضور علیہ السلام کے وسائل کشادہ ہو گئے تو آپ نے کھڑے ہو کر فرمایا کہ میں مومنوں کی جانوں سے بھی زیادہ قریب ہوں پس اہلِ ایمان میں سے جو شخص بھی قرض چھوڑ کر مرے گا تو وہ میں ادا کروں گا اور اگر مال چھوڑ کر مرے گا تو اس کے مالک اس کے ورثا ہونگے۔

جوں جوں حضور علیہ السلام کے ذرائع و وسائل میں وسعت پیدا ہوتی گئی۔ آپؐ کی نفع بخشی اور احسان و انفاق کی روش میں اور اضافہ ہوتا گیا۔ یہاں تک کہ آپ نے کفالتِ عامہ کا ذمہ اُٹھالیا۔ جو شخص ہر ایک کا بوجھ اٹھانے لگے اسے اپنے لیے سوائے فقر و فاقہ کے اور کچھ بھی پسند نہیں آسکتا۔ گویا اس ارشاد کے ذریعے حضور علیہ السلام اس امر کا اعلان فرما رہے تھے کہ "لوگ اپنے سکھ آپس میں بانٹیں مگر ان کے دکھوں کی ذمہ داری میں اُٹھاؤں گا۔"

۸۔ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کا یہ طرزِ عمل اس واقعہ سے مزید واضح ہو جائیگا جس کو امام ترمذیؒ نے روایت کیا ہے:۔

اُتِیَ الیه تسعون الف درهم | حضور علیہ السلام کی خدمتِ اقدس میں

| | |
|---|---|
| فوضعت علی حصیر فما ردّ سائلاً حتی فرغ منہا، فجاءہ رجل فسألہ فقال لیس عندی شیٔ ولکن ابتع علیّ فاذا جاءنا شیٔ قضینا۔ (ترمذی) | نوّے ہزار (۹۰۰۰۰) درہم کا ہدیہ پیش کیا گیا۔ جنہیں چٹائی پر رکھ دیا گیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی سائل کو خالی نہ موڑا۔ یہاں تک کہ ساری رقم ختم ہو گئی اس کے بعد ایک شخص نے اپنی ضرورت بیان کی۔ حضورؐ نے فرمایا۔ اب میرے پاس پیسے باقی نہیں بچے لیکن تو میرے نام پر جو بھی چاہے اُدھار خرید لے۔ جب ہمارے پاس پیسے آئیں گے۔ ہم ادا کر دیں گے۔ |

حضور علیہ السلام کا یہ عمل کس قدر واضح اور فیصلہ کن ہے۔ جو ہستی ضرورتمندوں کی حاجات اُدھار کے ذریعے پورا کرتی ہے وہ مال و دولت میں سے ایک پائی تک اپنے پاس رکھنے کی روادار کب ہو سکتی ہے۔ حضور علیہ السلام کے جود و سخا کا یہی عالم دیکھ کر حضرت جابرؓ روایت کرتے ہیں :۔

| | |
|---|---|
| مَا سُئِلَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ شَیْئاً قَطُّ فَقَالَ لَا (متفق علیہ) | آپؐ سے جب بھی کوئی چیز مانگی گئی۔ حضور علیہ السلام کی زبانِ اقدس پر کبھی بھی "نہیں" کا لفظ نہ آیا۔ |

۹۔ حضرت عائشہؓ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ایثار و احسان کا معمول بیان کرتے ہوئے یہاں تک روایت کیا ہے کہ "ایک مرتبہ چھ یا سات دینار ہمارے گھر میں بچ گئے۔ جب کہ باقی سب کچھ راہِ خدا میں انفاق کر دیا گیا تھا۔ یہ واقعہ حضور علیہ السلام کے ایامِ مرض الموت کا ہے۔ آپؐ ساری رات بے چین رہے۔ کروٹیں بدل بدل کر رات گزار دی۔ صبح میں نے بے چینی کا سبب پوچھا تو حضورؐ نے فرمایا۔ وہ دینار ابھی

گھر میں ہی ہیں۔ کسی ضرورت مند کو کیوں نہیں دیئے گئے۔

فقال ما ظنّ نبی اللہ لو لقی اللہ عزّ وجلّ وھذہٖ عندہٗ (مسند امام احمد)

اگر ان دیناروں کے گھر میں ہوتے ہوئے خدا کا نبی خدا سے جا ملتا تو اس کا کیا حال ہوتا۔

اسی تصور نے حضور علیہ السلام کو رات بھر پریشان رکھا اور نیند تک نہ آنے دی۔ گویا اسوۂ مصطفویؐ یہ تھا کہ ۶، ۷ دینار بھی گھر میں چھوڑ کر وصالِ الہٰی کے تصور سے پریشان تھے اور حجاب محسوس فرما رہے تھے۔

۱۰۔ اصحابِ سیر و حدیث بیان کرتے ہیں کہ ایک مرتبہ حضور علیہ السلام کی خدمت میں سونے کی ڈلی بطور نذرانہ پیش کی گئی۔ آپؐ نے حضرت بلالؓ کو حکم دے کر اسے ضرورت مندوں میں تقسیم فرما دیا۔ اتنے میں رات ڈھل گئی۔ مزید کوئی حاجتمند نہ آیا اور ڈلی کا کچھ ٹکڑا گھر میں باقی رہ گیا۔ آپؐ نے حضرت بلالؓ سے فرمایا کہ ہمارے گھر اطلاع کر دو۔ جب تک سونے کا ٹکڑا گھر میں پڑا ہے اور راہِ خدا میں خرچ نہیں ہو جاتا میں رات مسجد میں ہی بسر کر دوں گا گھر نہیں لوٹوں گا۔

معاشرتی زندگی میں حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ وہ طرزِ عمل تھا جسے بطور "نمونۂ کمال" دنیائے انسانیت کے سامنے پیش کیا گیا۔ گویا حصولِ نصب العین کی جد و جہد جس کا طریقہ کار اور عملی اساس "احسان اور انفاق" کا عمل ہے۔ اس کا نمونۂ کمال ذاتِ مصطفوی صلے اللہ علیہ وسلم کے ذریعے اس طرح پیش کر دیا گیا ہے اگر آج بھی ہمیں رضائے الٰہی کے نصب العین کے حصول کی سچی طلب ہے تو اس کا دار و مدار اس نمونۂ کمال کی پیروی پر ہے۔ ہمیں چاہیئے کہ ہم اپنے گریبانوں میں جھانکیں، اپنے شب و روز کا جائزہ لیں اور اس امر کا فیصلہ خود کریں کہ ہمیں دولت و آسائش زیادہ عزیز ہے یا خدا کی رضا و محبّت — فاعتبروا یا اُولی الابصار

باب ہفتم

# انسانی جدوجہد کا معیارِ عمل

# حصولِ نصب العین کی جدوجہد کا معیارِ عمل

اس امر کے طے پا جانے کے بعد کہ حصولِ نصب العین کی جدوجہد کا نمونۂ کمال اُسوۂ محمدی صلے اللہ علیہ وسلم ہے۔ شاید کسی کے ذہن میں یہ سوال پیدا ہو کہ جو مذکورۂ بالا نمونۂ حیات امام المرسلین خاتم الانبیاء صلے اللہ علیہ وسلم کے اُسوہ و سُنّت سے ثابت ہے۔ اس کے مطابق ایک عام آدمی کیونکر زندگی بسر کر سکتا ہے؟ اس لیے عملی ایثار و احسان کی وہ حدِ کمال جو اُسوۂ نبوی صلے اللہ علیہ وسلم نے مہیا کی ہے ایک آئیڈیل ( IDEAL ) کے طور پر تو سامنے رکھی جا سکتی ہے اسے زندگی میں بالفعل اپنایا نہیں جا سکتا۔ یہ مغالطہ وساوسِ شیطانی میں سے ایک وسوسہ ہے جو اس لیے ذہنوں میں پیدا ہوتا ہے کہ اس خیال سے انسان اپنی عملی زندگی کو حیاتِ نبوی صلے اللہ علیہ وسلم کے نمونہ کے مطابق ڈھال نہ سکے اور یہ تصور کہ ہم گنہگار لوگ اس حدِ کمال کو کس طرح چھو سکتے ہیں؟ دراصل مزعومہ مفادات اور مادی منافع کے بچاؤ کی ایک تدبیر ہے۔

اگر ہم سنّتِ نبوی صلے اللہ علیہ وسلم کے ہر پہلو اور اُسوۂ محمدی صلے اللہ علیہ وسلم کے ہر عمل کی نسبت یہی رائے قائم کرنا شروع کر دیں تو حقیقت یہ ہے کہ حضور علیہ السلام کی ذات کسی کے لیے بھی واجب الاتباع اور لائقِ تقلید قرار نہیں پا سکتی اندریں صورت بعثتِ نبویؐ کے مقصد اور غرض و غایت کی بت بھی بے سُود

آرزو کے سوا کچھ باقی نہیں رہتی۔ جب انبیاء علیہم السلام کو دنیا میں مبعوث ہی اس لیے کیا جاتا ہے کہ وہ ہدایتِ ایزدی کے مطابق انسانیت کے لیے قابلِ عمل نمونۂ حیات مہیا کریں تو یہ کیسے ممکن ہے کہ ان کا مہیا کردہ "عملی نمونۂ کمال" انسانوں کے لیے کما حقہٗ پیروی کے قابل نہ ہو۔

- انبیاء علیہم السلام کو خود نسلِ انسانی میں سے مبعوث کرنے کا مقصد او رنشاء الٰہی بھی یہی تھا کہ لوگ بعد ازاں ان کی سنّت پر عمل پیرا نہ ہو سکنے کا بہانہ تراش سکیں۔ قرآنِ حکیم میں بعثتِ نبوی صلے اللہ علیہ وسلم کی نسبت مذکور ہے :۔

لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ بَعَثَ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ

(آلِ عمران : ۱۶۴)

بے شک اللہ تعالیٰ نے اہلِ ایمان پر بڑا احسان فرمایا کہ ان کے اندر خود انہی میں سے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کو مبعوث کیا جو انہیں اس کی آیات پڑھ کر سناتا ہے اور ان کے قلب و باطن کا تزکیہ کرتا ہے اور انہیں کتاب و حکمت کی تعلیم دیتا ہے۔

گویا دیگر انعامات کے علاوہ نبی اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کا نسلِ انسانی میں سے مبعوث ہونا بذاتِ خود اہلِ ایمان پر بہت بڑا احسان ہے۔ کیونکہ اس طرح حضورؐ کا اُسوۂ مبارک انسانی و شخصی صورت میں ہونے کی وجہ سے تمام عالمِ انسانیت کے لیے قابلِ عمل لعد لائقِ تقلید نمونہ قرار پایا۔ اگر نمونۂ حیاتِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم غیر انسانی صورت میں یعنی ما فوق البشر حالت میں عطا کیا جاتا تو اس کی نسبت ناممکن العمل ہونے کا اعتراض بھی ہوتا۔ جب ذاتِ حق نے اس نُورِ کامل کو دنیائے آب و گِل میں مجسّم بشری صورت میں بھیجا ہے اور آپؐ نے ترلیسٹھ (۶۳) برس کی زندگی بھی بھرپور بشری

زندگی بسر کی ہے اور اس کی جملہ شرائط اور تقاضے بھی تمام و کمال پورے کیے ہیں۔ جن پر احادیث و سیر کی ہزاروں کتب شاہد عادل ہیں۔ تراب کسی کا ایسا اعتراض سوائے شیطانی بہکاوے اور نفسانی تمرد کے اور کیا معنی رکھتا ہے؟ حضور علیہ السلام کی سیرت کا "نمونۂ کمال" اگر قابلِ عمل نہ ہوتا تو قرآن اسے اہلِ ایمان اور عالمِ انسانیت کے لیے "اسوۂ حسنہ" قرار نہ دیتا۔

## حیاتِ صحابہؓ — اتباعِ "نمونۂ کمال" کی عملی دلیل

نبی اکرم صلے اللہ علیہ وسلم نے نہ صرف اپنے "اسوہ و عمل" کو انسانیت کے لیے بطور نمونۂ کمال پیش فرمایا۔ بلکہ اپنے فیضانِ رسالت سے صحابہ کرام کی ایک ایسی جماعت بھی تشکیل فرمائی۔ جن کی زندگیاں اسوۂ نبویؐ کی عملی اتباع و تقلید کی آئینہ دار تھیں۔ یہ صحابہ ابتداءً عرب معاشرے کے عام افراد ہی تھے۔ جن میں سے اکثر کفر و شرک کے علاوہ دیگر معاشرتی خرابیوں میں بھی ملوث تھے۔ لیکن انقلابِ محمدی صلے اللہ علیہ وسلم کے نتیجے میں ان کی زندگیاں حضور کے پیش کردہ نمونۂ کمال کے مطابق اس طرح ڈھلیں کہ وہ بھی اسوۂ رسول صلے اللہ علیہ وسلم کی عملی شہادت قرار پاگئیں۔

ان صحابہ کی زندگیوں کا بدل جانا اس بات کی بیّن دلیل تھی کہ جو "نمونۂ عمل" پیغمبرِ انقلاب صلے اللہ علیہ وسلم اپنے اسوہ کے ذریعے پیش فرما رہے تھے وہ انسانی فطرت کے منافی یا انسانی طبع کے لیے ناقابلِ قبول نہ تھا۔ بلکہ وہ دورِ جاہلیت کے ان پروردہ افراد کے لیے بھی ممکن العمل تھا جو اسے اپنا کر انسانی شرف و کمال اور عظمت و سطوت کے علمبردار بن گئے۔ اسی لیے ان کا اسوۂ حیات باقی لوگوں کے لیے "معیارِ عمل" قرار پا گیا۔ قرآنِ مجید ان کی سابقہ حالت کا ذکر کرتے ہوئے یوں گویا ہوتا ہے:۔

| | |
|---|---|
| وَاذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ | اور اپنے اوپر اللہ تعالیٰ کے اس احسان |
| اِذْ كُنْتُمْ اَعْدَآءً فَاَلَّفَ | کو یاد کرو کہ تم ایک دوسرے کے (جانی) |

بَيْنَ قُلُوْبِكُمْ فَاَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهٖٓ اِخْوَانًا ۚ وَكُنْتُمْ عَلٰى شَفَا حُفْرَةٍ مِّنَ النَّارِ فَاَنْقَذَكُمْ مِّنْهَا

(آلِ عمران : ۱۰۳)

دشمن تھے۔ پس اس نے تمہارے دلوں میں باہمی اُلفت پیدا کردی اور تم اس کی نعمت کے باعث بھائی بھائی بن گئے تم (اپنی سابقہ حالت میں) آگ کے گڑھے کے کنارے کھڑے تھے۔ چنانچہ اللہ نے تم کو اس سے بچا لیا۔

صحابہ کرام کی زندگیوں میں یہ انقلاب کس طرح پیدا ہوا؟ اس کی وجہ بھی وہ "نمونۂ کمال" ہی تھا جو اسوۂ نبویؐ کی صورت میں ان کے سامنے موجود تھا۔ جس نے ان کے قلب و باطن کو گرما دیا۔ ان کے فکر و عمل کے پیمانوں کو بدل دیا، ان کی وفاداریوں کا رخ بدل دیا، ان کے نزدیک حیاتِ انسانی کے نفع و نقصان کا تصور بدل دیا۔ اچھائی اور برائی، دوستی و دشمنی اور شرافت و رذالت کے معیار تک بدل دیئے۔ الغرض ان کی پوری زندگی نجی مسائل سے لے کر عالمی سیاست تک ایک ہمہ گیر انقلاب سے آشنا ہوگئی۔ اس کا اشارہ قرآنِ مجید میں اس طرح ملتا ہے :-

مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ ۭ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗٓ اَشِدَّاۗءُ عَلَي الْكُفَّارِ رُحَمَاۗءُ بَيْنَهُمْ تَرٰهُمْ رُكَّعًا سُجَّدًا يَّبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانًا ۡ سِيْمَاهُمْ فِيْ وُجُوْهِهِمْ مِّنْ اَثَرِ السُّجُوْدِ ۭ ذٰلِكَ مَثَلُهُمْ فِي التَّوْرٰىةِ ۚ وَمَثَلُهُمْ

محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے رسول ہیں اور جو لوگ ان کی معیت سے فیضیاب ہوئے ہیں۔ وہ کفار پر سخت ہیں اور آپس میں نہایت رحیم و شفیق، آپ انہیں (ہمہ وقت) رکوع کرتے، سجدوں میں گرتے (اور) اللہ تعالٰے کا فضل و رضا چاہتے ہوئے دیکھیں گے۔ ان کی پہچان ان کے چہروں میں سجدوں کے

فِی الْاِنْجِیْلِ کَزَرْعٍ اَخْرَجَ شَطْئَهٗ فَاٰزَرَهٗ فَاسْتَغْلَظَ فَاسْتَوٰی عَلٰی سُوْقِهٖ یُعْجِبُ الزُّرَّاعَ لِیَغِیْظَ بِهِمُ الْکُفَّارَ ؕ وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ مِنْهُمْ مَّغْفِرَةً وَّ اَجْرًا عَظِیْمًا

(الفتح : ۲۹)

نشان سے عیاں ہے۔ ان کی یہ صفت تورات اور انجیل میں اس طرح مذکور ہے جیسے ایک کھیتی کہ جس نے اپنا خوشہ نکالا پھر اسے طاقتور کیا، پھر وہ دبیز ہوئی، پھر اپنی ساق پر سیدھی کھڑی ہو گئی (جب وہ بلند اور مضبوط ہو کر اس حال تک پہنچتی ہے تو ان کسانوں کو (جنھوں نے اسے محنت کر کے لگایا اور اس حال تک پہنچایا ہو) بہت بھلی لگتی ہے (یہی حال حضورؐ کے صحابہؓ کا ہے جو آپ کے فیضانِ صحبت اور انوارِ نبوت کے اثر سے تربیت پا کر پروان چڑھے ہیں اور کردار کی بلندی و مضبوطی کے لحاظ سے اس مقام تک پہنچے ہیں کہ حضورؐ ان کی صورت میں اپنی محنت کا ثمر دیکھ کر اس طرح مسرور ہوتے ہیں) کہ ان سے کفار کے دل جلتے ہیں۔ ان میں جو اچھے اعمال والے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ان سے مغفرت اور اجرِ عظیم کا وعدہ کیا ہے

اس آیت میں صراحت کے ساتھ بیان کر دیا گیا ہے کہ صحابہ کرام کا اسوہ و سیرت جس کے چند پہلو قرآن نے یہاں گنوائے بھی ہیں۔ براہِ راست فیضانِ رسالت کا پرتو ہے۔ لہٰذا نبی اکرم صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے اسوۂ مبارکہ کے اثر سے جس کی حیثیت "نمونۂ کمال" کی ہے۔ انسانوں میں "عمل کا جو معیار" پیدا ہو سکتا تھا۔ وہ صحابہ کرام کی سیرت و کردار کی صورت میں پیدا ہو چکا۔ اسی لیے ان کے احوال و اطوار اور شعارِ حیات کو دیکھ کر حضور علیہ السلام اس طرح مسرور ہوتے ہیں اور فخر محسوس کرتے ہیں جیسے پکی ہوئی کھیتی کی صورت میں کسان اپنی محنت کا نتیجہ دیکھ کر خوش ہوتا ہے۔ صحابہ کی زندگیاں کھیتی کی مانند تھیں۔ جن میں رسولِ اکرم صلے اللہ

علیہ وسلم نے نئی سیرت و کردار کا بیج بویا، پھر کسانوں کی طرح اس کھیتی کی آبیاری کی۔ اور اس کی فصل کو جوان کر دیا۔ اب ان صحابہ کے اُسوہ و سیرت کی پکی ہوئی فصل آخر حضور علیہ السلام کے لیے باعثِ فخر و مسرت کیوں نہ ہو؟ یہ اس نمونۂ کمال کی تاثیر کا عالم ہے کہ حضورؐ اپنے مہیا کردہ نمونۂ کمال کے اثر سے انسانی عمل کی صورت میں جو ثمرہ و نتیجہ دیکھنا چاہتے تھے وہ باری تعالیٰ نے انھیں "اُسوۂ صحابہ" کے رُوپ میں دکھا دیا۔ بنا بریں اُسوۂ صحابہ کو "حصولِ نصب العین کی جدوجہد کا معیارِ عمل قرار دیا گیا۔ چنانچہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے نہ صرف اپنی بلکہ ان کی سیرت و سُنّت اور راہِ عمل کی پیروی کو بھی واجب قرار دیا۔ جیسا کہ متعدد احادیث سے ثابت ہے۔

## اُسوۂ صحابہ — حصولِ کمال کا معیارِ عمل

## (قرآن کی روشنی میں)

گذشتہ صفحات پر ہم نے حصولِ نصب العین کے طریق کار اور اس کی عملی اساس کا ذکر کرتے ہوئے "فعلِ احسان" اور "انفاق فی المال" پر تفصیلی روشنی ڈالی ہے اس کے بعد ہم اس موضوع کے تحت اُسوۂ محمدی صلے اللہ علیہ وسلم کے حوالے سے "نمونۂ کمال" کو بھی واضح کر چکے ہیں۔ اب یہ دیکھنا ہے کہ اُسوۂ صحابہؓ کا وہ کونسا پہلو ہے جو نصب العین کی جدوجہد میں "معیارِ عمل" کا درجہ رکھتا ہے اور جس کی پیروی سے انسان مطلوبہ کمال کو پا سکتا ہے تاکہ یہ واضح ہو سکے کہ وہ نمونۂ حیات پیغمبرانہ زندگی کے علاوہ بھی کسی اور میں ممکن ہے یا نہیں۔

● قرآن مجید نے سورۂ الفتح کی آیت ۲۹ میں اسوۂ صحابہؓ کے جن نمایاں پہلوؤں کو بیان کیا ہے وہ درج ذیل ہیں :۔

۱۔ **معیتِ نبوی صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم** (نبی اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کی ظاہری

باطنی معیت و مصاحبت سے اکتسابِ فیض)

۲ شدت علی الکفار (دشمنانِ اسلام کے خلاف غیض وغضب)

۳- تراحم بین المومنین (باہمی محبت ومودّت اور ایثار واحسان)

۴- کثرتِ رکوع وسجود (شب بیداری اور عبادت گزاری)

۵- ابتغاءِ رضوانِ الٰہی (ہر عملِ زندگی کا محرک رضائے الٰہی کا حصول)

"معیتِ نبوی" وہ سرچشمۂ فیضان ہے جس سے اُسوۂ صحابہؓ کی تشکیل ہوئی۔ "شدّت علی الکفار" درحقیقت صحابہ کے باہمی احسان ومودّت کے نتیجے میں اس عزم کا اظہار ہے کہ جو کوئی اسلام یا کسی مسلمان سے عداوت ومخاصمت رکھے گا۔ یہ جماعتِ صحابہ اس کے خلاف غیض وغضب بن جائے گی۔ یہ خاصیت "البغض فی اللہ" کی ہے جو "الحب فی اللہ" کے بغیر وجود میں نہیں آسکتی۔ اگر اللہ کے نام پر مسلمانوں سے محبت ودلسوزی نہ ہو تو کافروں سے دشمنی اور عداوت کا کوئی جواز باقی نہیں رہتا۔ اس لیے شدّت علی الکفار دراصل "تراحم بین المومنین کا نتیجہ ہے۔ اسی طرح رکوع و سجود" یعنی عبادت گزاری رضائے الٰہی کی تلاش وجستجو، بارگاہِ ایزدی میں نیازمندانہ تعلق کا اظہار اور حقِ بندگی کی ادائیگی ہے اور جیسے کہ پہلے بڑی وضاحت کے ساتھ بیان کیا جاچکا ہے کہ خلقِ خدا سے ہمدردی، بہی خواہی، دلسوزی اور نفع بخشی کا طرزِ عمل نہ ہو تو ذاتِ حق کو نہ عبادات قبول ہیں نہ اس کی رضا نصیب ہوتی ہے۔

اس لیے صحابہ کرام کے جملہ خصائصِ حیات کا خلاصہ اور نچوڑ ان کا وہ طرزِ عمل ہے جو" باہمی تراحم وتعاطف اور ایثار واحسان سے عبارت ہے۔ جسے قرآن "رُحَمَآءُ بَیْنَھُمْ" کے الفاظ سے تعبیر کر رہا ہے اور یہی "حصولِ کمال کا معیارِ عمل" ہے۔

● قرآنِ مجید میں اس اُسوۂ صحابہ کا ذکر اس انداز میں کیا گیا ہے :۔

وَالَّذِیْنَ تَبَوَّءُو الدَّارَ وَالْاِیْمَانَ        اور جنھوں نے ہجرتِ مدینہ سے پہلے ہی

مِنْ قَبْلِهِمْ يُحِبُّوْنَ مَنْ هَاجَرَ اِلَيْهِمْ وَلَا يَجِدُوْنَ فِيْ صُدُوْرِهِمْ حَاجَةً مِّمَّآ اُوْتُوْا وَ يُؤْثِرُوْنَ عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ ۗ وَ مَنْ يُّوْقَ شُحَّ نَفْسِهٖ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ
(الحشر، ۹)

اس شہر (مدینہ) اور ایمان کو اپنا گھر بنا لیا اور ان لوگوں کو محبوب رکھتے ہیں جو ہجرت کرکے ان کی طرف گئے (اور انہوں نے ان کی کفالت کا ذمہ اُٹھایا) اور جو اموالِ غنیمت (بعد میں) ان کو دیئے گئے۔ ان کی اپنے دلوں میں کوئی طلب اور حاجت نہیں رکھتے بلکہ اپنے دوسرے مسلمان بھائیوں کو اپنی جانوں پر ترجیح دیتے ہوئے ان کے حق میں ایثار کرتے ہیں درآنحالیکہ وہ خود بھی معاشی تنگی میں ہوں، پس جو اپنے نفس کے حرص و لالچ سے بچا لیے گئے۔ (یعنی پیکرِ ایثار و احسان بن گئے) وہی کامیاب و کامران ہوں گے۔

اس آیتِ کریمہ نے اسوۂ صحابہؓ کے اس نمایاں پہلو کی واضح نشاندہی کر دی ہے جس کے باعث ان کا عمل عالمِ انسانیت کے لیے بالعموم اور اہلِ اسلام کے لیے بالخصوص "معیاری عمل" قرار پایا اور جس نے انہیں جہدِ حیات میں کامیابی و کامرانی کی ضمانت عطا کی۔ آیتِ متذکرہ سے اسوۂ صحابہ کے درج ذیل خصائص منظرِ عام پر آتے ہیں:۔

۱۔ صحابہ کرام نے "ایمان" کو اپنا ٹھکانا اور مستقر سمجھ رکھا تھا۔

۲۔ دینِ حق کی خاطر قربانی دینے والوں (یعنی مہاجرین) کی کفالت انہیں ہر شے سے زیادہ عزیز تھی۔

۳۔ ان کے دلوں میں مالی منافع، مادی مفادات اور سرمایہ و دولت کی کوئی طلب اور آرزو نہ تھی بلکہ طلبِ دنیا سے ان کے دل بے نیاز تھے۔

۴۔ وہ تنگدستی کی حالت میں بھی دوسروں کے لیے ایثار و احسان کے پیکر تھے۔
۵۔ ان کی کامیابی اور کامرانی کا راز یہ تھا کہ وہ دوسروں کو اپنی جان و مال پر ترجیح دیتے تھے اور کسی حال میں بھی ان کے دل و دماغ میں کوئی بخل یا حرص و لالچ نہ آتا تھا۔

اس "معیارِ عمل" کا صلہ قرآن نے " فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ " (پس وہی کامیاب و کامران ہوں گے) کے اعلان کی صورت میں بیان کیا۔ جب انسان دوسروں کے لیے سراپا ایثار بن جاتا ہے تو اس کے راستے کی رکاوٹوں اور مشکلات کا دُور کرنا باری تعالےٰ اپنے ذمہ لے لیتا ہے۔ یہی مفہوم اس حدیث مبارکہ سے بھی مستفاد ہے:۔

مَنْ كَانَ لِلّٰهِ كَانَ اللّٰهُ لَهٗ ( الحدیث )

جو کوئی اللہ کے لیے وقف ہو گیا، اللہ اس کے لیے ہو گیا۔

مذکورہ بالا خصائص انصارِ مدینہ کے بیان کیے گئے ہیں۔ جن کا عملی مظاہرہ انھوں نے حکم رسالتِ مآب صلے اللہ علیہ وسلم پر "مواخاتِ مدینہ" کی صورت میں کیا۔ (اس کی تفصیل بعد میں آئے گی) مختصر یہ کہ انصار صحابہ نے دینِ حق کی خاطر ہجرت کر کے آنے والے صحابہ کو اپنی تجارتوں، زراعتوں اور جائدادوں میں اس طرح شریک کر لیا کہ ملکیتیں تک انہی کو سونپ دیں اور جب مہاجرین نے زراعت میں اپنی ناتجربہ کاری کی بنا پر شریک ہونے سے معذرت کی تو انصار نے کہا: "کوئی بات نہیں محنت ہم کریں گے اور منافع دونوں میں برابر تقسیم کرتے جائیں گے۔" یہ ایثار و احسان کا وہ طرزِ عمل تھا جس نے انہیں حصولِ نصب العین میں کامیابی سے سرفراز کر دیا۔

- اُسوۂ صحابہ کا خمیر جن تعلیماتِ الٰہیہ سے تیار ہوا تھا۔ ان کی رُوح یہ قرآنی حکم تھا جو ان کے رگ و ریشے میں سرایت کر چکا تھا۔

كَيْ لَا يَكُوْنَ دُوْلَةً بَيْنَ الْاَغْنِيَآءِ (جو مال و دولت تمہیں بصورتِ غنیمت

مِنْكُمْ ط وَمَآ اٰتٰىكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ ۗ وَمَا نَهٰىكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا ۚ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ط اِنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ۘ لِلْفُقَرَآءِ الْمُهٰجِرِيْنَ الَّذِيْنَ اُخْرِجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ وَاَمْوَالِهِمْ يَبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانًا وَّيَنْصُرُوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ ط اُولٰٓئِكَ هُمُ الصّٰدِقُوْنَ

(الحشر، ۸)

یا دیگر ذرائع سے میسّر آیا ہے۔ اسے اس طرح تقسیم کرو) کہ وہ صرف تمہارے مال داروں کے درمیان ہی گردش نہ کرتا رہے اور جو کچھ تمہیں رسولؐ عطا فرمائیں وہ لے لو اور جس سے منع فرمائیں باز رہو اور اللہ سے ڈرو، بیشک اللہ کا عذاب سخت ہے۔ (وہ مال و دولت زیادہ تر) ان ضرورتمند مہاجرین کے لیے ہے جو دینِ حق کی خاطر اپنے گھروں اور جائیدادوں سے محروم کر دیئے گئے جن کے پیشِ نظر محض اللہ کا فضل اور اس کی رضا کا حصول ہے اور وہ (اپنے تمام تر وسائل اور استعدادوں کے ذریعے) اللہ اور اس کے رسول (کے دین) کی مدد کرتے رہتے ہیں۔ (پس) یہی لوگ حقیقت میں اہلِ صدق ہیں۔

اس آیت میں مہاجر صحابہ کے اسوۂ حیات کا بیان ہے اور انصار کے لیے طرزِ عمل کی تعلیم، یا یوں سمجھئے کہ مجاہدینِ دینِ حق کے خصائص کا تذکرہ ہے اور اہلِ ثروت مسلمانوں کے لیے حکمِ ایثار۔ مذکورہ بالا آیات صراحت کے ساتھ بار بار اسوۂ صحابہؓ کے جس "معیاری عمل" کی نشاندہی کر رہی ہیں۔ وہ یہی ہے کہ وہ جاں نثارانِ دینِ متین ہر حال میں اپنی ضرورتوں، حاجتوں اور منفعتوں پر دینِ حق کی ضرورتوں کو ترجیح دیتے تھے اور اس کی عملی صورت یہ تھی کہ وہ اپنے سرمایہ و دولت میں اپنے دیگر بھائیوں اور بالخصوص مخلصینِ اسلام کو برابر کا شریک کرتے تھے اور گردشِ دولت کے ایسے نظام کو

جاری رکھتے تھے۔ جس سے دولت کسی ایک جگہ سمٹنے نہ پائے اور کچھ لوگ اس سے محروم نہ ہونے پائیں۔ کیونکہ اسلام کا فلسفہ یہ تھا کہ لوگ احکامِ الٰہی کی اطاعت میں نماز اور روزے کی پابندی بھی کریں گے۔ لیکن جس مقام پر آکر ان کے قدم ڈگمگائیں گے وہ "مالی ایثار و احسان" کا مقام ہوگا۔ جہاں انسان یہ سمجھتا ہے کہ "دولت کمائی تو میں نے ہے۔ اسے دوسروں پر خرچ کس لیے کروں، آخر اس میں دوسروں کا کیا حق ہے؟" یہی سوچ اسے بخل اور حرص و لالچ میں مبتلا کر دے گی۔ جس سے اس کی عبادات اور زہد و ورع کے تمام معاملات غارت جائیں گے، کیونکہ جو عبادات انسان کے نفس کو "مال کی محبت اور دنیا کی حرص" سے پاک نہیں کر سکتی، وہ خدا کے ہاں مقبول نہیں۔ لہٰذا نبی اکرم صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے ایثار و احسان کا وہ نمونۂ کمال اپنے غلاموں کے سامنے پیش کیا کہ اپنی ساری دولت دوسروں کے لیے لٹا کر اپنے اُوپر فقر و فاقہ مسلط فرما لیا اور کہا " الفقر فخری " (یہ فقر جو دوسروں کا فقر مٹانے کے لیے طاری ہو، میرے لیے باعثِ فخر ہے)

قرآنِ مجید اس معیارِ عمل کا ذکر ایک اور مقام پر یوں کرتا ہے:۔

| | |
|---|---|
| ● يُوْفُوْنَ بِالنَّذْرِ وَيَخَافُوْنَ يَوْمًا كَانَ شَرُّهٗ مُسْتَطِيْرًا ۝ وَيُطْعِمُوْنَ الطَّعَامَ عَلٰى حُبِّهٖ مِسْكِيْنًا وَّيَتِيْمًا وَّ اَسِيْرًا ۝ اِنَّمَا نُطْعِمُكُمْ لِوَجْهِ اللّٰهِ لَا نُرِيْدُ مِنْكُمْ جَزَآءً وَّلَا شُكُوْرًا ۝ اِنَّا نَخَافُ مِنْ رَّبِّنَا يَوْمًا عَبُوْسًا | وہ (صحابہ) اپنی منتیں پوری کرتے ہیں اور اس دن سے ڈرتے ہیں۔ جس کی شدت اور سختی بہت پھیلی ہوئی ہے اور اس کی محبت میں مسکین، یتیم اور اسیر کو کھانا کھلاتے ہیں، پھر ان سے کہتے ہیں۔ ہم تمہیں محض رضائے الٰہی کے لیے کھانا دے رہے ہیں۔ تم سے کوئی بدلہ یا شکر گزاری نہیں چاہتے بلکہ ہمیں تو |

قَمْطَرِيْرًا (الدہر: ۱۰) اپنے رب سے اس دن کا ڈر ہے جو بہت ترش اور نہایت سخت ہے) یعنی ایسا عمل تم پر کوئی احسان نہیں بلکہ اپنی آخرت کے سنوارنے کے لیے ضروری تقاضا ہے۔ ہم جس کی تکمیل میں معروف ہیں

ان آیات کا شانِ نزول یہ ہے کہ ایک مرتبہ حسنین کریمین بیمار ہو گئے تو حضرت علیؓ، حضرت فاطمہؓ اور ان کی کنیز فضہ نے ان کی صحت کے لیے تین روزوں کی نذر مانی۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں شفا عطا فرمائی۔ اب ان کی وفا کا وقت آیا۔ تینوں نے روزے رکھے۔ حضرت علیؓ تین صاع جو لے آئے اور حضرت سیدۂ عالمؓ نے ایک ایک صاع جو تینوں دن پکایا، لیکن جب افطار کا وقت آیا اور روٹیاں سامنے رکھی گئیں تو ایک روز مسکین، دوسرے دن یتیم اور تیسرے روز اسیر آ گیا۔ ان حضرات نے تینوں دن سب روٹیاں ان سائلوں کو دے دیں اور سب نے ہر روز اپنا روزہ پانی سے افطار کر کے اگلا روزہ رکھ لیا، روزے کی حالت میں تین دن کا فاقہ۔ یہ ایسا مثالی نمونۂ ایثار و احسان تھا کہ قدرت نے اسے "معیاری عمل" کے طور پر قرآن میں قلمبند کر دیا۔

اہلبیتِ نبویؐ کے اس عمل میں مزید لطف کا پہلو یہ تھا کہ وہ اس ایثار پر کسی قسم کی شکر گزاری کے خواہشمند بھی نہ تھے بلکہ اسے اپنی آخرت سنوارنے کے لیے ضروری تقاضا قرار دیتے تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ جو انفاق و احسان اس جذبے سے کیا جائے وہی "معیاری" بھی ہے اور "مقبول" بھی، جس میں دوسرے کو احسان مند بنانا مقصود ہو وہ سراسر ریاکاری اور بارگاہِ ایزدی میں نامقبول ہے۔

- صحابہ کرامؓ کے اس نمونۂ عمل نے جس معاشرت کی تکمیل کی وہ حدیث رسولؐ کے مطابق اس خوبی کی حامل تھی۔ جسے ابو موسیٰ اشعریؓ نے روایت کیا ہے:-

المسلم للمسلم کالبنیان مسلمان کا تعلق دوسرے مسلمان سے ایسا

يشدّ بعضه بعضاً — ہے جیسے ایک دیوار کے اجزاء، جن میں سے ہر ایک دوسرے کو قوت پہنچاتا ہے
(متفق علیہ)

اور نعمان بن بشیرؓ حضور علیہ السلام سے روایت کرتے ہیں :۔

مثل المؤمنين في توادّهم وتراحمهم وتعاطفهم كمثل الجسد الواحد اذا اشتكى منه عضوٌ تداعى له سائر الجسد بالسهر والحمّى

مسلمانوں کی باہمی محبّت اور رحمت و مودّت کی مثال ایسی ہے جیسے ایک ہی جسم ہو جس میں ایک عضو کو تکلیف پہنچے تو سارا جسم اس کے لیے بے خواب و بے آرام ہو جاتا ہے۔

آپؓ ہی سے مروی ہے کہ حضور علیہ السلام نے فرمایا :۔

المؤمنون كرجلٍ واحدٍ ان اشتكى عينه اشتكى كله وان اشتكى راسه اشتكى كله
(صحیح مسلم)

مومنوں کی مثال ایک شخص کی طرح ہے اگر اس کی آنکھ کو تکلیف ہو تو سارا جسم بے آرام ہو جاتا ہے۔ اگر اس کے سر کو تکلیف ہو تو بھی سارا جسم بے آرام ہو جاتا ہے۔

گویا ہر مسلمان اپنے معاشرے کے جسم میں آنکھ کی حیثیت رکھتا ہے۔ بقول شخصے

مبتلائے درد کوئی عضو ہو روتی ہے آنکھ
کس قدر ہمدرد سارے جسم کی ہوتی ہے آنکھ

## صحابہ کرامؓ کا معیاری طرزِ عمل (حدیث کی روشنی میں)

اسوۂ صحابہؓ کے باب میں "معیاری طرزِ عمل" کے موضوع پر قرآنی شہادات کے

بعد اب ہم ان کی زندگی کے نمونۂ عمل کا جائزہ احادیث کی روشنی میں لیتے ہیں۔ پہلے ہم خلفائے راشدین کے ذاتی نمونۂ عمل کو بیان کریں گے تاکہ یہ حقیقت واضح ہو کہ گروہِ صحابہ میں سب پر فضیلت لے جانے والوں کی فضیلت کا اصل راز کیا تھا؟ وہ احسان اور انفاق وایثار کے مقام پر کس حد تک فائز تھے؟ اور کیا ان کے معیارِ عمل سے اس امر کی تصدیق ہوتی ہے کہ نبی اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کا مہیا کردہ نمونۂ کمال دوسرے انسانوں کے لیے بھی قابلِ تقلید اور ممکن العمل ہے؟

## اسوۂ صدیقی اور معیارِ عمل

احادیثِ نبوی اور کتبِ تاریخ وسیر اس حقیقت کی تائید کرتی ہیں کہ اسلام قبول کرنے کے بعد جس قدر ایثار وانفاق کا عملی نمونہ حضرت ابوبکر صدیق رضؓ نے پیش کیا ہے اس کی نظیر نہیں ملتی۔

۱۔ حضرت عائشہ رضؓ روایت کرتی ہیں:۔

| | |
|---|---|
| اِنّ ابابکر یوم اسلم ولہ اربعون الف دینارٍ فانفقھا علی رسول اللہ علیہ وسلم (ابنِ عساکر) | جس روز حضرت ابوبکرؓ ایمان لاتے۔ اس وقت ان کے پاس چالیس ہزار دینار تھے۔ پس انھوں نے اپنی ساری دولت آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم پر خرچ کردی۔ |

گویا اسلام قبول کرنے کے بعد انہیں سرکارِ دوعالم صلے اللہ علیہ وسلم کے مشن اور اس کی تکمیلی جدوجہد سے اتنی والہانہ محبت اور لگن پیدا ہوگئی تھی کہ انھوں نے اسی راہ اور مشن کو اپنی ساری دولت کا واحد مصرف سمجھا۔ انہوں نے اس طرح بے دریغ اور بے دھڑک انداز سے اپنے تمام وسائل کو انقلابِ محمدی صلے اللہ علیہ وسلم کی خاطر وقف کر دیا کہ ان کی زندگی میں کئی مراحل ایسے آئے جہاں ان کے پاس اپنی ضرورت کے

لیے بھی کچھ نہ بچا۔ چنانچہ کبھی بھی ان کی طبیعت میں ملال نہ آیا۔ یہ مسلّمہ حقیقت ہے کہ جب تک انسان استغنائے قلب کی دولت سے بہرہ ور نہ ہو۔ وہ اس قدر ایثار و انفاق کا پیکر ثابت نہیں ہو سکتا۔ آپ نے اس امر کی عملی شہادت حضرت عائشہ صدیقہؓ کے مذکورہ بالا ارشاد سے دیکھ لی ہے۔

۲۔ حضرت ابوہریرہؓ روایت کرتے ہیں کہ حضور علیہ السلام نے فرمایا:۔

| | |
|---|---|
| مالاحدٍ عندنا يدٌ الّا وقد | کسی شخص نے ہم پر احسان نہیں کیا مگر |
| كافيناه ما خلا ابا بكرٍ | ہم نے اس کا بدلہ اتار دیا ہے، سوائے |
| فان لهٗ عندنا يدا يكافيه | ابوبکرؓ کے، کہ اس کے احسان کا بدلہ قیامت |
| الله بها يوم القيمة وما | کے دن خود اللہ تعالیٰ اتار دے گا۔ مجھے |
| نفعني مالُ احدٍ قطّ ما | کسی شخص کے مال و دولت نے اس قدر |
| نفعني مال ابي بكرٍ | فائدہ نہیں پہنچایا جتنا ابوبکرؓ کے مال نے۔ |

(ترمذی)

ایک اور روایت میں آتا ہے کہ حضور علیہ السلام نے فرمایا۔ "بے شک جان و مال کے لحاظ سے ابوبکرؓ سے زیادہ کسی نے مجھ کو فائدہ نہیں پہنچایا۔"

مسند امام احمد بن حنبلؒ میں حضرت ابوہریرہؓ ہی سے منقول ہے کہ جب حضور علیہ السلام نے یہ فرمایا تو حضرت ابوبکرؓ رو دیئے۔ حدیث کے الفاظ ملاحظہ ہوں:۔

| | |
|---|---|
| فبكى ابوبكر وقال هل انا | حضرت ابوبکرؓ رو کر عرض کرنے لگے۔ |
| ومالى الا لك يا رسول الله | یارسول اللہ کیا میرے جان و مال آپ کے |
| صلى الله عليه وسلم | سوا کسی اور کے لیے ہیں؟ |

دراصل حضور علیہ السلام کا حضرت ابوبکرؓ کے ایثار و احسان کا اعتراف کرنا ان کے لیے باعثِ رقت بن گیا۔ وہ حضور علیہ السلام کے اس اندازِ کریمانہ پر تڑپ اُٹھے اور

بے ساختہ عرض کرنے لگے۔ یا رسول اللہ! آپ میری جان و مال کی قربانی کا ذکر تو جب کریں۔ اگر یہ آپ کے سوا کسی اور کی خاطر ہوں۔ جب میرے جان و مال اور ساری متاعِ حیات صرف آپؐ کے لیے ہی ہے تو پھر ان کو اپنے مصرف میں لانا کونسی عجیب بات ہے۔ اس ارشادِ نبویؐ کے بعد اسوۂ صدیقی کے ایثار اور احسان و انفاق کے پہلو کی تصدیق کے لیے مزید کسی شہادت کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔

۳۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ کی شخصیت اس منتہائے کمال پر اسی ایثار کے باعث پہنچی تھی۔ آپ نے فی الحقیقت اپنی دولت اس طرح نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے تصرف میں دے رکھی تھی کہ حضرت عائشہؓ، ابنِ عباسؓ، انس بن مالکؓ، ابوسعید خدریؓ اور جابر بن عبداللہؓ وغیرہم بیان کرتے ہیں:۔

| | |
|---|---|
| كان رسول الله صلى الله عليه وسلم يقضي في مالِ ابي بكرٍ كما يقضي في مالِ نفسه (مسند ابو یعلیٰ) | رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم حضرت ابوبکرؓ کے مال میں اس طرح تصرف فرماتے تھے۔ جس طرح اپنے ذاتی مال میں فرماتے۔ |

۴۔ اس معروف واقعہ سے بھی مذکورہ بالا حقیقت کی تصریح ہوتی ہے۔ جسے ہم "مفہومِ احسان" کی وضاحت کے ضمن میں پہلے ہی بیان کر چکے ہیں۔ جب آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرامؓ سے راہِ خدا میں مال پیش کرنے کا حکم صادر فرمایا تو آپؓ گھر کا سارا مال و اسباب لے کر خدمتِ نبویؐ میں حاضر ہو گئے۔ اس پر حضور علیہ السلام نے آپؓ سے فرمایا:۔

| | |
|---|---|
| ما ابقيت لاهلك، قال ابقيت لهم الله ورسوله (ترمذی، ابوداؤد) | اے ابوبکرؓ! اپنے گھر والوں کے لیے کیا چھوڑ آئے ہو؟ انھوں نے عرض کیا۔ یا رسول اللہ! ان کے لیے خدا اور |

خدا کا رسول چھوڑ آیا ہوں۔

یہ ارشاد حضرت ابوبکر صدیق اکبرؓ کی کتابِ زندگی کا عنوان ہے۔ ان کی پوری شخصیت اسی تصوّر کے گرد گھومتی نظر آتی ہے۔

● امام ابونعیم، حضرت ابوہریرہؓ اور ابنِ مسعودؓ سے اور امام بغوی وامام ابنِ عساکر عبداللہ بن عمرؓ سے روایت کرتے ہیں کہ "اس موقع پر جب حضرت ابوبکرؓ نے سب کچھ راہِ حق میں لٹا دیا تو خود ایک پھٹی ہوئی چادر اوڑھے بارگاہِ مصطفوی صلے اللہ علیہ وسلم میں حاضر تھے کہ حضرت جبرئیل امین نے آکر آنحضرت صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سے عرض کیا:

انّ اللہ یقرأ علیہ السلام ویقول قل لہٗ اراضٍ انت عنّی فی فقرک ھذا ام ساخطٌ فقال ابوبکرؓ اسخط علی ربّی؟ انا عن ربی راضٍ، انا عن ربی راضٍ، انا عن ربی راضٍ

بے شک اللہ تعالیٰ ابوبکرؓ کو سلام ارشاد فرماتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ آپ ان سے پوچھیں۔ کیا تم مجھ سے اپنے اس فقر کی حالت میں راضی ہو یا ناراض؟ اس پر حضرت ابوبکرؓ نے کہا! کیا میں اپنے رب سے ناراض ہو سکتا ہوں؟ (یارسول اللہ! آپ فرما دیجئے) میں اپنے رب سے راضی ہوں، راضی ہوں، راضی ہوں۔

ایثار و احسان کے عمل نے انھیں اس ارفع و اعلےٰ مقام پر پہنچا دیا تھا کہ ذاتِ حق خود ان کی رضا کی طالب بن گئی تھی۔ اس لیے انھیں اپنی زندگی میں "رضائے الٰہی کا نصب العین" بالکل ظاہر و باہر انداز سے حاصل ہو گیا تھا۔ بلکہ اس امر کی دوٹوک شہادت خود قرآن مجید نے بھی مہیا کر دی تھی۔

۵۔ جب حضرت صدیق اکبرؓ نے حضرت بلالؓ کو اُمیہ بن خلف سے خرید کر آزاد

کردیا تو ان کے اس عمل کی صحت و قبولیت کا اعلان کرتے ہوئے باری تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:۔

مَا لِاَحَدٍ عِنْدَهٗ مِنْ نِّعْمَةٍ تُجْزٰٓى ۝ اِلَّا ابْتِغَآءَ وَجْهِ رَبِّهِ الْاَعْلٰى ۝ وَلَسَوْفَ يَرْضٰى (اللیل: ۱۹ تا ۲۱)

ابوبکرؓ پر کسی کا کوئی احسان نہیں تھا۔ جس کا اس نے بدلہ دیا ہو۔ بلکہ اس نے تو یہ ایثار و انفاق محض اپنے رب عظیم کی رضا کی خاطر کیا ہے اور یقیناً اس کا رب اس سے راضی ہو جائے گا۔

## اُسوہ فاروقؓ اور معیارِ عمل

سیدنا فاروقِ اعظمؓ کی شخصیت بھی اسی طرح پیکرِ ایثار و احسان تھی حضرت اسلمؓ، عبداللہ بن عمرؓ سے روایت کرتے ہیں کہ میں نے ان سے حضرت عمرؓ کی شان اور خصائص کے بارے میں دریافت کیا تو انھوں نے فرمایا:۔

ما رأيت احداً قط بعد رسول الله صلى الله عليه وسلم من حين قبض كان اجدّ واجود حتٰى انتهٰى من عمر (صحیح بخاری)

میں نے حضور علیہ السلام کے وصال کے بعد آج تک کوئی شخص حضرت عمرؓ سے زیادہ مجاہدہ و ریاضت (یعنی محنت اور جدوجہد) کرنے والا اور سخاوت و احسان کرنے والا نہیں دیکھا اور آپ کا یہ معمول آپ کی وفات تک بدستور قائم رہا۔

حضرت عمرؓ نے بھی سیدنا ابوبکر صدیقؓ کی طرح ایثار اور انفاق کو اس حد تک اپنی زندگی کا زیور بنا لیا تھا کہ آپ بھی باوجود اہلِ ثروت ہونے کے کئی مرتبہ فاقہ کی زندگی بسر فرماتے، یہ فقر و فاقہ کم و بیش تمام صحابہ کا شعار بن گیا تھا۔ امام ترمذیؒ کی ایک روایت سے حضرت عمرؓ کے ان احوال پر روشنی پڑتی ہے۔

● وہ حضرت ابوہریرہ رضؓ سے روایت کرتے ہیں۔ ایک روز حضور علیہ السلام خلافِ عادت ایسے وقت باہر تشریف لائے جس وقت آپ باہر تشریف نہیں لایا کرتے تھے اور نہ ہی اس وقت کوئی ملاقات کرنے والا حاضرِ خدمت ہوتا۔ دریں اثنا ابوبکر صدیق رضؓ آنحضورؐ کی خدمت میں حاضر ہوتے تو حضورؐ نے فرمایا۔

مَاجَاءَ بِكَ يَا اَبَا بَكْرٍ فَقَالَ خَرَجْتُ اَلْقَى رَسُوْلَ اللّٰهِ صلى الله عليه وَسَلَّمَ وَانظر فِيْ وجهه والتسليم عليه فلم يلبث ان جاء عمر، ما جاء بك يا عمر قال الجوع يا رسول الله صلى الله عليه وسلم فقال النبى صلى الله عليه وسلم وانا قد وجدت بعض ذالك ــــ

(جامع ترمذی)

اے ابوبکر! اس وقت تیرے یہاں آنے کا مقصد کیا ہے؟ انہوں نے عرض کیا آپ کی خدمت میں حاضر ہو کر آپ کا دیدار کرنے اور سلام عرض کرنے کے لیے حاضر ہوا ہوں۔ پس تھوڑی دیر بھی نہ گزری تھی کہ حضرت عمرؓ تشریف لے آئے۔ سرورِ کائنات صلے اللہ علیہ وسلم نے دریافت فرمایا! عمرؓ تجھے اس وقت کونسی ضرورت لے آئی انہوں نے عرض کیا یا رسول اللہؐ بھوک لے آئی ہے تو حضور صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ کچھ بھوک تو میں بھی محسوس کر رہا ہوں۔

بعد ازاں آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم ان دونوں کو ساتھ لے کر حضرت ابو الہیثم بن تیہان انصاری رضؓ کے ہاں تشریف لے گئے اور وہاں کھانا تناول فرمایا۔

حدیثِ مذکورہ پر غور کرنے سے حقیقتِ حال کھل کر سامنے آ جاتی ہے کہ حضور علیہ السلام اور ان کے یہ دونوں جاں نثار کس حالت میں زندگی بسر فرماتے تھے۔ حقیقت یہ تھی کہ حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ دونوں طویل فاقہ اور بھوک کی شدت کی وجہ سے اپنے اپنے گھر سے باہر نکلے تھے کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے دیدار فرحت آثار

سے اپنی بھوک مٹائیں اور کچھ سکون پائیں۔ ادھر جنابِ رسالت مآب صلے اللہ علیہ وسلم نے اپنے گھر بیٹھے نگاہِ نبوّت سے ان دونوں کی حالت کی شدت کو دیکھ لیا اور بجائے اس کے کہ حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ دونوں بے وقت بارگہِ مصطفوی صلے اللہ علیہ وسلم میں حاضری کے لیے آتے اور حجاب محسوس کرتے، آپؐ خود ان سے پہلے باہر تشریف لے آئے۔ دونوں سے بے ساختہ آنے کا سبب دریافت کیا اور خود بھی ان کی دلجوئی کے لیے بھوک کے احساس کا اظہار فرماتے ہوئے انھیں ساتھ لے کر چل دیئے اور اپنے ایک خادم صحابی کے گھر جاکر کھانا تناول فرمایا۔ اگر اس وقت تینوں میں سے کسی کے گھر بھی کھانے کو کچھ موجود ہوتا تو آپ حضرت ابوہیثمؓ کے گھر تشریف نہ لے جاتے۔ اس واقعہ سے حضرت عمرؓ کی زندگی پر بھی خاصی روشنی پڑتی ہے۔ آپ نے بھی اپنی ساری دولت مستحقین کے معاشی تعطل کو رفع کرنے اور راہِ حق کے مجاہدین کی ضرورتوں کو پورا کرنے پر خرچ کردی تھی اور خود اپنی زندگی سُنّتِ نبوی صلے اللہ علیہ وسلم کے مطابق اس حال میں بسر کردی۔ جس کی ایک جھلک آپ کے سامنے ہے۔ ایثار و احسان کا جذبہ آپ کے تختِ خلافت پر متمکن ہونے پر بھی اسی طرح قائم و دائم رہا۔ آپ کا یہ ارشاد اس حقیقت کی منہ بولتی تصویر ہے کہ "اگر میرے دورِ حکومت میں بکری کا بچہ بھی دریائے دجلہ کے کنارے بھوک سے مر گیا تو اس کا مواخذہ مجھ سے ہوگا۔" اس سے آپ کے احساسِ ذمہ داری کا اندازہ ہوتا ہے۔ چنانچہ آپ راتوں کو لباس بدل کر گلیوں میں چلتے اور ایک ایک گھر کے حالات کا پتہ لگاتے۔ اگر کسی کو تنگدست اور پریشان حال پاتے تو خود اس گھر والوں کی ضروریات پُشت پر اُٹھا کر وہاں پہنچا آتے اور اس کام کے لیے کسی خادم کو بھی تکلیف نہ دیتے تھے۔ یہ دراصل ان کے رگ و ریشے میں موجزن وہی جذبہ ایثار و انفاق تھا جو تاجدارِ کائنات صلے اللہ علیہ وسلم کے نمونۂ کمال نے تمام صحابہ و اہلبیت کو عطا کیا تھا۔ زندگی کا یہ رنگ صرف آپؐ کی ذات تک

ہی محصور نہ رہا تھا بلکہ آپؓ کے اہلِ خانہ بھی عملِ احسان و انفاق کے آئینہ دار بن گئے تھے اس کا اندازہ آپ کے صاحبزادے حضرت عبداللہؓ کے معمول سے ہوتا ہے۔ امام بخاریؒ حضرت ابنِ عمرؓ کا یہ معمول بیان کرتے ہیں :۔

كان ابن عمر لا يأكل حتّٰى يؤتى بمسكين يأكل معه (صحیح بخاری)

ابن عمرؓ اس وقت تک کھانا تناول نہ فرماتے تھے۔ جب تک کوئی ضرورت مند ان کے ساتھ کھانا نہ کھاتا۔

## اسوۂ عثمانی اور معیارِ عمل

سیدنا عثمانِ غنیؓ کا شیوۂ زندگی بھی کسی سے مخفی نہیں۔ آپؓ نے ہجرتِ مدینہ کے بعد مسلمانوں کے لیے میٹھے پانی کے کنویں خرید کر وقف کیے۔ مسجد کے لیے قطعۂ زمین خریدا۔ اسلامی فوج کو اس کی ضروریات اور ساز و سامان مہیا کیا۔ بے شمار غلاموں کو آزادی کی نعمت دلائی۔ صحابہ کرامؓ کی معاشی حالت بہتر بنانے کے لیے اپنی دولت کو بے دریغ خرچ کیا۔ قحط اور تنگی کے ایام میں باہر سے گندم خرید کر اہلِ مدینہ میں مفت تقسیم فرمائی اور ہر موقع پر حکمِ رسولؐ کی تعمیل میں احسان و انفاق کی وہ مثال پیش کی جو ابدالآباد تک دنیائے انسانیت کے لیے نمونۂ عمل رہے گی۔

- عبدالرحمٰن بن خبابؓ روایت کرتے ہیں۔ جب آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے اسلامی لشکر (جیش العسرہ) کے لیے صحابہ کرام کو انفاق کی ترغیب دی تو اس موقع پر حضرت عثمانؓ نے چھ سو (۶۰۰) اونٹ مع ضروری سامان بارگاہِ مصطفوی صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم میں پیش کر دیئے۔ اس پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس طرح خوش ہوئے کہ حدیث میں آتا ہے :۔

فانا رأيت رسول الله صلى الله عليه وسلم ينزل عن المنبر

میں نے دیکھا کہ حضور علیہ السلام منبر سے نیچے تشریف لے آئے اور فرمانے لگے

| | |
|---|---|
| وھو یقول ما علی عثمان ما عمل بعد ھذہٖ ، ما علیٰ عثمان ما عمل بعد ھذہٖ (ترمذی) | اس کے بعد عثمان جو کچھ بھی کرے گا اس کا کوئی مواخذہ وسوال نہیں ہوگا۔ اس کے بعد عثمان جو کچھ بھی کرے گا اس کا کوئی مواخذہ وسوال نہیں ہوگا۔ |

● اسی طرح عبدالرحمٰن بن سمرہؓ روایت کرتے ہیں:۔

| | |
|---|---|
| جاء عثمان الی النبی صلی اللہ علیہ وسلم بالفِ دینارٍ فرأیت النبی صلی اللہ علیہ وسلم یقلّبھا فی حجرہٖ ویقول ما ضرّہ عثمان ________ (مسند امام احمد، ترمذی) | (حضرت عثمانؓ نے بارگہِ نبویؐ میں (انفاق فی سبیل اللہ کے طور پر) ایک ہزار دینار پیش کیے۔ حضرت عبدالرحمٰنؓ کہتے ہیں۔ میں نے دیکھا کہ حضور علیہ السلام ان کو اپنی گود میں رکھ کر ہاتھ سے ہلا رہے تھے اور فرماتے تھے۔ آج کے بعد عثمان کا کسی عمل پر مواخذہ نہیں ہوگا۔ آج کے بعد عثمان کا کسی عمل پر مواخذہ نہیں ہوگا۔ |

یہ ان کا عملِ ایثار و انفاق تھا اور اس پر آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی طرف سے مژدۂ جزا۔

## اسوۂ علیؓ اور معیارِ عمل

حضرت علیؓ کے اسوۂ مبارک کے ضمن میں ہم اس سے قبل قرآنِ حکیم سے شہادت پیش کر چکے ہیں۔ تمام اصحاب سیر اس امر پر متفق ہیں کہ حضرت علیؓ کے ایثار و انفاق کا یہ عالم تھا کہ آپ تمام عمر میں ایک مرتبہ بھی صاحب نصاب نہ ہو سکے کہ زکوٰۃ ادا کرنے کی نوبت آتی۔ آپ نے فرمایا ؎

فما وجبت علیّ زکوٰۃ مالٍ — فھل تجب الزکوٰۃ علی الجواد

(میرے اُوپر مال کی زکوٰۃ کبھی واجب نہیں ہوئی۔ کیا سخی لوگوں پر بھی زکوٰۃ واجب ہو سکتی ہے)

آپ کی ذاتِ اقدس اس معاملے میں نہایت منفرد مقام کی حامل تھی۔ آپ نے بھی اسوۂ نبوی صلے اللہ علیہ وسلم کی اتباع میں اپنی ساری دولت اور کمائی ہمیشہ دوسروں پر خرچ کی اور اپنے گھر کو فقر و فاقہ کی زینت سے نوازے رکھا۔ اہلبیتِ نبویؐ کا یہ گھرانہ انفاق و احسان اور فقرِ اختیاری میں نبی اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کے بعد کوئی نظیر نہیں رکھتا۔

سیدنا امام حسن مجتبیٰؓ کا یہ ارشاد اس حقیقت کو واضح کرنے کے لیے کافی ہے" کہ آلِ محمد صلے اللہ علیہ وسلم کے گھرانے میں ایک صاع کھانے نے کبھی بھی شام نہیں گزاری "۔

آپ کے اُسوہ و عمل کی جھلک بھی آپ کے صاحبزادے حضرت امام حسنؓ کے درج ذیل ارشاد سے ملاحظہ فرمایئے جو انھوں نے حضورؐ کی اس حدیث :-

لیس المؤمن الّذی یشبع و جارہٗ جائع — وہ شخص مومن نہیں جو خود پیٹ بھر کر سوئے اور اس کا پڑوسی بھوکا ہو۔

کی وضاحت میں فرمایا۔ جسے امام بخاریؒ نے ولید بن دینارؓ سے روایت کیا ہے :-

اِنّہٗ سُئِلَ عن الجار فقال اربعین دارًا امامہٗ واربعین خلفہٗ واربعین عن یمینہٖ واربعین عن یسارہٖ (الادب المفرد) — امام حسنؓ سے پوچھا گیا کہ ارشادِ رسول صلے اللہ علیہ وسلم میں پڑوسی سے مراد کون ہے؟ انھوں نے فرمایا۔ چالیس گھر سامنے، چالیس گھر پیچھے، چالیس گھر دائیں اور چالیس گھر بائیں۔

گویا یہ اہلِ ثروت کے لیے حیطۂ کفالت ہے۔ اگر انسان صاحبِ استطاعت

ہو اور اتنے دُور تک لوگ فقر کی حالت میں ہوں یا ان کی ضروریات کما حقہٗ پوری نہ ہو رہی ہوں اور ان کا کوئی پُرسانِ حال نہ ہو تو صاحبِ استطاعت مسلمان پر اتنی حدود تک انفاق و احسان واجب ہے ۔ اس کی دولت اسی لیے ہے کہ اس کے علاوہ اس کے ارد گرد رہنے والے ضرورت مند افراد کی ضرورتوں کی بھی تکمیل ہو ۔ اگر اس کی دولت صرف اسی کی آسائش و تزئین پر خرچ ہو رہی ہو اور اس کے ماحول میں لوگ بنیادی ضرورتوں سے بھی محروم ہوں تو یہ دولت مندی حرام ہے ۔ اس طرح انسان ایمان کے تقاضوں کو پورا نہیں کر سکتا ۔

## دیگر صحابہ کا اُسوہ اور معیارِ عمل

جس طرح ہم نے پہلے عرض کیا ہے کہ نبی اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کی صحبت کے فیضان سے جو کوئی جس قدر مستفید ہوا تھا ۔ وہ اسی قدر ایثار اور انفاق و احسان کا پیکر بن گیا تھا ۔ صحابہ کرام کی زندگیوں کا یہ شعار حضورؐ کی تعلیمات اور آپ کے عملی نمونہ کمال کی تاثیر کی شہادت تھا ۔

- متعدد کتبِ احادیث میں وارد ہوا ہے کہ حضرت ابوطلحہؓ انصارِ مدینہ میں سے اچھے مالدار تھے ۔ آپ کے کھجوروں کے باغات میں سے سب سے بڑا اور سب سے عزیز باغ مسجدِ نبویؐ کے سامنے تھا ۔ جس کا نام "بیرحا" تھا ۔ حضور علیہ السلام اس میں اکثر تشریف لے جاتے تھے ۔ اس کی بابت حضرت انسؓ روایت کرتے ہیں :-

فلما نزلت ھذہ الآیۃ " لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰی تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ " قام ابوطلحۃ الی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فقال یا رسول اللہ

جب یہ آیت نازل ہوئی ۔ "تم ہرگز نیکی کو نہیں پا سکتے جب تک تم اپنا پسندیدہ مال خدا کی راہ میں خرچ نہ کر دو" حضرت ابوطلحہؓ بارگہِ نبویؐ میں حاضر ہوئے اور عرض کیا ۔ یا رسول اللہؐ ! اللہ تعالے کا

صلی اللہ علیہ وسلم ان اللہ یقول لن تنالوا البر حتی تنفقوا مما تحبون وان احب مالی الی بیرحاء وانها صدقۃ للہ تعالیٰ ارجو برھا وذخرھا عند اللہ فضعها یا رسول اللہ حیث اراک اللہ فقال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بخ بخ ذالک مال رابح وقد سمعت ما قلت وانی اری ان تجعلها فی الاقربین، فقال ابو طلحۃ فی اقاربہ وبنی عمہ

(متفق علیہ)

یہ حکم ہے کہ تم اپنا پسندیدہ مال راہِ حق میں خرچ کیے بغیر نیکی کو نہیں پا سکتے اور میرا سب سے زیادہ پسندیدہ مال یہ باغ (یا خطۂ زمین) ہے۔ پس میں اسے اللہ تعالیٰ کیلئے صدقہ کرتا ہوں۔ میں اس کے ذریعے نیکی اور آخرت کا اجر چاہتا ہوں۔ لہٰذا اسے رضائے الٰہی کے مطابق تقسیم فرما دیجئے۔ حضور علیہ السلام نے ان کی تحسین فرماتے ہوئے ارشاد فرمایا۔ میں نے تمہاری بات سُن لی ہے۔ میری رائے یہ ہے کہ تم خود اسے اپنے مستحق رشتہ داروں میں تقسیم کر دو، چنانچہ حضرت ابو طلحہؓ نے عرض کیا۔ یا رسول اللہ! میں حکم کی تعمیل کرتا ہوں، پھر آپ نے وہ سارا باغ اپنے اعزاء واقارب اور چچا کی اولاد میں تقسیم کر دیا۔

اس حدیث سے درج ذیل نتائج اخذ ہوتے ہیں:۔

۱۔ ایثار و انفاق کے باب میں صحابہ کرامؓ ہر وقت حکمِ الٰہی کی تعمیل میں تیار رہتے تھے اور ان کے عملِ انفاق میں کوئی امر بھی مانع نہ ہوتا تھا۔

۲۔ اس معاملے میں ان کا عمل وجوب و استحباب کے امتیاز سے ماورا تھا۔ وہ اپنی اعلیٰ سے اعلیٰ متاع راہِ حق میں قربان کرنے کے آرزومند تھے۔

۳۔ نبی اکرم صلے اللہ علیہ وسلم انفاق فی سبیل اللہ کی آرزو پر ہمیشہ ان کی تحسین فرماتے اور انھیں اس امر کی مزید ترغیب دلاتے تھے۔

۴۔ "لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰى تُنْفِقُوا مِمَّا تُحِبُّوْنَ" کے حکم کو آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے نفلی حکم قرار دے کر حضرت ابو طلحہؓ کو پورا باغ راہِ خدا میں تقسیم کرنے سے منع نہیں فرمایا۔ جس سے اس حکم کی عملی اہمیت کا اندازہ ہوتا ہے۔

۵۔ عملِ انفاق کے سب سے بڑے مستحق خونی رشتہ دار ہیں اور اس کے بعد معاشرے کے دیگر افراد۔ یہ حدیث اس حقیقت کی وضاحت کرتی ہے کہ جن قرآنی احکام کو آج ہم نفلی و استحبابی احکام قرار دے کر ان پر عمل پیرا ہونا صاحبِ استطاعت کی صوابدید پر چھوڑ دیتے ہیں بلکہ ان کی نفلی حیثیت کے تصور کو اپنے مفادات کے تحفّظ کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ ان احکام کی اہمیت کا تصور عہدِ رسالت اور اس کے بعد صحابہ کرامؓ کو کس حد تک تھا اور وہ ان احکام کے حوالے سے اپنی عملی زندگی کو کس طرح تشکیل دیتے تھے۔ یعنی ان کے نزدیک احکامِ انفاق کی صحیح روح اور ان کی اصل تعبیر کیا تھی۔

● اسی طرح حضرت عبداللہؓ روایت کرتے ہیں :۔

| | |
|---|---|
| كُنَّا نَعُدُّ الْمَاعُونَ عَلٰى عَهْدِ رَسُولِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَارِيَةَ الدَّلْوِ وَالْقِدْرِ (ابوداؤد) | ہم عہدِ رسالت صلے اللہ علیہ وسلم میں پیالے اور ہنڈیا کا بھی دوسروں کے استعمال کے لیے دینا "حکمِ ماعون" کے تحت تصوّر کرتے تھے۔ |

قرآنِ حکیم نے دین کو جھٹلانے والوں کی علامت کے طور پر یہ بیان کیا تھا :۔

| | |
|---|---|
| وَيَمْنَعُوْنَ الْمَاعُوْنَ (الماعون) | اور وہ گھر کے برتنے کی چیزوں کو دوسروں کے استعمال سے روکتے ہیں۔ |

چنانچہ اس حکم الٰہی کی رُوح اور تعبیر جو عہدِ رسالت میں صحابہ کرام کے نزدیک مسلم تھی وہ یہ تھی کہ پیالے اور ہنڈیا جیسی معمولی اشیار کو بھی دوسروں کی ضرورت اور استعمال سے روک رکھنا دین کی تکذیب کے مترادف ہے۔ گویا صحابہ کرام کے نزدیک تصوّرِ ایثار و انفاق ہی روحِ دین تھا اور اس کا معنی یہ تھا کہ اپنی ملکیت کی کوئی چیز بھی اگر کسی دوسرے کے استعمال کے لیے ضروری ہو تو اس کی افادیت کو ضرورت مند شخص تک پہنچانا فرض ہے۔ اس کے خلاف عمل کا نام دسیسہ کاری اور تکذیبِ دین ہے۔

● بعض حالات میں ایثار و انفاق کے ایسے حکم کو بطور فرض سرکاری طور پر بھی نافذ کر دیا جاتا تھا۔ جیسے کہ عبداللہ بن عمرؓ سے مروی ہے کہ عہدِ فاروقی میں ایک مرتبہ قحط پڑ گیا۔ لوگوں نے حضرت عمرؓ سے درخواست کی۔ انہوں نے دُعا مانگی اور اللہ تعالیٰ نے قحط کو رفع فرما دیا۔ اس موقع پر حضرت عمرؓ نے فرمایا:

| | |
|---|---|
| فواللّٰہ لو انّ اللّٰہ لم یفرجھا ما ترکتُ اھل ابیتٍ من المسلمین لھم سعۃ الّا ادخلتُ معھم اعدادھم من الفقراء فلم یکن اثنان یھلکان من الطعام علی ما یقیم واحداً | خدا کی قسم، اگر اللہ تعالیٰ قحط کو رفع نہ فرماتے تو میں مسلمانوں کا کوئی گھرانہ ایسا نہ چھوڑتا، جس میں کچھ کھانا اور وسعت ہو، ہر گھر میں اس کے افراد کی تعداد کے برابر حاجتمند افراد کو حکماً داخل کر دیتا، کیونکہ جو کھانا ایک شخص کھاتا ہے وہ دو اشخاص کو زندہ رکھنے کے لیے کافی ہے۔ |
| (الادب المفرد، صفحہ ۲۷) | |

اس اثرِ فاروقی سے ایثار و احسان کی وجوبی حیثیت کے جواز کا بھی علم ہو گیا۔ اسی طرح ہم نبی اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کے اُسوہ وعمل اور تعلیمات کے ضمن میں بھی ایسی صورتیں بیان کر چکے ہیں۔ جن میں ایثار و احسان کا عمل بعض حالات میں واجب

ہوتا ہے اور اس کا نفاذ بھی حکماً ضروری ہو جاتا ہے۔

● حضرت سلمہ بن اکوع روایت کرتے ہیں:-

قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم ضحایا کم لا یصبح احدکم بعد ثالثۃٍ وفی بیتہٖ منہ شیٔ فلمّا کان العام المقبل قالوا یا رسول اللہ نفعل کما فعلنا العام الماضی قال کلوا وادخروا، فانّ ذالک العام کانوا فی جہد فاردت ان تعینوا

(صحیح بخاری)

حضور علیہ السلام نے فرمایا! تم نے جو قربانیاں کی ہیں۔ تم میں سے کوئی شخص تیسرے دن کی صبح اس حال میں نہ کرے کہ اس کے گھر میں اس گوشت میں سے ذرہ بھر بھی باقی نہ بچ رہے۔ (چنانچہ صحابہؓ نے تین دن کے اندر اندر تمام گوشت تقسیم کر دیا اور حسبِ سابق خشک کر کے کچھ بھی باقی نہ رکھا) جب اگلا سال آیا تو صحابہ نے بارگہِ نبویؐ میں عرض کیا۔ یا رسولؐ اللہ! ہم اس مرتبہ بھی پچھلے سال کی طرح کر رہے ہیں۔ حضورؐ نے فرمایا۔ اس مرتبہ کوئی بات نہیں کھاؤ اور بیشک حسبِ ضرورت بچا کر بھی رکھ لو، پچھلے سال کچھ لوگ تنگ تھے۔ اس لیے میں نے ارادہ کیا کہ تم ایک دوسرے کی مدد کرو۔

یہ صحابہ کرامؓ کا وہ عمل اور اسوۂ حیات تھا۔ جس کے باعث ان کا نمونۂ زندگی عالمِ انسانیت کے لیے معیارِ عمل قرار پا گیا۔ ان کے اس ایثار نے نہ صرف ان کو رضائے الٰہی کے حصول میں کامیاب و کامران کیا بلکہ قیامت تک ان کے اس طرزِ عمل کی پیروی کرنے والے بھی اپنے نصب العین میں کامیاب ہوں گے۔ جیسا کہ اس

آیتِ کریمہ میں وعدہ کیا گیا ہے :-

وَالسّٰبِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ
مِنَ الْمُهٰجِرِيْنَ وَالْاَنْصَارِ
وَالَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُمْ
بِاِحْسَانٍ رَّضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ
وَرَضُوْا عَنْهُ ـــــــ
ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ

( التوبہ، ۱۰۰ )

اور سب سے پہلے سبقت لینے والے مہاجرین وانصار ہیں اور جو لوگ بعد میں بھی فعلِ احسان کے ذریعے ان کی اتباع کریں گے ۔ اللہ تعالےٰ ان سب پر راضی ہوگا اور وہ اللہ سے راضی ہوں گے اور یہی سب سے بڑی کامیابی ہے ۔

باب ہشتم

# قومی زندگی کا نصب العین

## فصلِ اوّل

# انفرادی، اجتماعی اور قومی زندگی کا باہمی ربط

اس سے قبل ہم حیاتِ انسانی کے انفرادی نصب العین اور اس کے حصول کے قرآنی لائحہ عمل کے موضوع پر نہایت شرح اور بسط کے ساتھ گفتگو کر چکے ہیں۔ یہ امر اچھی طرح واضح کر چکا ہے کہ اس سلسلے میں قرآنِ مجید انسانوں کو کیا ہدایت مہیا کرتا ہے۔ اب ہم اس مسئلے کی بابت قرآنی ہدایت کے اجتماعی اور قومی پہلو پر روشنی ڈالیں گے تاکہ یہ واضح ہو سکے کہ قومی سطح پر ملتِ اسلامیہ کا نصب العین کیا ہے؟ اور اس کے حصول کے لیے قرآن کیا لائحہ عمل عطا کرتا ہے۔ حیاتِ انسانی کے تین مراحل کی طرح قرآنی ہدایت کے بھی تین ہی مدارج ہیں :۔

## انفرادی، قومی اور بین الاقوامی

قرآنِ مجید خود کو انسانی زندگی کی تینوں سطحوں کے لیے بطور صحیفۂ ہدایت متعارف کراتا ہے۔

## قرآنی ہدایت اور حیاتِ انسانی کی انفرادی سطح

قرآنِ حکیم اپنی نعمتِ ہدایت سے ہر فرد کو متمتع کرتا ہے۔ اس سلسلے میں ارشادِ ربانی ہے :۔

| | |
|---|---|
| اِنَّ هٰذِهٖ تَذْكِرَةٌ ۚ فَمَنْ شَآءَ اتَّخَذَ اِلٰى | بے شک یہ قرآن صحیفۂ ہدایت و نصیحت ہے۔ پس جو فرد چاہے |

رَبِّہٖ سَبِیْلًا (المزمل ۱۹) راہِ حق کو پالے۔

اس آیتِ کریمہ میں فرد کی کوئی تخصیص بیان نہیں ہوئی، امیر ہو یا غریب، سیاہ ہو یا سفید، قرآنی دعوتِ ہدایت ہر ایک کے لیے یکساں ہے۔ اب ہر شخص کو اپنی اپنی حیثیت کے مطابق جس طرح کی بھی ہدایت مطلوب ہو۔ اگر وہ صدقِ دل کے ساتھ قرآن کی طرف متوجہ ہو تو اس کی ضرورت کی تکمیل ہو کر رہے گی۔ جس طرح پیاسے کو پانی، بھوکے کو کھانے کی، حاجتمند کو پیسے کی، بیمار کو شفا کی، کمزور کو طاقت کی اور مظلوم کو مدد کی ضرورت ہے۔ اسی طرح مختلف انسانی طبقات کو اپنی اپنی حیثیات اور کیفیات کے مطابق الگ الگ درجے کی ہدایت مطلوب ہوتی ہے۔ لہٰذا قرآن حکیم بلا استثنیٰ تمام افرادِ انسانی کو دعوتِ عام دے رہا ہے کہ یہ کتاب ہدایت و نصیحت کا سرچشمہ ہے۔ جو بھی اس سرچشمے سے راہِ حق کی ہدایت طلب کرے گا اسے میسر آئے گی۔ کسی کا دامنِ طلب خالی نہیں رہے گا ۔

ہم تو مائل بہ کرم ہیں کوئی سائل ہی نہیں
راہ دکھلائیں کسے، رہروِ منزل ہی نہیں

## قرآنی ہدایت اور حیاتِ انسانی کی قومی سطح

جس طرح انسانی زندگی اجتماعیت اور قومیت کے بغیر اپنے مقاصد حاصل نہیں کر سکتی۔ اسی طرح اسلام بھی اجتماعیت اور قومیت کے بغیر اپنا مذہبی و ملی تشخص بحال نہیں رکھ سکتا بلکہ اس کے مقاصد کے حصول بھی باقاعدہ قومی زندگی کے قیام پر منحصر ہیں۔ حضرتِ فاروقِ اعظمؓ کا ارشاد ہے کہ

| | |
|---|---|
| لا اسلام الا بجماعۃ ولا جماعۃ الا بالامیر ولا امارۃ الا بالسمع والطاعۃ۔ | اسلام کا اجتماعی زندگی کے بغیر کوئی وجود نہیں۔ اجتماعی زندگی قیادت کے بغیر ممکن نہیں اور قیادت، اطاعت و پیروی |

(جامع العلم لابن عبدالبر ۱، ص۶۲) — کے بغیر قائم نہیں رہتی۔

چنانچہ حیاتِ انسانی اور نظامِ اسلام کے لیے اجتماعیت اور قومیت کے ناگزیر ہونے کی بنا پر قرآن مجید نے قومی زندگی کی سطح پر ہدایت مہیا کرنے کا فریضہ بھی سرانجام دیا ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے :۔

إِنَّهُ لَذِكْرٌ لَّكَ وَلِقَوْمِكَ (الزخرف، ۴۴) — بے شک یہ قرآن (اے رسولؐ) آپ کے لیے اور آپ کی قوم کے لیے صحیفۂ ہدایت ہے۔

نبی اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کی اُمت کے دو گروہ ہیں :۔

۱۔ **اُمتِ دعوت** (وہ تمام افرادِ جن و انس جنہیں آپ صلے اللہ علیہ وسلم نے دعوتِ اسلام دی۔ یعنی جن کی طرف حضور علیہ السلام مبعوث کیے گئے)۔ اس کا دائرہ اس حدیثِ مبارکہ سے واضح ہو جاتا ہے۔ جو حضرت ابوہریرہؓ سے مروی ہے :۔

ارسلتُ الی الخلق کافۃً وختم بی النبیون (متفق علیہ) — میں تمام مخلوق کی طرف رسول بنا کر بھیجا گیا ہوں اور میری آمد سے انبیاءؑ کا سلسلہ ختم ہو گیا ہے۔

اسی طرح ارشادِ نبوی ہے جسے جابر بن عبداللہ انصاریؓ سے روایت کیا ہے :۔

کان کل نبیٍ یبعث الی قومہٖ خاصۃً وَبعثت الی کل احمر واسود (متفق علیہ) — مجھ سے پہلے ہر نبی اپنی ایک مخصوص قوم کی طرف مبعوث ہوتا تھا۔ لیکن میں عالمِ انسانیت کے ہر سرخ و سیاہ فرد کی طرف مبعوث کیا گیا ہوں۔

گویا مخلوقاتِ عالم کا ہر فرد جو شرعاً مکلّف ہے حضور علیہ السلام کی اُمتِ دعوت میں شامل ہے خواہ مسلم ہو یا کافر، حضور علیہ السلام پر ایمان لایا ہو یا نہ لایا ہو۔

**۲۔ اُمّتِ اجابت** ۔ (تمام عالمِ جنّ و انس میں سے جو بھی حضور علیہ السلام کی دعوت کو قبول کر کے آپ پر ایمان لے آیا وہ حضور علیہ السلام کی اُمتِ اجابت کا فرد بن گیا۔)

یہ اُمتِ اجابت بھی زمان و مکان اور رنگ و نسل کے امتیازات سے ماورا ہے۔ یہ ساری کی ساری امت سرورِ دو عالم صلے اللہ علیہ وسلم کی "قوم" قرار پا گئی، اسی کو عرفِ عام میں ملّتِ اسلامیہ، اُمتِ محمدی صلے اللہ علیہ وسلم یا بقول اقبالؒ "قومِ رسولِ ہاشمی" کہتے ہیں۔ جب کہ انبیاءِ ماسبق کی امتوں اور دیگر اقوامِ عالم کی بنیاد اور وسعت ایسی عالمگیر اور آفاقی نہیں ہے۔

ان کے دائرے زمان و مکان اور رنگ و نسل کی حدود سے متعین ہوتے ہیں۔ مگر جس طرح نبی آخر الزماں علیہ السلام کی نبوت و رسالت آفاقی و عالمگیر ہے اسی طرح حضور صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی امت اور قوم و ملّت بھی آفاقی اور عالمگیر ہے۔ علامہ اقبالؒ اسی تصورِ قومیتِ محمدی صلے اللہ علیہ وسلم کا ذکر ان الفاظ میں کرتے ہیں،

اپنی ملّت پر قیاس اقوامِ مغرب سے نہ کر — خاص ہے ترکیب میں قومِ رسولِ ہاشمی
ان کی جمعیت کا ہے ملک و نسب پر انحصار — قوتِ مذہب سے مستحکم ہے جمعیت تری

مادی دَور اور تہذیبِ نَو کی محدود قومیت کے تصور کو رد کرتے ہوئے ایک اور مقام پر علامہ اقبالؒ یوں رقمطراز ہیں :

یہ بُت کہ تراشیدہ تہذیبِ نوی ہے — غارت گرِ کاشانۂ دینِ نبویؐ ہے
بازو ترا توحید کی قوت سے قوی ہے — اسلام ترا دیس ہے، تُو مصطفوی ہے

لہٰذا قرآنِ مجید نبی اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کی اس آفاقی و عالمگیر قوم کے لیے بھی صحیفۂ ہدایت ہے جیسا کہ آیتِ مذکورہ بالا میں ارشاد فرمایا گیا کہ "یہ قرآن آپ کے لیے اور آپ کی قوم کے لیے ہدایت ہے۔" اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ قرآن نے

اُمتِ محمدی صلے اللہ علیہ وسلم کو قومی سطح پر بھی اس کے نصب العین اور اس کے حصول کے لائحہ عمل کی حتمی و قطعی ہدایت سے بہرہ ور کیا ہے۔

## قرآنی ہدایت اور حیاتِ انسانی کی بین الاقوامی سطح

قرآنِ مجید نے اپنی ہدایت کا دائرہ صرف ملّتِ اسلامیہ تک ہی محصور نہیں رکھا بلکہ یہ عالمِ انسانیت کی دیگر اقوام و ملل کے لیے بھی صحیفہ ہدایت ہے تاکہ انسانی زندگی عالمی سطح پر بین الاقوامی تعلقات میں بھی ہدایتِ ربانی سے محروم نہ رہے۔ اس سلسلے میں ارشادِ ربانی ملاحظہ ہو۔

اِنْ هُوَ اِلَّا ذِكْرٰى لِلْعٰلَمِيْنَ (انعام، ۹۰) — یہ قرآن تمام اقوامِ عالم کے لیے صحیفۂ ہدایت ہے۔

قرآنِ مجید نے بین الاقوامی سطح پر تعاون و عدمِ تعاون، صلح و جنگ اور معاہدات و معاملات کی نسبت جو احکام صادر فرمائے ہیں وہ اسی پہلو سے ہدایت کے متضمنات ہیں

## اجتماعیت اور قومیت میں فرق

(اجتماعی زندگی قومی زندگی میں کس طرح بدلتی ہے!)

قومی زندگی کے نصب العین پر روشنی ڈالنے سے پہلے یہ ضروری ہے کہ قومی زندگی کا مفہوم سمجھ لیا جائے۔ یہاں یہ امر ذہن نشین رہے کہ افراد کی محض اجتماعی ساخت کو قومی زندگی کا نام نہیں دیا جا سکتا۔ جب بے شمار افراد اکٹھے رہتے ہیں اور ان کی زندگیاں مختلف نوعیتوں کے تعلقات کے اعتبار سے باہمی مربوط اور منسلک ہوتی ہیں تو یہ حالت افراد کی اجتماعی زندگی کہلاتی ہے۔ لیکن اسے "حیاتِ قومی" میں بدلنے کے لیے کچھ شرائط ہیں جنہیں پورا کیے بغیر افراد کا وہ گروہ محض "اجتماع" رہتا ہے "قوم" نہیں بن سکتا۔

## تشکیلِ قومیت کے دو مراحل

قومی زندگی کی تشکیل کے دو مرحلے ہوتے ہیں :-

۱- **غیر سیاسی مرحلہ** -(اسکی حیثیت PRE POLITICAL STAGE کی ہوتی ہے)

۲- **سیاسی مرحلہ** -(اسکی حیثیت POST-POLITICAL STAGE کی ہوتی ہے)۔

ہر دو مراحل کے تین تین تقاضے ہوتے ہیں جنہیں پورا کیے بغیر حیاتِ اجتماعی' قومی زندگی میں نہیں بدل سکتی۔ اب ہم تشکیلِ قومیت کے دونوں مراحل کا ذرا تفصیل سے ذکر کرتے ہیں۔

## تشکیلِ قومیت کا غیر سیاسی مرحلہ

یہ مرحلہ درج ذیل تین تقاضوں کی تکمیل سے طے ہوتا ہے۔

۱- **اجتماعی وحدت کی بُنیاد** سب سے پہلے افراد کی زندگی میں اجتماعی وحدت کی بنیاد فراہم کی جاتی ہے۔ جس کی بنا پر تمام افراد خود کو ایک وحدت میں منسلک تصور کرنے لگتے ہیں۔ مختلف معاشروں میں اجتماعی وحدت کی بنیاد مختلف تصورات ہوتے ہیں مثلاً

ا۔ **نسلی وحدت کا تصور** - افراد کو ایک نسل اور قبیلے سے متعلق ہونے کی وجہ سے ایک وحدت بنا دیتا ہے اور وہ خود کو دوسروں سے اس وحدت کے حوالے سے متمیز کرنے لگتے ہیں۔

ب۔ **لسانی وحدت کا تصور** - افراد کو ایک زبان بولنے کی وجہ سے ایک وحدت میں بدل دیتا ہے اور وہ لسانی وفاداری کی بنا پر خود کو دوسروں سے الگ تشخص دینے لگتے ہیں

ج۔ **جغرافیائی وحدت کا تصور** - افراد کو ایک مخصوص علاقے میں رہنے کی وجہ سے ایک وحدت بنا دیتا ہے اور وہ اس وطنی وفاداری کی بنا پر ایک جداگانہ حیثیت اختیار کرنے کے آرزومند ہو جاتے ہیں۔

د ۔ <u>معاشی وحدت کا تصوّر</u> ۔ افراد کو ایک جیسے معاشی حالات کی وجہ سے ایک وحدت میں منسلک کر دیتا ہے اور وہ معاشی طبقاتی وفاداری کی بنا پر خود کو ایک الگ گروہ تصوّر کرنے لگتے ہیں ۔

۵ ۔ <u>فکری و نظریاتی وحدت کا تصوّر</u> ۔ افراد کو ایک مخصوص فکر اور نظریہ و عقیدہ کے حوالے سے ایک وحدت عطا کر دیتا ہے ۔ جس کے باعث وہ خود کو ایک الگ نظریاتی گروہ تصور کرنے لگتے ہیں اور دوسروں سے ان کے تشخّص و امتیاز کی بنیاد وہ عقیدہ قرار پا جاتا ہے ۔ اسلام باقی تمام محدود تصوّرات کو رد کر کے صرف فکری و نظریاتی وحدت کے تصور کو اپناتا ہے اور اسی سے وفاداری کی بنیاد پر اپنے ماننے والوں کو ایک قوم میں بدل دیتا ہے ۔ مذکورہ بالا تصوّرات میں سے جو تصوّر بھی ہو وہ افراد کے لیے بہر صورت اجتماعی ــــ وحدت کی بنیاد ضرور فراہم کرتا ہے ۔ اور یہاں سے اجتماعِ انسانی کے قوم ــــ میں بدلنے کا آغاز ہوتا ہے ۔ جب تک افراد کو ایسا کوئی تصوّر کہ ان کو ایک ہونے کا احساس نہ دلا دے وہ قومی زندگی کا روپ دھارنے کے قابل نہیں ہو سکتے ۔ اس لیے ضروری ہے کہ انھیں کسی نہ کسی تصوّرِ وحدت سے وفاداری پیدا ہو اور وہ خود کو اس نسبت سے ایک قوت سمجھنے لگیں ۔

۲ ۔ <u>اجتماعی شعور کی بیداری</u> اجتماعی وحدت کا تصور ان افراد کو " اجتماعی شعور " عطا کرتا ہے ۔ اس سے قبل ہر شخص صرف اپنے ذاتی مفاد و منفعت کے حوالے سے ہی سوچتا تھا ۔ اب وہ اجتماعی مفاد کی نسبت بھی سوچنے لگتا ہے اجتماعی شعور پیدا ہونے سے پہلے نفع و نقصان کا صرف وہی تصوّر قابلِ قبول تھا جو اشخاص کو انفرادی طور پر متاثر کرتا تھا ۔ لیکن اب افرادِ معاشرہ نجی و انفرادی مفاد کے تنگ حصارے سے باہر نکل کر نہ صرف ایک دوسرے کے مفاد کو بلکہ تمام افراد کے مجموعی مفاد کو بھی پیشِ نظر رکھتے ہیں افراد کی منتشر وفاداریاں سمٹ کر ایک نقطہ

برسرکار ہو جاتی ہیں اور بالآخر ان کا اجتماعی شعور، انفرادی منفعت کے شعور پر غالب آجاتا ہے۔ اگر سوچ کا یہ انداز اختیار نہ کرے تو افراد منتشر زندگی بسر کرتے رہیں گے وہ ایک وحدت میں منسلک نہ ہو سکیں گے۔ گویا اجتماعی وحدت کو برقرار رکھنے کی شرط ہی یہی ہے کہ تمام لوگ اپنے ذاتی مفادات سے بالاتر ہو کر اپنے اجتماعی مفادات کے تحفظ کی فکر کرنے لگیں۔ یہی سوچ انھیں آپس میں پیوست اور متحد رکھنے کی ضمانت فراہم کر سکتی ہے۔ اگر اجتماعی شعور میسر نہ آئے تو "وحدت" کا نعرہ" محض ایک مردہ نعرہ رہ جاتا ہے۔ جو کہ نقشہ تشکیلِ قومیت کا کردار ادا نہیں کر سکتا

۳۔ **اجتماعی جدوجہد کا عزم** | اجتماعی شعور کی بیداری بھی مقصود بالذات نہیں ہے۔ اس کی ضرورت اس لیے ہوتی ہے کہ اسی کی بنا پر افرادِ معاشرہ اجتماعی جدوجہد کے لیے آمادہ ہوتے ہیں۔ کیونکہ اجتماعی شعور کے بغیر اجتماعی جدوجہد کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ یہ تشکیلِ قومیت کے غیر سیاسی مرحلے کا آخری اور انتہائی اہم تقاضا ہے یہاں افراد کی وفاداریوں کے ساتھ ساتھ ان کی قوتیں، صلاحیتیں اور کوششیں بھی متحد ہو جاتی ہیں اور ان کے اندر مشترکہ جدوجہد کا عزم پیدا ہو جاتا ہے۔ دوسروں کے ساتھ ان کی دشمنی اور دوستی مشترکہ بنیادوں پر ہوتی ہے۔ وہ کسی طبقے کو اپنا اجتماعی دوست تصور کرتے ہوئے اس سے مانوس ہوتے ہیں اور کسی کو اپنا اجتماعی دشمن تصور کرتے ہوئے اس سے نفرت کرتے ہیں۔ کوئی قوم ان کے اجتماعی مفاد کو نقصان پہنچانا چاہے تو وہ اس کے خلاف مشترکہ جدوجہد کرتے ہیں۔ اپنی بقاء اور وحدت کے تحفظ کی خاطر مل جل کر تگ و دو کرتے ہیں۔ الغرض ان کا جینا اور مرنا اجتماعی مفاد کی خاطر ہوتا ہے۔ ان تین تقاضوں کی تکمیل سے افراد غیر سیاسی سطح پر قومی وجود اختیار کر لیتے ہیں۔

## تشکیلِ قومیت کا سیاسی مرحلہ

غیر سیاسی مرحلے کے تینوں تقاضوں کی صحیح تکمیل درحقیقت سیاسی مرحلے کے

درج ذیل تقاضوں پر منحصر ہے :۔

- اجتماعی نصب العین کا تعیّن
- باقاعدہ اداراتی تنظیم
- مفصّل لائحہ عمل

## ا۔ اجتماعی نصب العین کا تعیّن

یہ امر ناقابلِ انکار حقیقت ہے کہ اجتماعی وحدت کا شعور اور اجتماعی جدوجہد کا عزم خواہ کسی ہنگامی ضرورت کے تحت پیدا ہو یا کسی مستقل بنیاد پر جیسے پہلے بیان کیا جا چکا ہے۔ اگر اس کے ساتھ افراد کو "اجتماعی نصب العین" مہیا نہ کیا جائے تو وہ نہ متحد رہ سکتے ہیں اور نہ ان کا اجتماعی شعور بحال رہ سکتا ہے۔ کوئی بھی تصورِ وحدت باقاعدہ نصب العین کے بغیر اپنے اندر یہ صلاحیت نہیں رکھتا کہ وہ افراد کو ایک وحدت میں ہمیشہ منسلک رکھ سکے۔ افراد کی اجتماعی وحدت کو حقیقی زندگی عطا کرنے والا مرحلہ اجتماعی نصب العین کا تعین ہے۔ نصب العین کے شعور اور اس کے صحیح تعین کے بغیر نہ وحدت حقیقی وحدت رہتی ہے اور نہ اجتماعی جدوجہد کا عزم برقرار رہ سکتا ہے بلکہ افراد کو قومی زندگی سے بہرہ ور کرنے والا پہلا حقیقی تقاضا ہی "اجتماعی نصب العین" کا تعین ہے۔ اس سے مراد یہ ہے کہ افراد کے اندر یہ شعور پیدا ہو جائے کہ ہم کس لیے زندہ ہیں؟ ہم ایک وحدت کیوں ہیں؟ ہمیں اجتماعی جدوجہد کی ضرورت کیوں ہے؟ وہ کونسا مقصد اور نصب العین ہے جس کی خاطر ہم نسلی، لسانی، جغرافیائی، معاشی یا نظریاتی بنیاد پر ایک قومیت کو تشکیل دے رہے ہیں۔

جب تک اجتماعی نصب العین کا شعور اور یقین پختہ نہ ہو جائے۔ غیر سیاسی مرحلے کا کوئی تقاضا بھی تشکیلِ قومیت کا کام سرانجام نہیں دے سکتا اور نصب العین کے شعور کا پختہ ہونا یہ ہے کہ افراد اس امر کو یقینی طور پر ذہن نشین کریں کہ ہم اس

مقصد کی خاطر زندہ ہیں اور اسی کے لیے مریں گے۔ کیونکہ حقیقی زندگی ہی دراصل نصب العین کے شعور اور اس کے حصول کی جد و جہد سے عبارت ہے۔ اگر یہ شعور اور جد و جہد نہ ہو تو زندگی، زندگی نہیں بلکہ موت ہے۔ اس لیے قومی زندگی کا اصل خمیر اجتماعی نصب العین کے تعین سے ہی اٹھتا ہے۔ جب تک افراد کے اندر وحدت کا شعور ان کے اجتماعی نصب العین کے حوالے سے پیدا نہ ہو۔ وہ قوم کی حیثیت اختیار کرنے اور قوم کی حیثیت سے زندہ رہنے کے قابل نہیں ہو سکتے۔ کسی قوم کا معرضِ وجود میں آنا، اس کا اس حیثیت سے باقی رہنا اور صفحۂ ہستی پر فروغ و استحکام پانا نصب العین کے بغیر ناممکن ہوتا ہے۔ لہٰذا تشکیلِ قومیت کے عملی مرحلے کا آغاز اسی تقاضے کی تکمیل سے ہوتا ہے۔

**۲۔ باقاعدہ اداراتی تنظیم** یہ تشکیلِ قومیت کا دوسرا عملی تقاضا ہے۔

جس طرح اجتماعی نصب العین کا تعین قومیت کی حقیقی اساس ہے اور اس کے بغیر قومی زندگی کا کوئی وجود نہیں ہوتا۔ اسی طرح اداراتی تنظیم کا قیام نصب العین کے حصول کی حقیقی بنیاد ہے اور اس کے بغیر محض نصب العین کا شعور کسی منفعت کا باعث نہیں ہو سکتا۔ حصولِ مقصد کی کوئی جد و جہد بھی "تنظیم" کے بغیر پایۂ تکمیل کو نہیں پہنچ سکتی۔ لہٰذا اس مرحلہ پر یہ امر انتہائی ناگزیر ہو جاتا ہے کہ معاشرے کو مختلف اداروں کی صورت میں باقاعدہ طور پر منظم کیا جائے۔ عائلی زندگی ہو یا تعلیمی، سیاسی زندگی ہو یا اقتصادی، مذہبی زندگی ہو یا ثقافتی الغرض ہر شعبۂ حیات کو اجتماعی سطح پر ایک ادارے کی صورت دے کر منظم کیا جائے تاکہ ہر ایک شعبے کا اپنا عمل اور تمام شعبہ جات کا باہمی عمل مربوط اور منضبط ہو سکے اور پوری معاشرتی زندگی منظم جد و جہد کے ذریعے اپنی منزلِ مقصود کو پا سکے۔ تنظیم کے بغیر کی گئی تمام جد و جہد نتائج کے لحاظ سے رائیگاں جاتی ہے۔

یہی بنیادی خامی بیشمار لوگوں کو زندگی میں انفرادی اور اجتماعی سطح پر کافی تگ و دو کے باوجود ناکامی سے ہمکنار کرتی ہے اور وہ اس حقیقت کو سمجھ نہیں پاتے کہ جدوجہد میں کامیابی کے لیے تنظیم کا کتنا دخل ہے۔ بڑی بڑی مذہبی اور سیاسی جماعتیں افراد کا جم غفیر حاصل کر لینے کے باوجود ساحلِ مراد تک نہیں پہنچ سکتیں۔ اس کی بھی ایک بنیادی وجہ "تنظیم" کا فقدان ہوتا ہے۔ لہذا تشکیلِ قومیت کے لیے نصب العین کے بعد تنظیم کا مسئلہ انتہائی ضروری ہوتا ہے۔

۳۔ مفصل لائحہ عمل (تفصیلی پروگرام) یہ حصولِ منزل کا سب سے آخری اور سب سے ضروری تقاضا ہے۔ تنظیم مفصل لائحہ عمل اور تفصیلی پروگرام کے بغیر معرض وجود میں نہیں آسکتی۔ جب تک حصولِ نصب العین کے لیے مفصل لائحہ عمل سامنے نہ ہو۔ نہ موثر تنظیم قائم کی جا سکتی ہے اور نہ جدوجہد میں کامیابی متوقع ہوتی ہے۔ جس طرح افراد کے اجتماعی وجود کو قومی وجود دینے کے لیے ایک "ولولہ انگیز نصب العین" درکار ہوتا ہے۔ اسی طرح اس قومی وجود کو برقرار رکھتے ہوئے نصب العین کی طرف بڑھنے کے لیے ایک جامع و مانع پروگرام درکار ہوتا ہے۔ گویا نصب العین اجتماعی زندگی کو قومی زندگی میں بدل تو سکتا ہے لیکن مفصل لائحہ عمل کے بغیر اسے باقی نہیں رکھ سکتا۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ بڑے بڑے گروہ اور طبقات اپنے سامنے غلط یا صحیح لیکن واضح نصب العین رکھنے کے باوجود اسی لیے منتشر ہو جاتے ہیں کہ ان کے پاس تفصیلی پروگرام نہیں ہوتا۔ گویا نصب العین کے بغیر منظم اجتماعیت حاصل نہیں ہوتی اور پروگرام کے بغیر منظم اجتماعیت باقی نہیں رہتی۔ لہذا قومی زندگی کے قیام، بقا اور استحکام کے لیے فی الحقیقت دو چیزیں لازم و ملزوم ہیں
واضح نصب العین" اور "مفصل پروگرام"۔

نصب العین کے بغیر پروگرام کا کوئی وجود نہیں اور مفصل پروگرام کے بغیر

نصب العین کی کوئی افادیت نہیں۔ چنانچہ جدوجہد کو کسی سرچشمۂ ہدایت یا نظامِ فکر سے ماخوذ مفصّل پروگرام کے تحت حصولِ نصب العین کے لیے منظّم کرنے کی ضرورت ہوتی ہے اور اس طرح انسانی کاوش منزلِ مراد تک پہنچتی ہے۔

## فصلِ دوم

# قومی زندگی کا اجتماعی نصب العین

تشکیلِ قومیت کی شرائط پر تفصیلی گفتگو کے بعد اب ہم اس سوال کی طرف متوجہ ہوتے ہیں کہ اسلام نے قومی سطح پر کونسا نصب العین پیش کیا ہے۔ جس کے حصول کے لیے مسلمانوں پر اجتماعی جد و جہد لازم کی گئی ہے!

اسلام کا اجتماعی اور قومی نصب العین ایک ایسے صالح اور مثالی انقلابی معاشرے کا قیام ہے جو غلبۂ دین کی خاطر عالمگیر انقلاب کا ضامن ہو — وہ معاشرہ

(۱) وحدتِ نسلِ انسانی اور شرف و تکریم انسانیت کے ایسے تصور پر مبنی ہو جس سے محدود گروہی، لسانی، علاقائی اور طبقاتی عصبیتیں معدوم ہو سکیں۔

(۲) اس کی بنائے استحکام حضرت محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ اقدس سے ایسی غیر مشروط اور مخلصانہ دائمی وفاداری ہو کہ شرک فی النبوۃ کا کوئی شائبہ باقی نہ رہے۔

(۳) اس کے افراد اس طرح روحانی الذہن ہوں کہ ان کی تمام تر جد و جہد میں محرکِ عمل — رضائے الٰہی کی جستجو اور اساسِ عمل مطالبۂ حقوق کی بجائے ایتائے حقوق ہو تاکہ معاشرے کا کوئی فرد بھی محرومی کا شکار نہ ہونے پائے۔

(۴) اس کی جد و جہد کا رخ یہ ہو کہ انفرادی اور اجتماعی زندگی تمام داخلی اور خارجی موجبات، خوف و غم سے محفوظ ہو جائے۔

(۵) اور وہ بین الاقوامی سطح پر غلبۂ حق کی خاطر داخلی اور خارجی محاذوں پر تمام باطل

طاغوتی، استحصالی اور منافقانہ قوتوں کے خلاف غیر مصالحانہ انقلابی جنگ فیصلہ کن مرحلے تک جاری رکھ سکے

ایسے عالمگیر انقلابی معاشرے کا قیام اسلام کا پیش کردہ وہ اجتماعی نصب العین ہے جس کے حصول کی جدوجہد سے ہماری قومی زندگی عبارت ہے۔ اب ہم مذکورہ بالا شرائط اور مقاصد سے تفصیلی بحث کرتے ہیں :۔

## ۱۔ وحدتِ نسلِ انسانی اور شرف و تکریم انسانیت

اسلام اجتماعی جدوجہد کے نتیجے میں جس عالمگیر معاشرے کے قیام کا داعی ہے۔ اس کی شرط اوّلین وحدتِ نسلِ انسانی اور شرف و تکریم انسانیت کا تصور ہے۔ وحدتِ نسلِ انسانی کا ذکر قرآن مجید ان الفاظ سے کرتا ہے :۔

۱۔ یٰٓاَیُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمُ الَّذِیْ خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ وَّخَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا وَبَثَّ مِنْهُمَا رِجَالًا كَثِیْرًا وَّنِسَآءً

(النساء، ۱)

اے بنی نوعِ انسان، اپنے رب سے ڈرو جس نے تم سب کو ایک جان سے پیدا فرمایا اور اس میں سے اس کا جوڑ پیدا کیا اور پھر ان دونوں میں سے بے شمار مرد اور عورتیں پیدا کر کے پھیلا دیں۔

۲۔ ایک اور مقام پر ارشاد فرمایا گیا :۔

هُوَ الَّذِیْ خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ وَّجَعَلَ مِنْهَا زَوْجَهَا لِیَسْكُنَ اِلَیْهَا

(الاعراف، ۱۸۹)

وہ ایسی ذات ہے جس نے تم سب کو ایک جان میں سے پیدا کیا اور پھر اس میں سے اس کا جوڑ پیدا کیا تاکہ وہ اپنے جوڑ کی طرف مانوس ہو اور اس سے سکون پائے۔

۳۔ ایک اور مقام پر ارشاد باری تعالیٰ ہے :۔

هُوَ الَّذِیْٓ اَنْشَاَکُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَۃٍ (الانعام ۹۸) — وہ ایسی ذات ہے جس نے تم سب کو ایک جان میں سے اٹھایا۔

آپ نے ملاحظہ فرمایا کہ قرآنِ مجید میں کتنی مقامات پر باری تعالیٰ اپنی ذات کا تعارف تخلیقِ انسانیت کے حوالے سے کراتے ہوئے "وحدتِ نسلِ انسانی" کے تصور کو بنیادی اہمیت دیتے ہیں۔ بلکہ بار بار یوں کہا گیا ہے کہ خدا کی ذات ایسی ذات ہے جس نے تمام انسانوں کو ایک ہی اصل سے پیدا کیا ہے"۔ اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ جس طرح اللہ تعالیٰ کے علاوہ کوئی ہستی خالق نہیں ہو سکتی اور جس طرح ذاتِ حق کے لیے دوئی کا تصور ناممکن ہے۔ اسی طرح نسلِ انسانی کی اصل کے لیے بھی دوئی کا تصور ناممکن ہے۔ بلکہ نسلِ انسانی کی وحدت خود "وحدانیتِ خالق" کی دلیل ہے۔ یعنی خدا کا ایک ہونا خلقتِ انسانی کے ایک ہونے کا باعث ہے۔

۴۔ باری تعالیٰ نے اس تصور کو مزید صراحت کے ساتھ یوں بیان فرمایا ہے:۔

اِنَّ هٰذِهٖٓ اُمَّتُكُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً ۖ وَّاَنَا رَبُّكُمْ فَاعْبُدُوْنِ (الانبیاء ۹۲) — بے شک یہ تمہاری اُمّت ہے جو (اصلاً) ایک ہی اُمّت ہے اور میں تمہارا رب ہوں۔ پس میری عبادت کرو۔

۵۔ اِنَّ هٰذِهٖٓ اُمَّتُكُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً وَّاَنَا رَبُّكُمْ فَاتَّقُوْنِ (المومنون ۵۲) — بے شک یہ تمہاری اُمّت ہے جو (اصلاً) ایک ہی اُمّت ہے اور میں تمہارا رب ہوں۔ پس مجھ سے ڈرو۔

ان آیات میں باری تعالیٰ نے اپنی توحید اور ربوبیت و الوہیت کا ذکر بھی وحدتِ نسلِ انسانی کے حوالے سے کیا ہے۔ " اُمَّةً وَّاحِدَةً " کا تصور بالکل صراحت کے ساتھ اسلامی معاشرے کی تشکیل کے لیے بنائے وحدت کو واضح کر رہا ہے کہ اسلامی معاشرے کی بنیاد وحدت کے کس تصور پر قائم ہونی چاہیے۔

۶۔ اسلام انسانی معاشرے کے اندر مختلف قبیلوں اور خاندانوں کے وجود کو وحدتِ نسلِ انسانی کے تصور کے منافی قرار نہیں دیتا۔ وحدتِ انسانی کا تصور ایک ایسی آفاقی اور عالمگیر حقیقت ہے جس کی نفی نسلی، لسانی یا علاقائی تشخصات سے ممکن نہیں ارشادِ باری تعالیٰ ہے:۔

يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنَّا خَلَقْنَاكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ وَّأُنْثَىٰ وَجَعَلْنَاكُمْ شُعُوبًا وَّقَبَائِلَ لِتَعَارَفُوا ۚ إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللَّهِ أَتْقَاكُمْ

(الحجرات، ۱۳)

اے نوعِ انسانی ہم نے تمہیں ایک ہی مرد و عورت سے پیدا کیا ہے۔ پھر تمہیں مختلف نسلوں اور قبیلوں میں محض اس لیے تقسیم کیا کہ تم ایک دوسرے کو پہچان سکو (لیکن یہ نسلی اور قبائلی تشخص کسی فضیلت اور تفوق کا باعث ہرگز نہیں) بلکہ تم میں سے اللہ کے نزدیک زیادہ افضل و برگزیدہ وہی شخص ہے جو تم میں سب سے زیادہ پرہیزگار ہے۔

لہٰذا تمام نسلی و قبائلی تشخصات صرف اس حد تک روا ہیں کہ ان کے ذریعے لوگ ایک دوسرے کے باہمی رشتہ و تعلق کو پہچان سکیں۔ اگر یہ تشخص کسی معاشرے میں وجہِ فضیلت یا بنائے عصبیت قرار پانے لگے۔ جس سے انسانی وحدت کا تصوّر مجروح ہو رہا ہو تو اسلام اس کو حرام قرار دیتا ہے۔

۷۔ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے حجۃ الوداع کے موقع پر اپنے عظیم الشان تاریخی خطبہ میں ارشاد فرمایا:۔

فلیس لعربی علی عجمی ولا لعجمی علی عربی ولا لاسود

پس کسی عربی کو عجمی پر اور کسی عجمی کو عربی پر، کسی سیاہ کو سفید پر اور کسی سفید کو

على ابيض ولا لابيض على اسود فضل الا بالتقوىٰ، الناس من آدم و آدم من تراب ۰ الا ما كل ماثرة او دم او مال يدعى به فهو تحت قدمى هاتين.

(خطبہ حجۃ الوداع)

سیاہ پر کوئی فضیلت نہیں ہے۔ سوائے تقویٰ اور پرہیزگاری کے۔ تمام لوگ حضرت آدمؑ کی اولاد ہیں اور آدم مٹی سے پیدا کیے گئے تھے۔ تفوق و امتیاز کے تمام جاہلانہ دعوے اور خون اور مال کے تمام جاہلانہ مطالبے، جن کی بنیاد پر انسان، انسان پر اپنی فضیلت و حکمرانی کا حق جتاتا ہے میں نے اپنے قدموں کے نیچے روند دیے ہیں۔

یہ وحدتِ نسلِ انسانی کے تصور کا عالمگیر اعلان تھا۔ جس کی بنیاد پر بانیٔ اسلام صلے اللہ علیہ وسلم نے تمام گروہی، نسلی، لسانی اور علاقائی عصبیتوں کو کالعدم قرار دے دیا اور معاشرۂ انسانی کی اساس نسلِ انسانی کی وحدت اور شرف و تکریمِ انسانیت کے تصور پر قائم فرما دی۔ جب تمام انسانوں کی نسبت تصورِ وحدت ذہنوں میں جاگزیں ہو جاتا ہے تو اسی سے انسانی شرف و تکریم کا احساس جنم لیتا ہے۔

۸۔ قرآنِ مجید اس امر کی بھی صریحاً نشاندہی فرماتا ہے :۔

وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيٓ اٰدَمَ وَحَمَلْنٰهُمْ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ وَرَزَقْنٰهُمْ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ وَفَضَّلْنٰهُمْ عَلٰى كَثِيْرٍ مِّمَّنْ خَلَقْنَا تَفْضِيْلًا

(الاسراء ۷۰)

اور بے شک ہم نے بنی آدم کو عزت و تکریم بخشی، انھیں بحر و بر پر سواری کا شرف عطا کیا، انھیں پاکیزہ رزق عطا کیا اور انھیں اپنی بیشتر مخلوقات پر نمایاں فضیلت عطا کی۔

آیتِ متذکرہ بالا بنی نوعِ انسان کے شرف و تکریم پر دلالت کرتی ہے اور اس

امر کا بھی تقاضا کرتی ہے کہ ہر حال میں انسانی شرف ووقار کا احترام کیا جائے۔ یہ امر ناقابلِ فہم ہے کہ باری تعالیٰ انسان کو عزت وتکریم کے امتیازی تاج سے نواز دے اور خود انسانیت اپنی تذلیل وتحقیر پر اُتر آئے۔ یہ عمل فی الواقع ربِ ذوالجلال کے خلاف کھلی بغاوت اور چیلنج کے مترادف ہے۔ لیکن آج ہم اپنے احوال پر نظر ڈالیں تو ہماری پوری زندگی اسی عمل کی غمازی کرتی دکھائی دیتی ہے۔ انسان، انسان کے خون کا پیاسا ہے، اس کی عزت کے درپے ہے۔ اس کے مال پر نگاہیں جمائے ہوئے ہے۔ اس طرح انسانی معاشرہ وحشت وبربریت کی تصویر پیش کر رہا ہے۔ یہ اسلام سے صریح انحراف نہیں تو اور کیا ہے؟ اسلام جس معاشرے کی تشکیل کی دعوت دیتا ہے۔ اس میں ہر ایک شخص کا احترام پوری انسانیت کا احترام ہے اور کسی بھی شخص کی تذلیل پوری انسانیت کی تذلیل ہے۔

۹۔ قرآنِ مجید میں ارشاد فرمایا گیا:۔

مَنْ قَتَلَ نَفْسًا بِغَيْرِ نَفْسٍ اَوْ فَسَادٍ فِي الْاَرْضِ فَكَاَنَّمَا قَتَلَ النَّاسَ جَمِيْعًا ۭ وَمَنْ اَحْيَاهَا فَكَاَنَّمَآ اَحْيَا النَّاسَ جَمِيْعًا (المائدہ، ۳۲)

جس نے بغیر کسی قصاص کے یا زمین میں فساد انگیزی کے طور پر ایک شخص کی بھی جان تلف کی۔ گویا اس نے تمام انسانیت کو تہ تیغ کر دیا اور جس نے کسی ایک شخص کی جان بچائی۔ گویا اس نے پوری انسانیت کو زندگی بخش دی۔

اس آیت نے معاشرہ اسلامی کی اس بنیادی خصوصیت کو کتنے زوردار انداز میں بیان کیا ہے کہ اس معاشرے میں کوئی غریب ہو یا امیر، سیاہ ہو یا سفید، بڑا ہو یا چھوٹا، ہر ایک کی زندگی یکساں اہمیت کی حامل ہے۔ ان بنیادوں پر انسانی زندگی میں امتیازات پیدا کرنا قرآنِ مجید سے کفر کرنا ہے۔ یہی انقلابی تصورِ اسلام

معاشرے میں تشکیل کرنا چاہتا ہے کہ ہر شخص کی عزت وحفاظت پوری انسانیت کی عزت وحفاظت تصور کی جائے۔

اس سے یہ امر واضح طور پر طے پاگیا کہ ہر شخص کی جان ومال اور عزت وآبرو مساوی طور پر قابلِ تکریم ہے۔ اگر کوئی شخص کسی ایک انسان کو جان، مال یا عزت و آبرو سے محروم کرتا ہے۔ وہ یہ سمجھ لے کہ اس نے یہ جرم پوری انسانیت کے خلاف کیا ہے۔ لہٰذا اسلامی معاشرے کے ہر فرد کا یہ فرض ہوا کہ وہ ہر دوسرے شخص کی جان، مال اور عزت وآبرو کو اتنا عزیز رکھے جتنا اپنی جان، مال اور عزت وآبرو کو عزیز رکھتا ہے۔

۱۰۔ پیغمبرِ انقلاب صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:۔

| | |
|---|---|
| اِنَّ دمائکم واموالکم واعراضکم حرامٌ کحرمۃ یومکم ھذا | بے شک تمہاری جانیں اور تمہارے اموال اور تمہاری عزتیں اسی طرح حرمت والی ہیں جیسے تمہارے لیے آج کے دن (یعنی حجۃ الوداع کے دن) کی حرمت ہے۔ |

یہ اعلانِ نبوی صلے اللہ علیہ وسلم مسلمانوں کے لیے لمحہ فکریہ ہے کہ ہم کس حد تک اپنے مسلمانوں ہونے کا حق ادا کر رہے ہیں۔

۱۱۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے مروی ہے:۔

| | |
|---|---|
| قال رأیت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یطوف بالکعبۃ ویقول ما اطیبک واطیب ریحک ما اعظمک واعظم حرمتک والذی نفس محمدٍ بیدہ لحرمۃ | وہ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو کعبہ کا طواف کرتے ہوئے دیکھا اور وہ یہ فرما رہے تھے۔ اے کعبہ تو کتنا پاک ہے اور تیری فضا بھی پاک ہے تو کتنا عظیم ہے اور تیری حرمت وعزت بھی عظیم ہے۔ اس ذات کی قسم جس کے |

المؤمن اعظم عند الله حرمة منك ، ماله ودمه وان نظن به الا خيراً
(ابنِ ماجہ)

قبضہ قدرت میں محمدؐ کی جان ہے بیشک ایک مومن کی عزت و حرمت اللہ تعالیٰ کے نزدیک تیری عزت و حرمت سے بھی زیادہ عزیز ہے۔ اس کا مال، اس کا خون اور اس کی آبرو (یعنی) اس کے بارے میں سوائے بھلائی کے اور کوئی گمان نہ کرنا اللہ کے نزدیک تجھ سے زیادہ برگزیدہ ہے۔

اس ارشادِ رسولؐ کے بعد انسانی شرف و تکریم اور بالخصوص مسلمان کی عزت و حرمت کے تصور کو جاننے کے لیے مزید کسی دلیل کی حاجت نہیں رہتی۔ کتنے تعجب کی بات ہے کہ خدا کے نزدیک ایک مسلمان کی عزت کعبۃ اللہ سے بھی بلند و برتر ہو۔ لیکن ہماری سوچ کا عالم یہ ہو کہ ہم کعبے کی عزت تو جانِ ایمان سمجھتے ہیں۔ مگر ایک مسلمان کی عزت ہمارے نزدیک دو کوڑی سے بھی زیادہ ارزاں ہے۔ ہمارے مزاجِ ایمانی میں کس قدر عدمِ توازن پیدا ہو چکا ہے کہ ایک طرف تو ہم کعبے کی سمت پشت نہیں کرتے اور کسی بھی خطۂ زمین میں رہتے ہوئے ہم کعبے کی طرف منہ کر کے تھوکتے تک نہیں۔ اس طرف پاؤں کر کے لیٹتے تک نہیں اور یہ بلا شک و شبہ تکریمِ کعبہ کا صحیح تقاضا ہے۔ مگر دوسری طرف ہم مسلمان ہو کر خونخوار بھیڑیئے کی طرح مسلمان ہی کے خون سے اپنا منہ رنگ رہے ہیں۔ اس کی عزت و آبرو کو لوٹنا ہمارا شعار بن چکا ہے۔ اس کے مال کو دھوکہ و فریب سے ہضم کرنا ہمارا معمول بن چکا ہے اور ہم نے عزت و حرمت کا معیار بجائے تکریمِ انسانیت کے پیسہ و دولت کو بنالیا ہے۔ غریب کسی عزت کا مستحق نہیں۔ کمزور و ناتواں کسی تکریم کا حقدار نہیں۔ جو شخص جتنا بڑا فرعون ہے۔ اسی قدر قدر و منزلت کا سزاوار

ہے۔ جو شخص جتنا بڑا قارون ہے اسی قدر عزت و حرمت کا حقدار ہے۔

خدارا سوچئے! ہم کس قدر تباہی و بربادی کی طرف بڑھتے جا رہے ہیں۔ یہ تفریقِ بے کرام جو تذلیلِ انسانیت کا باعث ہو رہی ہے۔ ہماری ہلاکت اور ذلت و رسوائی کے سوا کچھ نہیں۔ لوٹ آئیے پھر اسلام کے انقلابی پیغام کی طرف، ہر شخص کو شرف و تکریم کی نگاہ سے دیکھئے۔ انسانیت ذلت کی نہیں عزت کی سزاوار ہے۔ اپنے اُوپر سے منافقت کا پردہ ہٹا دیجئے۔ جس کی وجہ سے ہر شخص اسلام اور دینِ حق کا نام بھی لیتا ہے اور اسلام کی تعلیمات کے خلاف کھُلی بغاوت کا مرتکب بھی ہوتا ہے۔ جب تک انسان کے خلاف انسان کی سازش اور مسلمان کے خلاف مسلمان کا دجل و فریب اور ظلم و استحصال ختم نہیں ہو جاتا۔ ہم دینِ محمدیؐ کے دشمن ہیں۔ خواہ لاکھ مرتبہ ظاہراً وفاداری کا دم بھرتے رہیں۔

۱۲۔ حضور علیہ السلام نے فرمایا۔

| | |
|---|---|
| کل المسلم علی المسلم حرام دمہٗ ومالہٗ وعرضہٗ | ہر مسلمان پر مسلمان کا خون، مال اور عزت و آبرو حرام ہے۔ |

(رواہ ابوہریرہؓ، ابن ماجہ)

۱۳۔ ایک اور مقام پر تاجدارِ کائنات صلے اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔

| | |
|---|---|
| المؤمن من آمنہ الناس علی اموالھم وانفسھم | مومن وہ ہے جس سے لوگ اپنی جان و مال کے لحاظ سے امن پائیں۔ |

(ابن ماجہ)

اسلام کا اجتماعی نصب العین جس انقلابی اور عالمگیر معاشرے کی تشکیل ہے وہ سب سے پہلے اس تصور پر قائم ہوتا ہے کہ تمام انسان ایک وحدت ہیں۔ ہر ایک کی عزت و تکریم یکساں ہے اور کسی کو کسی پر سوائے تقویٰ و پرہیزگاری کے کوئی نسلی،

رسانی یا گروہی تفوق حاصل نہیں ۔ جب پورے معاشرے کی بنیاد انسانی تکریم کے تصور پر قائم ہو جائے تو معاشرے کے افراد کے درمیان باہمی محبت و مودت، نفع بخشی وفیض رسانی اور ایثار و احسان کے جذبے کا موجزن ہونا بھی امرِ طبعی قرار پا جاتا ہے اور اجتماعی زندگی کا وہی نقشہ سامنے آجاتا ہے جو عہدِ رسالت مآب صلے اللہ علیہ وسلم اور عہدِ صحابہؓ میں واقعۃً موجود تھا۔

## ۲۔ ذاتِ مصطفوی صلی اللہ علیہ وسلم سے غیر مشروط دائمی وفاداری اور شائبہ شرک فی النبوۃ کا انقطاع

اسلام جس انقلابی معاشرے کی تاسیس و تعمیر کو قومی نصب العین قرار دیتا ہے۔ اس کی بنا ئے استحکام ذاتِ مصطفویؐ سے ایسی غیر مشروط اور مخلصانہ دائمی وفاداری ہے جس میں شرک فی النبوۃ کا کوئی شائبہ باقی نہ رہے ۔ یعنی اس معاشرے کے افراد کا آنحضرتؐ کی رسالت وحاکمیت پر ایسا غیر متزلزل ایمان اور آپ کی قیادت و سیادت پر ایسا واثق، حتمی اور قطعی اعتماد ہو کہ قومی جدوجہد میں ابدالآباد تک کسی اور کی اطاعت و اتباع کی گنجائش باقی نہ رہے ۔ حیاتِ قومی کے سیاسی، معاشی، مذہبی، تعلیمی، تہذیبی اور معاشرتی الغرض کسی بھی گوشہ میں اور فکر و عمل کے کسی بھی درجہ میں کوئی شخص آپ کا ہمسر و ثانی قرار نہ پا سکے ۔ پورے معاشرے کی اجتماعی اور انفرادی وفاداریوں کا مرکز حضورؐ کی ذاتِ ستودہ صفات ہو ۔ کسی بھی فرد کو من حیث الفرد اور معاشرے کو من حیث المجموع جناب رسالتِ مآبؐ کے متعین کردہ راستے سے انحراف کا کوئی حق نہ ہو ۔ معاشرے کی جدوجہد کا معیارِ صحت اور نظامِ فکر و عمل کا معیارِ حقانیت ارشادِ نبوی صلے اللہ علیہ وسلم ہو ۔ لوگ نسبتِ مصطفویؐ سے حق کو پہچانیں اور اسی نسبت سے باطل کو ۔ یہاں تک کہ ذاتِ باری تعالیٰ کی معرفت اور اس کی رسائی بھی اسی

راستے سے ہو۔ اگر فکری و عملی سطح پر پورے معاشرے کو یکجہتی و استحکام غلامیِ رسالت مآب صلے اللہ علیہ وسلم کے حوالے سے نصیب ہو تو شرک فی النبوۃ کا کوئی شائبہ باقی نہیں رہتا۔ درج ذیل قرآنی آیات مذکورہ بالا حقیقت کی وضاحت کرتی ہیں۔

| | |
|---|---|
| ۱۔ وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَّلَا مُؤْمِنَةٍ اِذَا قَضَى اللّٰهُ وَ رَسُوْلُهٗٓ اَمْرًا اَنْ يَّكُوْنَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ مِنْ اَمْرِهِمْ (الاحزاب، ۳۶) | کسی صاحب ایمان مرد و عورت کو یہ حق حاصل نہیں کہ خدا اور اس کا رسول کوئی فیصلہ صادر فرمادیں تو ان کے لیے اس مسئلے میں کوئی اختیار باقی رہے۔ |

۲۔ ذاتِ مصطفوی سے غیر مشروط وفاداری کا حکم ایک اور مقام پر یوں درج ہے کہ اس سے گریز منافقت قرار دی گئی ہے خواہ وہ شخص احکامِ الٰہیہ کی پابندی کا جس قدر بھی دم بھرتا رہے۔ ارشادِ باری تعالےٰ ہے :۔

| | |
|---|---|
| وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ تَعَالَوْا اِلٰى مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ وَاِلَى الرَّسُوْلِ رَاَيْتَ الْمُنٰفِقِيْنَ يَصُدُّوْنَ عَنْكَ صُدُوْدًا (النساء، ۶۱) | اور جب ان سے کہا جائے کہ اللہ اور رسولؐ کی طرف آؤ، تو آپ دیکھتے ہیں کہ منافقین آپ کی بارگاہ میں سر نیاز خم کرنے سے گریز کرتے ہیں۔ |

اس آیت کریمہ نے یہ حقیقت واضح کردی کہ غلامیِ رسولؐ کے بغیر اطاعتِ الٰہیہ کا دم بھرنا منافقت ہے۔ ایمان کی صحت کی علامت یہ ہے کہ انسان باری تعالےٰ سے اپنی نسبت غلامی و اطاعتِ رسولؐ کے ذریعے قائم کرے۔ اس کے بغیر ایمان کے نام پر کی جانے والی ہر کوشش بے سُود اور بے نتیجہ ہے :۔

۳۔ اس امر کی تصریح یوں کی گئی ہے :۔

| | |
|---|---|
| قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ | فرما دیجئے ! اگر تم اللہ سے محبت کا دم |

فَاتَّبِعُوْنِیْ یُحْبِبْکُمُ اللّٰہُ (آلِ عمران ۳۱) — پھر تے ہو تو میری اتباع کرو (اس کے نتیجے میں) اللہ تمہیں اپنا محبوب بنالیگا۔

گویا خدا کا محبوب و مقرب ہونا اس امر پہ منحصر ہے کہ وہ بندہ کس قدر غلامیٔ رسول صلے اللہ علیہ وسلم کے زیور سے آراستہ ہے۔

ذاتِ مصطفویؐ سے مسلمانوں کی غیر مشروط وفاداری کی اہمیت کا اندازہ اس سے بخوبی لگایا جا سکتا ہے کہ باری تعالیٰ اپنے فیضان و عطا کا مقصد و منتہا رضائے محمدی صلی اللہ علیہ وسلم کو قرار دیتے ہیں۔ ارشادِ ایزدی ہے :۔

وَلَسَوْفَ یُعْطِیْکَ رَبُّکَ فَتَرْضٰی (الضحیٰ ۵) — اور عنقریب آپ کا رب آپؐ اسقدر عطاؤں سے نوازے گا کہ آپ راضی ہو جائیں گے۔

اگر خالقِ کائنات اپنی عطاؤں کی غایت نبی اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کی رضا کو قرار دیتا ہے تو یہ حکم مسلمانوں کے لیے حضور علیہ السلام کی ذاتِ مقدسہ سے اتنی اور مخلصانہ وفاداری کی صورت میں فرض کیوں نہیں قرار پائے گا۔

۵۔ ہجرتِ مدینہ کے بعد کم و بیش ڈیڑھ سال تک بیت المقدس کی سمت کو قبلہ قرار دیئے رکھنے کے بعد آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے دل میں یہ خواہش پیدا ہوئی کہ بیت المقدس کی بجائے کعبۃ اللہ کو قبلہ قرار دیا جائے۔ باری تعالیٰ نے حضور علیہ السلام کی اس آرزو کا خیال فرماتے ہوئے ارشاد فرمایا :۔

فَلَنُوَلِّیَنَّکَ قِبْلَۃً تَرْضٰھَا (البقرہ ۱۴۴) — پس ہم آپ کا رُخِ زیبا اسی قبلہ کی طرف پھیر دیں گے جو آپ چاہتے ہیں۔

چنانچہ آپ کی حسبِ خواہش قبلہ کی سمت کو بدل دیا گیا۔ ذرا غور فرمائیں جب کعبہ، جو پورے عالمِ اسلام کی مرکزیت، وحدت، یکجہتی اور مذہبی

استحکام کی بنیاد اور علامت ہے۔ رضائے مصطفویؐ کے مطابق مقرر کیا گیا تاکہ یہ حقیقت روزِ روشن کی طرح عیاں ہو جائے کہ ذاتِ محمدی صلے اللہ علیہ وسلم سے وفاداری اور رضائے مصطفویؐ کی پیروی ہی بنائے اسلام ہے تو اسلامی معاشرے کی بنائے استحکام خالصتاً اسی تصوّر پر مبنی کیوں نہ قرار دی جاتی۔

۶۔ اسلام میں تو کلامِ الٰہی پر ایمان کی سند اور بنیاد بھی نسبتِ نبوی صلے اللہ علیہ وسلم ہی ہے۔ قرآنِ حکیم میں اہلِ ایمان کی علامت یوں بیان کی گئی ہے :۔

| | |
|---|---|
| وَآمَنُوا بِمَا نُزِّلَ عَلَىٰ مُحَمَّدٍ وَهُوَ الْحَقُّ مِن رَّبِّهِمْ (محمدؐ ، ۲) | اور وہ اس پر ایمان لائے جو کچھ محمدؐ صلے اللہ علیہ وسلم پر نازل کیا گیا تھا۔ اور وہی ان کے رب کی طرف سے حق ہے |

نبی اکرم صلے اللہ علیہ وسلم سے ایسی مخلصانہ اور غیر مشروط وفاداری چونکہ ہر فرد کی علامتِ ایمان اور اسلامی معاشرے کی بنائے استحکام ہے۔ اس لیے ابدالآباد تک اسی حکم کو قائم و دائم رکھا گیا اور انسانیت کو نئے پیغمبر کی بعثت سے ہمیشہ کے لیے بے نیاز کر دیا گیا تاکہ قیامت تک اُمّتِ مسلمہ کی وفاداری منقسم نہ ہو سکے اور صرف نبوّت و قیادتِ محمدی صلے اللہ علیہ وسلم سے ہی وابستہ رہے۔

۷۔ یہی تصوّر عقیدہ ختمِ نبوّت کہلاتا ہے۔ جس کا صریح حکم ان الفاظ میں وارد کیا گیا ہے :۔

| | |
|---|---|
| مَا كَانَ مُحَمَّدٌ أَبَا أَحَدٍ مِّن رِّجَالِكُمْ وَلَٰكِن رَّسُولَ اللَّهِ وَخَاتَمَ النَّبِيِّينَ (احزاب ، ۴۰) | محمد صلے اللہ علیہ وسلم تم میں سے کسی مرد کے باپ نہیں ہیں بلکہ وہ خدا کے رسول اور سب سے آخری نبی ہیں۔ |

حضور علیہ السلام پر سلسلہ نبوّت کے ختم کیے جانے کا مقصد بھی یہی ہے کہ

اب قیامت تک ہر دور میں اسلامی معاشرہ رسالتِ محمدی صلے اللہ علیہ وسلم کی حاکمیت کے تابع ہوگا اور خلافتِ اسلامیہ ہمیشہ نیابتِ محمدی صلے اللہ علیہ وسلم کی آئینہ دار ہوگی۔

۸۔ اس امر کا اعلان سیدنا صدیقِ اکبرؓ نے تختِ خلافت پر متمکن ہوتے ہی فرما دیا۔ علامہ ابنِ خلدون بیان کرتے ہیں :۔

وقد نهى ابو بكرؓ لما دعى به وقال لست خليفة الله ولكنى خليفة رسول الله صلى الله عليه وسلم

جب حضرت ابوبکرؓ کو "خلیفۃ اللہ" کہہ کر پکارا گیا تو آپ نے منع فرما دیا اور کہا۔ میں "خلیفۃ اللہ" نہیں بلکہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا خلیفہ و نائب ہوں۔

(مقدمہ، ۱۳۴)

چنانچہ تاریخ شاہد ہے کہ آپ کو تمام صحابہ و مسلمین ہمیشہ "خلیفہ رسول اللہ" کے لقب سے پکارتے رہے۔ طبرانی، حاکم اور ابن عساکر بیان کرتے ہیں :۔

انّ ابا بكرؓ كان يكتب من ابى بكرؓ خليفة رسول الله صلى الله عليه وسلم

بے شک حضرت ابوبکرؓ خطوط یا حکمنامہ وغیرہ لکھتے ہوئے یہ الفاظ تحریر کرتے تھے۔ ابی بکرؓ، رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے خلیفے کی طرف سے۔

حقیقت یہ ہے کہ اسلامی حکومت کو "خلافت" اور اس کے سربراہ کو "خلیفہ" کہنا بھی حاکمیت محمدی صلے اللہ علیہ وسلم کا اعلان و اظہار ہے جس کی نیابت اسلامی حکومت اور اس کے سربراہ کو حاصل ہوتی ہے۔ ابنِ خلدون اسی امر کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں :۔

وَامّا تسمية خليفة فلكونه يخلف النبى فى اُمته فيقال

اور خلیفہ کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ وہ نبی صلے اللہ علیہ وسلم کی امت میں آپ کی

خلیفہ باطلاق و خلیفہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم (مقدمہ: ۱۳۴)

نیابت کا فریضہ سرانجام دیتا ہے۔ اس لیے وہ خلیفہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہوتا ہے لیکن عام استعمال میں اسے صرف خلیفہ کہتے ہیں۔

دوسرے مقام پر وہ اسلامی حکومت کی حیثیت واضح کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

وانہ نیابۃ عن صاحب الشریعۃ فی حفظ الدین و سیاسۃ الدنیا بہ تسمیٰ خلافۃ و امامۃ والقائم بہ خلیفۃ و امام (مقدمہ ۱۳۴، ۱۵۳)

اسلامی حکومت دین و دنیا کی حفاظت و سیاست کے معاملے میں صاحبِ شریعت صلے اللہ علیہ وسلم کی نیابت کا نام ہے۔ اس لیے اسے خلافت و امامت کہتے ہیں اور اس کے قائم کرنے والے کو خلیفہ و امام۔

خلافتِ اسلامیہ کے معنی و مفہوم کی نسبت مذکورہ بالا تصریحات کے ذریعے یہ حقیقت مزید اُجاگر ہوگئی ہے کہ اسلامی ریاست اور اسلامی حکومت کا وجود ہی نبی اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کی نیابت اور آپ کی حاکمیت سے غیر مشروط وفاداری سے عبارت ہے۔ اس کے بغیر اسلام میں تصورِ خلافت کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہتی۔ خلافت نام ہی اس حقیقت کے اعلان کا ہے کہ یہ معاشرہ، حکومت اور ریاست، جملہ آئینی و قانونی، مذہبی و سیاسی اور معاشی و معاشرتی اُمور میں رسالت و حاکمیتِ مصطفوی صلے اللہ علیہ وسلم سے غیر مشروط وفاداری اور علی الاطلاق اطاعت و نیابت پر مبنی ہے۔

کائنات پر ذاتِ باری تعالےٰ کی حاکمیت اور اقتدارِ اعلےٰ کا تصور جو اسلام کا اساسی عقیدہ ہے۔ نبی اکرمؐ کی حاکمیت ہی کے ذریعے ریاستی سطح پر آئینی

اور سیاسی تشخص حاصل کرتا ہے۔ اگر حاکمیتِ نبوی کا اعتراف نہ ہو تو حاکمیتِ الٰہیہ کا تصور محض مابعد الطبیعی عقیدے تک محدود رہے گا اور اسے سیاسی و دستوری وجود نہ مل سکے گا۔ کیونکہ ریاست اور معاشرۂ انسانی میں حاکم اور محکوم دونوں کا انسان ہونا ضروری ہے تاکہ محکوم عادۃً حاکم کی پیروی (HABITUAL OBEDIENCE) کر سکے۔ اس لیے باری تعالےٰ نے اپنی اطاعت کی واحد صورت اطاعت و اتباعِ محمدی صلے اللہ علیہ وسلم مقرر فرمائی ہے اور یہ مسلّم حقیقت ہے کہ اتباعِ رسول کے بغیر نہ خدا کی حاکمیت کا اور نہ اس کی اطاعت کا کوئی اعتراف ممکن ہے۔ لہٰذا اطاعتِ نبویؐ کا عین اطاعتِ الٰہیہ ہونا حاکمیتِ مصطفوی صلے اللہ علیہ وسلم کے عین حاکمیتِ الٰہیہ ہونے پر دلالت کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلامی معاشرے کا نبی اکرمؐ کی ذاتِ گرامی سے غیر مشروط وفاداری پر مبنی ہونا درکار ہے۔ کیونکہ یہ از خود ذاتِ باری تعالےٰ سے وفاداری کا اعلان بھی ہے۔

۹۔ بنا بریں قرآنِ مجید میں ارشاد فرمایا گیا :۔

فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُوْنَ حَتّٰى يُحَكِّمُوْكَ فِيْمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوْا فِیْٓ اَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا

(النسار، ۶۵)

پس ہرگز نہیں، آپ کے رب کی قسم لوگ اس وقت تک صاحبِ ایمان نہیں ہو سکتے جب تک وہ اپنے تمام نزاعی معاملات میں آپ کی حکمیت اور حاکمیت کو تسلیم نہ کریں۔ پھر آپ کے صادر شدہ حکم سے اپنے دل میں کوئی تنگی محسوس نہ کریں اور اس کے سامنے اس طرح سرِ نیاز خم کردیں جیسے اس کا حق ہوتا ہے۔

اس آیت کریمہ کے ذریعے حضور علیہ السلام کا حَکَم ہونا تسلیم کیا جائے یا حاکم ہونا، ایک ہی

بات ہے کیونکہ دونوں حیثیتیں اصلاً ایک ہی چیز ہیں ۔"یعنی جس کا حکم آخری سند ہو اور اس سے انحراف نہ کیا جا سکے"۔ اس لیے باری تعالیٰ نے جہاں بھی اپنی اس حیثیت کا ذکر فرمایا نبی اکرمؐ کی اسی حیثیت کو ہمیشہ متصلاً بیان کیا ۔ دونوں میں کوئی فرق و امتیاز روا نہیں رکھا ۔

۱۰۔ ارشاد فرمایا گیا ہے :۔

فَإِنْ تَنَازَعْتُمْ فِي شَيْءٍ فَرُدُّوهُ إِلَى اللَّهِ وَالرَّسُولِ (النساء ۵۹)

اگر کسی مسئلے میں تمہارا اختلاف پیدا ہو جائے تو اسے اللہ جل مجدہٗ اور رسول صلے اللہ علیہ وسلم کی طرف لوٹا دو۔

۱۱۔ حکمِ رسولؐ سے کامل وفاداری کے معیار کا اندازہ اس واقعہ سے ہو سکتا ہے جس کو ابن ابی حاتم، ابن مردویہ اور حافظ ابو اسحاق وغیرہم نے روایت کیا ہے کہ دو اشخاص اپنا متنازعہ معاملہ لے کر بارگہِ نبوی صلے اللہ علیہ وسلم میں حاضر ہوتے ۔ حضورؐ نے ایک کے حق میں فیصلہ فرما دیا ۔ دوسرے شخص نے اس فیصلے سے انکار کرتے ہوئے فریقِ ثانی سے کہا کہ ہم حضرت ابوبکرؓ کے پاس چلتے ہیں ۔ جب دونوں ان کے پاس پہنچے تو اس شخص نے جس کے حق میں آنحضرتؐ فیصلہ فرما چکے تھے حضرت ابوبکرؓ کو حضورؐ کے فیصلے سے مطلع کر دیا ۔ اس پر حضرت ابوبکرؓ نے کہا ۔ جو فیصلہ حضورؐ نے فرما دیا ہے وہی باقی رہے گا ۔ اس شخص نے پھر حضرت عمرؓ کے پاس چلنے کو کہا ۔ جب وہ ان کے پاس پہنچے تو انہیں بھی حضور علیہ السلام کے فیصلے سے مطلع کر دیا گیا ۔ حدیث کے الفاظ ملاحظہ ہوں :۔

فقال المقضی لهٗ قد اختصمنا الی النبی صلی اللہ علیہ وسلم فقضٰی لی علیه فابٰی ان یرضٰی

جس کے حق میں فیصلہ کیا گیا تھا ۔ اس نے بتایا کہ ہم اپنا جھگڑا نبی اکرمؐ کے پاس لے گئے تھے پس حضورؐ نے اس کے خلاف

فسألهٗ عمر بن الخطاب فقال كذالك فدخل عمر منزله وخرج والسيف فى يده قد سله فضرب راس الذى ابٰى ان يرضٰى فقتلهٗ فانزل الله (فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُوْنَ حَتّٰى يُحَكِّمُوْكَ فِيْمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ)

(تفسیر ابنِ کثیر، جلد ۱، ۵۲۱)

اور میرے حق میں فیصلہ فرمایا۔ لیکن اس نے تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ حضرت عمرؓ نے یہی بات دوسرے شخص سے دریافت فرمائی۔ اس نے اقرار کیا۔ اس پر حضرت عمرؓ اپنے گھر میں داخل ہوئے اور تلوار لے آئے، اسے حضورؐ کے فیصلے سے انکار کرنے والے کے سر پہ مارا اور قتل کر دیا۔ اسی موقع پر یہ آیت نازل ہو گئی ـــ "ہرگز نہیں آپ کے رب کی قسم جب تک لوگ آپ کو اپنے نزاعی امور میں قطعی طور پر حاکم نہ مان لیں وہ صاحبِ ایمان نہیں ہو سکتے۔

۱۲- اہلِ ایمان کی آنحضرتؐ کے ساتھ وفاداری کا یہ عالم تھا کہ ایک مرتبہ حضور علیہ السلام نے ایک شخص کے ہاتھ میں سونے کی انگوٹھی دیکھی اور فرمایا۔ کیا تم اپنے ہاتھ میں دوزخ کی آگ کی چنگاری دیکھنا چاہتے ہو؟ اس نے کہا نہیں۔ اس پر آنحضرتؐ نے اس کے ہاتھ سے انگوٹھی اُتار کر پھینک دی۔ حضور علیہ السلام کے تشریف لے جانے کے بعد جب وہ بھی مجلس سے اٹھ کر جانے لگا تو بعض دیگر اشخاص نے کہا۔ اگر تم چاہو تو یہ انگوٹھی لے جا کر کسی خاتون کو پہنا سکتے ہو۔ کیونکہ سونے کا زیور صرف مرد کے لیے حرام ہے۔ لیکن اس نے جواب دیا۔ "جس انگوٹھی کو حضورؐ نے اُتار کر پھینک دیا ہے۔ میں اس کو اٹھانے والا کون ہوں؟" گویا اس کے ایمان کا تقاضا یہ تھا کہ اس کی نفرت و محبت کا معیار بھی آنحضرتؐ کی پسند اور ناپسند قرار پا گئی تھی۔ لہٰذا وہ

اسلامی معاشرہ جس کا قیام اسلام کا اجتماعی نصب العین ہے۔ اس تصور پر قائم ہوتا ہے کہ اس کا سارا فکر وعمل کا ڈھانچہ ذاتِ مصطفویؐ سے غیر مشروط وفاداری پر استوار ہو۔۔۔ اس موضوع پر قرآن وحدیث کے مزید ارشادات "حصولِ نصب العین کی جدوجہد کے نمونۂ کمال" کے عنوان سے ملاحظہ فرمائیں۔

## ۳۔ ادائیگی فرائض اور ایتائے حقوق کے نظام کا قیام

اس معاشرے کے افراد اس طرح روحانی الذہن ہوں کہ ان کی تمام تر جدوجہد میں محرکِ عمل محض رضائے الٰہی کی جستجو ہو اور اساسِ عمل مطالبۂ حقوق کے بجائے ایتائے حقوق ہو تاکہ معاشرے کا کوئی فرد بھی محرومی کا شکار نہ ہونے پائے۔ اسلام کا اجتماعی نصب العین جس صالح اور مثالی انقلابی معاشرے کا قیام ہے۔ اس کے افراد کی تیسری خصوصیت یہ ہے کہ ان کی سوچ کا پیمانہ مادی نہیں روحانی ہوتا ہے۔ ان کے روحانی الذہن ہونے کا معنیٰ یہ ہے کہ ان کی زندگی کی تمام جدوجہد میں اصل محرک اللہ تعالیٰ کی رضا کا حصول ہو۔ وہ اپنا ہر کام بجائے دنیوی منافع اور مادی حرص ولالچ کے صرف رضائے الٰہی کی نیت سے کرتے ہوں۔ وہ کسی سے دوستی کریں تو حکمِ الٰہی کی تعمیل میں اور کسی سے دشمنی کریں تو بھی باری تعالیٰ ہی کی خاطر۔ وہ کسی سے بھلائی کریں تو اس خیال سے نہیں کرتے کہ دوسرا شخص ان کا احسان مند ہو یا اس سے انہیں جواباً کسی منفعت کے حاصل ہونے کی اُمید ہوتی ہے بلکہ اس خیال سے کرتے ہیں کہ یہ ان کا فرض ہے۔ جس کی ادائیگی ان کے ذمے ہے اور اسی میں ان کے رب کی رضا اور خوشنودی ہے۔ اس امر کی وضاحت اس آیت قرآنی سے ہوجاتی ہے۔ جس کے الفاظ یہ ہیں:۔

إِنَّمَا نُطْعِمُكُمْ لِوَجْهِ اللَّهِ — ہم تو تمہیں صرف رضائے الٰہی کے

لَا نُرِيْدُ مِنْكُمْ جَزَآءً وَّلَا شُكُوْرًا (الدہر، ۹)

لیے کھانا کھلاتے ہیں۔ ہم تم سے نہ اس کا کوئی بدلہ چاہتے ہیں، نہ تمہاری احسانمندی اور شکر گزاری۔

گویا روحانی الذہن افراد سے مراد وہ انقلابی سوچ رکھنے والے لوگ ہیں جو ہر ایک سے بھلائی کرتے ہیں۔ لیکن کسی سے صلے کی اُمید نہیں رکھتے۔ صلہ اور جزا صرف اپنے رب سے طلب کرتے ہیں اور وہ بھی اس کی رضا کی صورت میں، آخرت کی دیگر نعمتیں بھی انہیں اس قدر عزیز نہیں ہوتیں جتنی کہ انہیں اپنے رب کی رضا اور خوشنودی۔ ان کے نزدیک ہر عمل کی صحت یا عدم صحت اور ان کی کوششوں کی قبولیت یا عدم قبولیت کا معیار ہی خدا کا حکم اور اس کی رضا قرار پاجاتا ہے۔ قرآنِ حکیم میں صحابہ کرام کے حوالے سے اس حقیقت کی واضح نشاندہی موجود ہے:۔

مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗٓ اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ تَرٰهُمْ رُكَّعًا سُجَّدًا يَّبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانًا

(الحجرات، ۲۹)

محمد صلے اللہ علیہ وسلم، اللہ کے رسول ہیں اور جن افراد نے حضور علیہ السلام کی صحبت و معیت سے فیض پایا۔ وہ کافروں پر سخت ہیں۔ آپس میں نہایت مہربان ہیں آپ انہیں رکوع و سجود کی حالت میں دیکھیں گے۔ وہ (ہر وقت۔ کافروں کی دشمنی میں، مومنوں کی دوستی میں اور رکوع و سجود میں (الغرض ہر کام میں) اللہ تعالےٰ کے فضل اور اس کی رضا و خوشنودی کی تلاش کرتے رہتے ہیں۔

گویا ان کی پوری زندگی کی حرکت ہی رضائے الٰہی کی جستجو میں ہوتی ہے۔ یہی ان کا مقصدِ حیات اور ہر کام کی غایتِ اولیٰ ہے۔ خود باری تعالےٰ اس امر کی شہادت

قرآنِ مجید میں یوں پیش فرماتے ہیں :-

| | |
|---|---|
| مَا لِاَحَدٍ عِنْدَهٗ مِنْ نِّعْمَةٍ تُجْزٰٓى ۝ اِلَّا ابْتِغَآءَ وَجْهِ رَبِّهِ الْاَعْلٰى ۝ وَلَسَوْفَ يَرْضٰى (الیل، ۱۹، ۲۱) | اس پر کسی کا کوئی احسان نہیں جس کا اس نے بدلہ چکایا ہو، بلکہ اس نے (یہ کام) محض اپنے ربِ عظیم کی رضا اور خوشنودی کی خاطر کیا ہے اور یقیناً اس کا رب اس سے راضی ہو جائے گا۔ |

قرآنِ کریم اس حقیقت کو صراحت کے ساتھ بیان کر رہا ہے کہ وہ اہلِ ایمان جو رُوحانی الذہن ہوتے ہیں۔ کسی پر بھی بدلہ و جزا کے خیال سے احسان نہیں کرتے بلکہ خالصۃً رضائے الٰہی کی خاطر کرتے ہیں ۔ پھر یہ کہ بندے کا خدا کی رضا کا طلبگار ہونا اس امر کی بھی دلیل ہے کہ خدا اپنے بندے سے راضی ہے اور بندے کا خدا سے محبت کرنا اس بات کی شہادت ہے کہ خدا اپنے بندے سے محبت کرتا ہے ۔ چنانچہ ایسے افراد پر مشتمل قوم اور معاشرے کی علامات قرآن یوں بیان کرتا ہے۔

| | |
|---|---|
| وَيُحِبُّوْنَهٗٓ اَذِلَّةٍ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اَعِزَّةٍ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ يُجَاهِدُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَلَا يَخَافُوْنَ لَوْمَةَ لَآئِمٍ ؕ ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ (المائدہ، ۵۴) | پس عنقریب اللہ تعالےٰ ایسی قوم کو لے آئیگا۔ جس کے افراد سے اللہ محبت کریگا (یعنی ان کی رضا چاہے گا) اور وہ اللہ سے محبت کریں گے۔ (یعنی اس کی رضا کے طلبگار ہوں گے) جو مومنوں پر نرم اور کافروں پر سخت ہوں گے۔ جو غلبۂ دینِ حق کی خاطر راہِ خدا میں جہاد کریں گے اور کسی بھی طعن و |

تشنیع کرنے والے کی طعن و ملامت سے نہیں گھبرائیں گے ۔ یہ خدا کا فضل ہے جسے چاہے اسے نواز دے ۔ اللہ تعالیٰ صاحبِ وسعت اور صاحب علم ہے ۔

اس موضوع پر تفصیلی گفتگو پہلے ہو چکی ہے ۔ "انفرادی زندگی کے نصب العین" کے عنوان کے تحت ملاحظہ فرمائیے ۔ " اخلاقِ کمال کی اعلیٰ ترین صورت رضائے الٰہی کے حصول کا موضوع" ۔ جب معاشرتی زندگی کو عمل جدوجہد کا محرک اس تصور سے فراہم ہو رہا ہو تو پھر صاف ظاہر ہے کہ کسی شخص کو اپنے حقوق کے حصول کے لیے نہ کسی مطالبے کی ضرورت رہتی ہے اور نہ تگ و دو کی ۔ ہر شخص دوسرے کا حق ادا کرنا اپنا اوّلین فریضہ سمجھتا ہے اور جب ہر شخص اس فریضے کی ادائیگی یعنی ایتائے حقوق کے عمل پر مُصر ہو تو ہر دوسرے شخص کا حق از خود بتمام و کمال پورا ہونے لگتا ہے ۔

دنیا کے تمام غیر اسلامی معاشرے "مطالبۂ حقوق" (DEMAND OF RIGHTS) کے تصور پر قائم ہوتے ہیں ۔ اشتراکی معاشرے میں قومی جدوجہد کی بنیاد "اجتماعی حقوق کے مطالبے" پر قائم ہے ۔ جس سے انفرادی حقوق کی نفی ہوتی ہے ۔ اس طرح اجتماعی اور انفرادی حقوق کے درمیان تصادم کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے ۔ جسے اشتراکی فلسفہ صحیح طور پر رفع نہیں کر سکتا ۔ سرمایہ دارانہ معاشرے کی قومی جدوجہد کی بنیاد "انفرادی حقوق کے مطالبے" پر قائم ہے ۔ جس سے اجتماعی حقوق پر زد پڑتی ہے ۔ اس طرح اجتماعی اور انفرادی حقوق کے درمیان تصادم کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے جسے آج تک سرمایہ داریت یا انفرادی فلسفہ صحیح طور پر رفع نہیں کر سکا ۔ اشتمالی و اشتراکی معاشرہ ہو یا انفرادی و سرمایہ دارانہ ، افراد اور معاشرے کے حقوق باہم متغائر اور جدا جدا ہو جاتے ہیں ۔ دونوں میں یقیناً تصادم جنم لیتا ہے ۔ جسے ان دونوں فلسفوں کے ذریعے دور نہیں کیا جا سکتا ۔ اس کی بنیادی وجہ یہی ہے

کہ دونوں کی اساسِ عمل "مطالبۂ حقوق" ہے۔ مطالبے کی ضرورت اسی وقت پیش آتی ہے۔ جب کسی کا حق از خود ادا نہ ہو رہا ہو۔ لہٰذا جب اندریں صورت مطالبہ ہوتا ہے تو فریقین کے مفادات کے درمیان تصادم واقع ہو جاتا ہے۔ ہر کوئی اپنے حق کی ادائیگی کا مطالبہ کرتا ہے۔ نتیجتاً فرض کی ادائیگی نظر انداز ہو جاتی ہے۔ چنانچہ جب فرض ادا کئے بغیر حق مانگا جانے لگے تو معاشرے میں زوال اور انحطاط ہی پیدا ہوتا ہے۔ اس کی بہتری متوقع نہیں ہوتی۔ اس وقت ہم اس صورتحال میں گرفتار ہیں۔ ہم میں سے ہر شخص اپنے حقوق کی بات کرتا ہے لیکن اپنے فرائض کی ادائیگی کی طرف کوئی بھی متوجہ نہیں ہوتا۔ یہی اندازِ فکر مادی ہے اور ایسے افراد "مادی الذہن" کہلاتے ہیں۔ اس اندازِ فکر نے معاشرے کو ایسی زندگی عطا کر دی ہے کہ نہ تو فرائض ادا ہو رہے ہیں اور نہ کسی کو صحیح طور پر اس کا حق مل رہا ہے کیونکہ "فرض" اور "حق" دونوں مترادف حقیقتیں ہیں۔ ہر شخص کا فرض دوسرے کا حق ہوتا ہے۔ جب فرض ادا نہ ہو تو کسی کا حق اسے کیونکر ملے گا۔ اس صورتِ حال نے پورے معاشرے کے افراد کے اندر مجموعی طور پر "عدمِ تحفظ کا احساس" پیدا کر دیا ہے۔ جب حقوق ادا ہونے کا سامان نہ ہو تو ہر شخص خود کو معاشی اور عمرانی طور پر غیر محفوظ تصور کرنے لگتا ہے۔ اس وقت قومی سطح پر ہمارے اخلاقی انحراف کا سبب اور اصل علت اس قدر نفسانی تمرد نہیں جتنا کہ "معاشی اور عمرانی زندگی میں غیر محفوظ ہونے کا احساس" (SENSE OF INSECURITY) ہے۔ جب تک انفرادی اور اجتماعی زندگی میں یہ احساس کلیتہً رفع نہیں ہو جاتا۔ کسی بھی نظامِ حیات کے نفاذ سے اخلاقی انحراف کا رجحان ختم نہیں ہو سکتا۔ ہمارے معاشرے میں ہر شخص اپنے آپ کو معاشی اور عمرانی زندگی میں غیر محفوظ تصور کرتا ہے۔ کسی فرد کو اپنے جائز قانونی و اخلاقی حقوق اور مفادات از خود محفوظ نظر نہیں آتے اور فی الحقیقت کوئی انسان

معاشرتی زندگی بسر کرتے ہوئے اپنے جائز حقوق اور قانونی مفادات سے دستبردار ہو سکتا ہے ۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر انسانی زندگی کا تمام تر انحصار ان جائز حقوق کے حصول اور قانونی مفادات کے تحفظ پر ہو اور معاشرہ کسی سطح پر بھی کسی شخص کے حقوق اور مفادات کے صحیح تحفظ کا ضامن نہ ہو تو ہر شخص اخلاقی انحراف کا مرتکب نہیں ہوگا تو اور کیا ہوگا ۔ یہ اخلاقی انحراف دراصل ہر شخص کا "رویۂ خودغرضی" ہے ۔ ہر شخص اپنے جائز حقوق و مفادات کے تحفظ اور اپنی زندگی کی بقاو سالمیت کی ضمانت خودغرضی کے رویئے سے حاصل کرتا ہے ۔ حقیقت یہ ہے کہ آج ہر شخص کو "خودغرضانہ اور مفاد پرستانہ فکر و عمل" بالفعل زندگی کے ہر دائرے میں تحفظ مہیا کر رہے ہیں ۔ یہی سبب ہے کہ ہر فرد خودغرضی کے تنگ حصار میں پابند رہنے پر مجبور ہے ۔ اگر کوئی شخص رویۂ خودغرضی ترک کر دے اور اس کی زندگی کی جائز ضروریات تک پوری ہونے کی کوئی ضمانت نہ ہو تو وہ اپنے آپ کو اس غیر یقینی صورتِ حال میں کیونکر اور کہاں تک معلق رکھ سکتا ہے!

چنانچہ "رویۂ خودغرضی" جو دراصل اخلاقی انحراف کی اساسی صورت ہے اسی وقت ترک ہو سکتا ہے ۔ اگر اس کے علاوہ کوئی اور محرک موجود ہو جو جائز حقوق و مفادات کی عملی ضمانت اس سے بھی زیادہ قوی طریق پر مہیا کر دے ۔ یہ محرک موجودہ معاشی و عمرانی ڈھانچے میں بنیادی تبدیلی کے بغیر میسر نہیں آ سکتا ۔ اس وقت ہمارا معاشی اور عمرانی ڈھانچہ "مطالبہ حقوق (DEMAND OF RIGHTS)" کے تصور پر مبنی ہے ۔ اگر "مطالبہ حقوق" کے بجائے "ایفائے حقوق" اور "ادائیگی فرائض" اساسِ معیشت و معاشرت قرار پا جائیں ۔ ہر شخص اپنے حقوق طلب کرنے کے بجائے دوسروں کے حقوق ادا کرنے پر مامور اور مُصر ہو اور اسی فکر میں مگن ہو تو کسی شخص کے جائز حقوق و

مفادات محفوظ ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے۔

ایتائے حقوق کا تصور اگر ہر شخص کی انفرادی و اجتماعی زندگی میں اساسِ عمل ہو تو یہ تمام افراد کو ان کی بقا کی حتمی و قطعی ضمانت مہیا کر دے گا۔ جب ہر شخص کے حقوق ترکِ خود غرضی سے کما حقہٗ پورے ہو رہے ہوں تو کوئی بھی انسان خود غرضی اور مفاد پرستی کے ذریعے اپنے حقوق کے تحفظ کی خاطر دوسروں کو ان کے حقوق سے محروم نہ کرنے پائیگا۔ اس استحصالی عمل کا خاتمہ صرف اسی فطری طریق سے ممکن ہے ورنہ وعظ و تلقین یا محض حدود و تعزیرات کے نظام سے اسے ختم نہیں کیا جا سکتا۔ ذرا غور و فکر سے کام لیا جائے تو پورے سماج کا اجتماعی عمل ایک مربوط زنجیر کی طرح سامنے آجاتا ہے۔ جب ہر شخص کی معیشت غیر یقینی ہو اور وہ قوتِ یقین اپنی خود غرضی، مصلحت کوشی اور دسیسہ کاری سے حاصل کر رہا ہو تو یقیناً عمرانی زندگی میں غیر عادلانہ معیشت کا دور دورہ ہو گا۔ عیار اور مکار لوگ دجل و فریب کے ذریعے امیر سے امیر تر ہوتے جائیں گے۔ یہ ایک منطقی عمل ہے جس کی طرف علامہ اقبالؒ نے یوں اشارہ فرمایا ہے :-

مکر کی چالوں سے بازی لے گیا سرمایہ دار
انتہائے سادگی سے کھا گیا مزدور مات

نفسا نفسی کا یہ عالم معاشرتی زندگی میں سرمایہ و غربت کی بنا پر زبردست طبقاتی تقسیم کی دیوار تعمیر کر دیتا ہے۔ ایک ہیجان انگیز معاشی و عمرانی ناہمواری جنم لیتی ہے۔ اُمراء سرمایہ و دولت کی فراوانی کے باعث عیش کوشی، نشاط کاری اور سفلہ نوازی کے عادی ہو جاتے ہیں اور غرباء فقر و افلاس کے باعث ابتداءً اپنی ضروریاتِ زندگی کی تکمیل کے لیے فسق و فجور کی راہ اپناتے ہیں اور بعد ازاں دونوں طبقات مکمل طور پر ظلم و عصیان اور اخلاقی انحراف کو بطور وطیرۂ زندگی

اپنا لیتے ہیں۔ اُمراء سامانِ تعیش اور امورِ نشاط انگیزی کو عملاً اپنی بنیادی ضروریات کے دائرے میں شامل کر کے زندگی کا ایک معیار پیش کرتے ہیں۔ یہ عمل غریب طبقہ کو تباہی و ہلاکت کی ڈگر پر چلانے کا مزید محرک بنتا ہے۔ غریب طبقہ اپنے اور صاحبِ ثروت کے مابین اس فرق و امتیاز کو دیکھ کر ایک ذہنی اذیت محسوس کرتا ہے جو لاشعوری طور پر فرد کے دل و دماغ پر محیط ہو جاتی ہے۔ چنانچہ اس کرب و اذیت کی محیطی کیفیت سے نجات پانے اور خود کو نام نہاد عزت اور بھرم سے بہرہ ور کرنے کے لیے افلاس زدہ افراد اپنے خون پسینے سے دن بھر کی کمائی ہوئی قلیل دولت بھی بے جا خرچ کر دیتے ہیں۔ اس طرح پورا معاشرہ اخلاقی اقدار اور مذہبی فضائل کو پامال کرنے میں مصروف رہتا ہے۔ ہماری سوسائٹی کا مجموعی اخلاقی انحراف اسی منطقی عمل کا نتیجہ ہے۔ اگر نظامِ حکومت کی تبدیلی سے اخلاقی انحراف کو بالجبر دبا کر ختم کرنا مقصود ہو تو یہ کام فی الحقیقت صحیح انجام کو نہیں پہنچ سکے گا۔ معاشرے میں جب تک یہ صورتِ حال موجود ہے، ہزار کوششوں سے بھی مطلوبہ منزل حاصل نہیں ہو سکتی۔ یہاں ایک ایسا معاشی و عمرانی انقلاب درکار ہے۔ جس سے استحصالی، سامراجی اور فرسودہ نظام کا ڈھانچہ تہس نہس ہو جائے اور اخلاقی انحراف کے اسباب و محرکات کا قلع قمع ہو جائے۔ اگر جُرم کے اسباب و محرکات کا اندفاع ہو جائے تو وجودِ جرم از خود ختم ہو جائے گا۔ غیر یقینی معیشت، معاشرتی ناہمواری، احساسِ عدم تحفظ اور استحصالی طرزِ فکر و عمل، یہ وہ مہلک امراض ہیں جو ہمارے عمرانی ڈھانچے میں ناسُور کی مانند موجود ہیں اور اخلاقی انحراف کی اکثر صورتیں اعراض و علامات ہیں۔ مریض جس طرح جسمانی اعراض و علامات کو اصل مرض تصوّر کرتا ہے۔ اگر طبیب بھی اسی غلط تشخیص کو درست تصور کر کے علاج شروع کر دے تو مریض کی تباہی و موت کا سامان تو فراہم ہو سکتا ہے اس

کی اصلاح اور صحت مندی ممکن نہیں رہتی۔ چنانچہ کامل طبیب اصل مرض پر جو عموماً پوشیدہ ہوتی ہے، اپنی توجہ مرکوز کرکے اس کا علاج کرتا ہے تو اعراض و علامات از خود ختم ہوجاتی ہیں۔ اسی طرح جن افراد کے ہاتھوں میں قومی و ملی قیادت ہو۔ وہی قوم و ملت کے معالج ہیں۔ انہیں چاہیئے کہ اس ناسور پر توجہ کریں جو پورے معاشرتی جسم میں فساد انگیزی اور تخریب و تعفن کا سبب بن رہا ہے۔ یہی امر مطلوبہ نتائج کے حصول میں رکاوٹ ہے۔ شریعت میں سارق (چور) کی سزا قطع ید ہے۔ لیکن یہ حکم وضعی ہے تکلیفی نہیں۔ اگر محرکاتِ سرقہ کی نشاندہی کرکے ان کا خاتمہ نہ کیا جائے تو یہ شرعی حد مفید نتائج کے بجائے نفرت اور بیزاری پیدا کر دیتی ہے۔

پورے معاشرتی نظام کے مسئلے کو اسی پر قیاس کرنا ضروری اور لابدی ہے۔ کیونکہ معاشرتی سطح پر تمام اخلاقی رذائل اور جرائم کے پس منظر میں باقاعدہ طور پر کتنی محرکات اور موثرات کارفرما ہوتے ہیں۔ جن کی وجہ سے ہر برائی کو عملاً ایک طرح کا تحفظ اور استحکام مل رہا ہوتا ہے۔ یہی امور انفراداً اور اجتماعاً انسانی شخصیت کے اختلال و اضمحلال کا باعث ہوتے ہیں اور انہیں سے اخلاقی انحراف کو تقویت ملتی رہتی ہے۔

اگر ان موثراتِ اختلال اور محرکاتِ انحراف کی صحیح نشاندہی کرکے ان کا حتمی و قطعی تدارک نہ کیا جائے تو محض تعزیراتی نظام کی اپنی افادیت و برکت مطلوبہ نتائج پیدا نہیں کرسکتی۔ اگر جذباتی اندازِ فکر سے الگ ہوکر سوچا جائے تو اس میں اسلام کے تعزیراتی نظام کی فیوض و برکات کی (معاذ اللہ) نفی نہیں بلکہ "اسلام من حیث الکل" کی صحیح اہمیت مترشح ہوتی ہے۔ کیونکہ اسلام اپنا ایک جداگانہ جامع اور کامل ضابطۂ حیات رکھتا ہے۔ اگر کسی استحصالی اور فرسودہ نظام کے ڈھانچے میں اسلامی ضابطۂ حیات کے چند امور نافذ کرکے مطلوبہ منزل کے حصول کی توقع کی جائے

تو یہ عبث ہوگی - اس سے اسلام کی تغلیط نہیں بلکہ حکمِ الٰہی کی تائید ہوتی ہے :-

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا ادْخُلُوْا فِی السِّلْمِ كَآفَّةً (البقرۃ ۲۰۸) اے ایمان والو! اسلام میں (جزوی نہیں بلکہ) مکمل طور پر داخل ہو جاؤ۔

اس پوری خرابی کا علاج صرف اور صرف اسلام کے انقلابی فلسفے میں مضمر ہے وہ یہ کہ معاشرتی زندگی کی اساسِ عمل ہی بدل دی جائے - معاشرتی زندگی کی بنیاد بجائے "مطالبہ حقوق" کے تصور کے "ایتائے حقوق" یعنی "ادائیگی فرض" کے تصور پر رکھ دی جائے -

ہر شخص اپنے حق کا مطالبہ کرنے کے بجائے صرف اپنے فرض کی ادائیگی پر مامور ہو اور اس تصور کے پیچھے قانونی قوت ——(LEGAL SANCTION) موجود ہو - ہر شخص اپنے مقررہ اور معینہ فرض کو ادا کرنے پر مُصر ہو تو ہر ایک کا حق از خود ادا ہوتا رہے گا - کیونکہ اپنے فرض کو پورا کرنا درحقیقت دوسرے کا حق ادا کرنے کے مترادف ہے - والدین کا فرض ہے کہ بچوں کی اچھی تربیت کریں، اولاد کا فرض ہے کہ والدین کی عزت و خدمت کریں - خاوند کا فرض ہے کہ بیوی کو حُسنِ سلوک کے ساتھ ضروریات مہیا کرے - بیوی کا فرض ہے کہ خاوند کی اطاعت کرے، چھوٹے کا فرض ہے کہ بڑے کی توقیر کرے، بڑے کا فرض ہے کہ چھوٹے پر شفقت کرے، طاقت ور کا فرض ہے کہ کمزور کی مدد کرے اور امیر کا فرض ہے کہ غریب کا معاشی تعطّل دُور کرے - الغرض اگر ہر فرد صرف اپنے اپنے فرض کو پورا کرے تو کوئی وجہ نہیں کہ ہر دوسرے کا حق ادا نہ ہو - گویا اسلام جس معاشرے کی تشکیل چاہتا ہے - اس کے افراد دوسروں کے پاس اپنا حق مانگنے نہ جائیں - بلکہ دوسروں کے پاس چل کر ان کا حق دینے جائیں - اسی معاشرے کا نام "اسلامی معاشرہ" ہے - جس میں کسی کا دستِ سوال کسی کے سامنے نہ اُٹھے -

بلکہ دستِ عطا اُٹھے۔ مگر کوئی سائل نہ ہو۔ ہاتھ دینے کے لیے اُٹھے مگر لینے کے لیے دامن نہ ہو۔ اگر حقوق کی ادائیگی کا ایسا موثر نظامِ عمل میں لایا جائے تو یہی اسلام کے اجتماعی نصب العین کے حصول کی ضمانت ہے۔ افراد کو یہی زندگی عہدِ خلافتِ راشدہ میں واقعتہً میسّر آئی تھی جسے عمر بن عبدالعزیزؒ نے اپنے دور میں دہرا کر خود کو خلیفۂ راشد ثابت کر دیا تھا۔

یہی ایک صورت ہے۔ جس سے معاشرے کے تمام افراد کو "محرومی" سے بچایا جا سکتا ہے۔ اگر افراد کی زندگیوں میں یہ اساسِ عمل میسّر نہ آئے تو کوئی بھی جدوجہد اسلامی نصب العین کے حصول کی جدوجہد قرار نہیں پا سکتی۔ ایسے ہی روحانی الذہن افراد پر مشتمل قوم کا ذکر قرآنِ مجید یوں کرتا ہے:۔

كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُونَ بِاللّٰهِ

(آلِ عمران، ۱۱۰)

اے اُمّتِ مصطفویؐ ۔ تم بہترین اُمت ہو، تمہیں لوگوں کے لیے منتخب کیا گیا ہے، تم نیکی کا حکم دیتے ہو، بُرائی سے روکتے ہو اور اللہ پر (کامل) ایمان رکھتے ہو۔

## ۴- موجباتِ خوف و غم کا ازالہ

اس معاشرے کی جدوجہد کا رُخ یہ ہو کہ انفرادی اور اجتماعی زندگی تمام قسم کے داخلی اور خارجی موجباتِ خوف و غم سے محفوظ ہو جائے۔ یہ قومی زندگی کے نصب العین کا چوتھا تقاضا ہے۔ اسلام جس انقلابی معاشرے کی تشکیل قومی نصب العین قرار دیتا ہے۔ اس کی اجتماعی جدوجہد اس سمت میں ہوتی ہے کہ پورا معاشرہ اور اس کا ایک ایک فرد ہر قسم کے خوف و غم سے محفوظ ہو جائے۔ مزید یہ کہ اندرونی اور

بیرونی سطح پر انسانی زندگی کو خوف وغم سے دوچار کرنے والے جتنے اسباب ہو سکتے ہیں سب کو کلیۃً دُور کر دیا جاتے تاکہ ایسی صورت حال کے پیدا ہونے کا امکان باقی نہ رہے۔

کوئی بھی معاشرہ اس وقت تک نہ فلاحی قرار پاسکتا ہے اور نہ اسلامی جب تک وہ اپنے افراد کو بے خوف وغم زندگی کی ضمانت مہیا نہ کرے۔ خوف کسی واقع ہونے والی پریشانی اور نقصان کے اندیشے کو کہتے ہیں۔ جب کہ غم اس پریشانی اور نقصان کے اثرات کی یاد سے متعلق ہوتا ہے۔ اس لحاظ سے خوف کا تعلق مستقبل سے ہوا اور غم کا ماضی سے۔ کیونکہ خوف آنے والے خطرات کی بنا پر ہوتا ہے اور غم بیتے ہوئے خطرات کی بنا پر۔ ان دونوں میں ایک امتیاز یہ بھی ہے کہ خوف کا تعلق عام طور پر اپنی ذات کے نقصان سے ہوتا ہے اور غم کا تعلق دوسروں سے۔

لہٰذا اسلامی معاشرے کا قیام ایسی اجتماعی جدوجہد پر منحصر ہے۔ جس میں اس قسم کے حالات پیدا کیے جائیں کہ نہ تو افراد کو کسی قسم کے نقصان اور پریشانی و محرومی کا اندیشہ یا خطرہ باقی رہے اور نہ کوئی ماضی میں واقع ہونے والا نقصان ایسا رہے جس کی تلافی نہ کی جاسکی ہو تاکہ افراد کے لیے نہ کوئی خوف کا سبب ہو نہ غم کا۔ اسی طرح افراد کو ایسی اطمینان بخش اور محفوظ و مامون زندگی میسّر آئے کہ انہیں نہ اپنی ذات کی نسبت کوئی خطرہ ہو نہ دوسروں کی نسبت۔ الغرض ہر شخص اپنے لحاظ سے بھی اور اپنے اہل وعیال اور متعلقین کے لحاظ سے بھی مطمئن اور بے فکر رہے تاکہ افراد بھی سطح پر اخلاقی کمال اور معاشرہ اجتماعی سطح پر مطلوبہ صالحیت کو پانے کی صحیح جدوجہد کر سکے۔ اگر خوف وغم کی کیفیات قلب و ذہن پر طاری رہیں تو نہ یادِ الٰہی کا حق ادا ہو سکتا ہے نہ کسی اور جدوجہد کا۔ معینہ منزل کے حصول کی جدوجہد ہمیشہ یکسوئی اور یکجہتی سے تبھی ہو سکتی ہے جب دل و دماغ ہر قسم کے خوف وغم سے

نجات پائے ہوئے ہوں۔ ذہن تفکرات اور پریشانیوں میں اُلجھا ہوا ہو تو کوئی کام بھی دلجمعی کے ساتھ نہیں ہو سکتا۔ لہٰذا یہ معاشرے کا فرض ہے کہ وہ اپنے افراد کو ہر قسم کی پریشانی اور خوف و غم کے اسباب سے نجات دلائے تاکہ وہ صحیح شغف اور انہماک کے ساتھ اپنی منزل کی طرف بڑھ سکیں۔ افراد کو کئی قسم کا خوف لاحق ہو سکتا ہے مثلاً:۔

جان تلف ہونے کا خوف

مالی نقصان کا خوف

عزت و آبرو کے نقصان کا خوف

فقر و افلاس کا خوف ۔۔۔ وغیرہ

اسلام وحیِ ربانی کی ہدایت کا مقصد بھی یہی قرار دیتا ہے کہ انسانوں کو خوف و غم سے نجات دلا دے۔ قرآنِ حکیم میں مذکور ہے :۔

فَاِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ مِّنِّىْ هُدًى فَمَنْ تَبِعَ هُدَاىَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ (البقرہ ، ۳۰)

پس جب تمہارے پاس میری طرف سے ہدایت آئے تو جو کوئی میری ہدایت کی پیروی کرے گا اسے نہ کوئی خوف ہوگا اور نہ کوئی غم۔

یہی امر اسلام کے قومی نصب العین کی بنیادی رُوح ہے کہ معاشرے کے ہر فرد کو اس کی جان کی حفاظت و سلامتی کی ضمانت ملنی چاہیئے۔ اس کے مال و دولت کی حفاظت ہونی چاہیئے۔ اس کی عزت و آبرو کے صحیح تحفظ کی ضمانت ملنی چاہیئے۔ اسے سیاسی، معاشی، مذہبی اور معاشرتی زندگی کے جملہ حقوق کے تحفظ کی ضمانت ملنی چاہیئے۔ ایسے ماحولِ حیات کی ضمانت ملنی چاہیئے۔ جس میں کوئی کسی سے زیادتی نہ کر سکے اور اگر سوءِ اتفاق سے ایسا ہو بھی جائے تو ہر مظلوم کی مکمل دادرسی اور

ظالم کے صحیح انجام تک پہنچنے کی ضمانت ملنی چاہیئے ۔ جو معاشرہ خوف وغم کے جملہ عوامل و اسباب سے محفوظ ہو وہ صحیح معنوں میں اسلامی معاشرہ ہے اور جس کے افراد پر خوف وغم کی زندگی مسلط ہو وہ نہ صرف یہ کہ اسلامی معاشرہ نہیں بلکہ خدا کے عذاب میں مبتلا تصور کیا جائے گا ۔ کیونکہ خوف وغم سے محفوظ معاشرتی زندگی خدا کی نعمت ہے اور اس سے محرومی غضب الہٰی ۔ ارشادِ باری تعالےٰ ہے :۔

وَضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا قَرْيَةً كَانَتْ اٰمِنَةً مُّطْمَئِنَّةً يَّاْتِيْهَا رِزْقُهَا رَغَدًا مِّنْ كُلِّ مَكَانٍ فَكَفَرَتْ بِاَنْعُمِ اللّٰهِ فَاَذَاقَهَا اللّٰهُ لِبَاسَ الْجُوْعِ وَالْخَوْفِ بِمَا كَانُوْا يَصْنَعُوْنَ (النحل، ۱۱۲)

اور اللہ تعالےٰ نے ایک ایسی بستی کی مثال بیان کی جس میں بڑا امن اور چین تھا ۔ (ذرائع معیشت کی فراوانی کی بناء پر) اس کا رزق اسے بڑی وسعت کے ساتھ تمام اطراف واکناف سے مہیا ہوتا تھا (یعنی معاشی طور پر اس کے باشندوں کو بڑی آسودگی اور آسائش تھی) پس بستی والوں نے اللہ تعالےٰ کی نعمتوں کے ساتھ کفر کیا ۔ چنانچہ ان کے عمل کے نتیجے میں اللہ تعالےٰ نے انہیں بھوک اور خوف کے لبادے کا مزہ چکھایا ۔

اس آیتِ کریمہ نے یہ حقیقت واضح کردی کہ جس ملک یا طبقۂ وملت پر باری تعالیٰ اپنی نعمتیں اور نوازشیں فرمانا چاہیں اسے اقتصادی آسودگی سے بہرہ ور فرما دیتے ہیں تاکہ وہاں کے باشندوں کو "خوفِ املاق" (بھوک سے مرنے کا خوف) لاحق نہ ہو ۔ اگر معاشی آسودگی ہو تو اس سے معاشرتی زندگی مستحکم ہوتی ہے اور اس کے نتیجے میں انسانی زندگی بے شمار ماحولیاتی خطرات کے خوف سے محفوظ ہو جاتی ہے ۔ اگر وہ معاشرہ احکامِ خداوندی کی نافرمانی کرنے لگے تو باری تعالیٰ کی گرفت اس صورت میں ہوتی ہے کہ اس قوم کو بھوک (معاشی تنگی) اور خوف وخطر کی زندگی سے دوچار کر دیا جاتا ہے ۔

اس کا صاف مطلب یہ ہوا کہ معاشرتی زندگی میں اجتماعی افلاس اور خوف وغم کے حالات عذابِ الٰہی ہے۔ اگر معاشرے کی صورتِ حال یہ ہو تو حکام اور عوام کو سمجھ لینا چاہیئے کہ ہماری قومی زندگی اصل نصب العین کی راہ سے بھٹک چکی ہے۔ کیونکہ لوگوں کو "بھوک اور خوف" کی کیفیت میں رکھ کر احکامِ الٰہیہ کی اطاعت کے لیے صحیح طور پر تیار نہیں کیا جا سکتا۔ خدا کا "انعام" اور "عذاب" دو متضاد امر ہیں۔ دونوں بیک وقت جمع نہیں ہو سکتے۔ اس وقت ہماری حیاتِ قومی "افلاس اور خوف" دونوں کیفیات میں مُبتلا ہے اور یہ اس انحراف کا نتیجہ ہے۔ جو ہم نے آزادی حاصل کرنے کے بعد خدا تعالیٰ سے کیے ہوئے وعدے سے کیا ہے۔

اس لیے اصل نصب العین کی طرف یعنی صحیح سمت میں بڑھنے کی علامت ہی یہ ہے کہ ہم اجتماعی افلاس اور خوف سے نجات حاصل کریں اور اپنے معاشرے کے افراد کو محفوظ اور مطمئن زندگی کے مواقع مہیا کریں ورنہ ہماری تمام جدوجہد ہمیں اصل منزل سے دُور ہی رکھے گی۔

قرآنِ حکیم نے بعض اُمور کو حرام قرار دیتے ہوئے ان کے ارتکاب سے لوگوں کو اس طرح منع کیا ہے کہ اس ممانعت سے معاشرے کی اجتماعی زندگی کو خوف و غم کے جملہ اسباب وعوامل سے نجات عطا کرنے کی صورت بیان کر دی ہے۔ ان کا ذکر چونکہ متصلاً چند آیات میں وارد ہوا ہے۔ اس لیے اس ترتیب سے یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ اسلام کس قسم کی معاشرتی زندگی کا ڈھانچہ پیش کر رہا ہے۔ کیونکہ جب کسی کو ایک چیز سے منع کیا جاتا ہے تو اس ممانعت کا بنیادی مقصد اور لازمی نتیجہ یہی ہوتا ہے کہ جو نقصان اس عمل کے ارتکاب سے خود صاحبِ عمل اور دیگر افراد کو پہنچ سکتا تھا۔ "منع" کے ذریعے دونوں کو اس سے محفوظ کر دیا گیا۔ کسی فعل کی ممانعت بعض اوقات بالذات مقصود نہیں ہوتی بلکہ اصل مقصد

اس نقصان اور شر سے محفوظ رکھنا ہوتا ہے جو اس فعل کے ارتکاب کا یقینی نتیجہ تھا۔ دوسرے لفظوں میں یوں سمجھ لیجئے کہ جو حالت اور کیفیت کسی فعلِ ممنوع کے ارتکاب سے لازم آتی ہے۔ قدرت اس حالت سے بچا کر اس کے برعکس دوسری حالت اور کیفیت کو پیدا کرنا چاہتی ہے اور دوسری پسندیدہ حالت کے برقرار رکھنے کے لیے ضروری ہوتا ہے کہ کوئی ایسا فعل صادر نہ ہونے پائے جس سے مطلوبہ صورتِ حال میں تبدیلی پیدا ہونے کا امکان ہو۔

اس لیے قرآنِ مجید بعض امور کو صراحت کے ساتھ "موانع" میں شمار کرتا ہے تاکہ یہ حقیقت واضح ہو جائے کہ اسلام اس طرز کی نہیں بلکہ اس کے برعکس دوسری طرز کی زندگی کو پسندیدہ قرار دیتا ہے۔ اس تصور کو سمجھنے کے بعد اب آیاتِ قرآنی ملاحظہ فرمائیے :۔

| | |
|---|---|
| وَلَا تَقْتُلُوْٓا اَوْلَادَكُمْ خَشْيَةَ اِمْلَاقٍ ۭ نَحْنُ نَرْزُقُهُمْ وَاِيَّاكُمْ ۭ اِنَّ قَتْلَهُمْ كَانَ خِطْاً كَبِيْرًا ۝ وَلَا تَقْرَبُوا الزِّنٰٓى اِنَّهٗ كَانَ فَاحِشَةً ۭ وَسَاۗءَ سَبِيْلًا ۝ وَلَا تَقْتُلُوا النَّفْسَ الَّتِيْ حَرَّمَ اللّٰهُ اِلَّا بِالْحَقِّ ۭ | اور اپنی اولاد کو غربت و افلاس کے خوف سے نہ مار ڈالو۔ ہم ہی انہیں بھی اور تمہیں بھی رزق دیں گے۔ بے شک ان کا مار ڈالنا بڑی خطا ہے اور زنا کے قریب مت جاؤ، بیشک یہ بے حیائی اور بُری راہ ہے اور کسی جان کو جسے اللہ نے حرام کیا ہے۔ بغیر حق کے نہ مارو۔ |

(بنی اسرائیل، ۳۱۔۳۳)

۱۔ پہلی آیت میں غربت و افلاس کے ڈر سے اولاد کو قتل کرنے کی ممانعت وارد ہوئی ہے اور یہ کہا گیا ہے کہ ہر ایک کو رزق عطا کرنا اللہ تعالےٰ کے ذمے

ہے۔ اب یہ کیونکر تصور کیا جا سکتا ہے کہ ایک طرف باری تعالےٰ بھوک اور افلاس کے ڈر سے اولاد کو مارنے سے منع فرمائیں اور دوسری طرف لوگوں کو بھوک اور افلاس کے خوف میں مبتلا بھی رکھیں۔ نَحْنُ نَرْزُقُهُمْ وَإِيَّاكُمْ (ہم ان کو بھی اور تمہیں بھی رزق دیں گے) کے الفاظ صراحت کے ساتھ اس مشیتِ ایزدی کا اعلان کر رہے ہیں کہ رزق یعنی وسائلِ معیشت مہیا کر کے ہم تمہیں بھوک اور افلاس کے خوف سے نجات دے دیں گے گویا منشاءِ ایزدی یہ ہے کہ کوئی شخص اور معاشرہ بھوک اور افلاس کے خوف میں گرفتار نہ ہو لیکن لوگ خود انحراف اور ظلم اور استحصال پر مبنی نظام کے راستوں پر چل کر منشائے ایزدی کے خلاف اپنے اوپر یہ کیفیات بطور عذاب مسلط کر لیتے ہیں۔

چنانچہ قرآن کی روشنی میں سب سے پہلے اسلام جس خوف سے انسانیت کو بے نیاز کرنا چاہتا ہے وہ "خوفِ افلاس" ہے تاکہ یہ خوف دیگر اخلاقی رذائل اور جرائم کو معرضِ وجود میں لانے کا باعث نہ ہو سکے۔

۲۔ دوسری آیت میں زنا یعنی بدکاری کی حرمت وارد ہوئی ہے اور اس عمل کو صریح بے حیائی اور بُرا راستہ قرار دیا گیا ہے۔ اس ممانعت کے ذریعے لوگوں کی عصمت و عفت کے تحفظ کی ضمانت فراہم کی گئی ہے تاکہ افرادِ معاشرہ کو عزت و آبرو کے نقصان کا کوئی خوف اور اندیشہ نہ رہے۔

۳۔ تیسری آیت میں کسی کو ناحق قتل کرنے کی ممانعت وارد ہوئی ہے۔ اس ممانعت کے ذریعے افرادِ معاشرہ کو جان تلف ہونے کے خوف سے نجات دلانے کا اہتمام کیا گیا ہے تاکہ لوگ اس ذہنی خدشے سے بھی نجات پا جائیں۔

۴۔ چوتھی آیت میں ارشاد فرمایا گیا:۔

وَلَا تَقْرَبُوا مَالَ الْيَتِيمِ — اور یتیم کے مال کے قریب نہ جاؤ، سوائے

| | |
|---|---|
| اِلَّا بِالَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ حَتّٰی یَبْلُغَ اَشُدَّهٗ ۪ وَاَوْفُوْا بِالْعَهْدِ ۚ اِنَّ الْعَهْدَ كَانَ مَسْـُٔوْلًا ۔ (بنی اسرائیل، ۳۴) | سی اچھی نیت اور صورت کے، یہاں تک کہ وہ اپنی جوانی کو پہنچ جائے اور وعدہ (ہمیشہ) پورا کرو، بیشک وعدے کی نسبت سوال کیا جائے گا۔ |

یہاں تخصیص کے ساتھ یتیم کے مال کا ذکر ہے۔ یہ اس لیے کیا گیا ہے کہ یتیم بچہ جو بے سہارا ہوتا ہے اپنی کم عمری اور بے سہارگی کی وجہ سے اپنے مال اور دیگر مفادات کی حفاظت کے قابل نہیں ہوتا۔ اس لیے اس کا مال تلف کرنا نسبتاً آسان ہوتا ہے۔ راستے میں رکی موثر رکاوٹ نہیں ہوتی۔ چنانچہ یتیم کے مال کا ذکر تو علامت (SYMBOL) کے طور پر کیا گیا ہے ورنہ مقصود یہ واضح کرنا ہے کہ کسی کے مال کو بھی ناجائز طور پر نقصان پہنچانا حرام ہے۔ کسی کا مال تلف کرنے کی ممانعت دراصل لوگوں کو مالی نقصان کے خوف سے نجات دلانے کا ذریعہ ہے، تاکہ وہ اپنی زندگی میں اس اندیشے سے بھی محفوظ ہو جائیں۔ مزید برآں ایفائے عہد کے حکم سے افراد کو آپس کے معاملات میں وعدہ خلافی کے خوف سے نجات دلانے کی صورت بہم پہنچائی گئی ہے۔

۵۔ پانچویں آیت میں ارشاد فرمایا گیا:

| | |
|---|---|
| وَاَوْفُوا الْكَیْلَ اِذَا كِلْتُمْ وَزِنُوْا بِالْقِسْطَاسِ الْمُسْتَقِیْمِ ؕ ذٰلِكَ خَیْرٌ وَّاَحْسَنُ تَاْوِیْلًا (بنی اسرائیل، ۳۵) | اور جب تم ناپ کرو تو پورا ناپو، اور تولو تو سیدھی ترازو سے تولو، یہ عمل بہتر اور انجام کے لحاظ سے اچھا ہے۔ |

اس آیت میں ناپ تول کی بددیانتی کی ممانعت وارد ہوئی ہے۔ اس سے مراد یہ ہے کہ آپس کے لین دین میں ایک دوسرے کا حق پوری دیانتداری اور مدارِ انصاف

کے ساتھ ادا کرو۔ گویا میاں افرادِ معاشرہ کو معاملات کی خیانت سے روک کر ظلم و استحصال اور حق تلفی و بددیانتی کے خوف سے محفوظ کیا جا رہا ہے کہ ایسا نظامِ معاشرت و معاملت بپا کیا جاتا ہے۔ جس میں کسی کی حق تلفی ممکن نہ ہو، کوئی بددیانتی واقع نہ ہو اور کسی سے کسی قسم کا ظلم اور زیادتی روا نہ رکھی جا سکے۔ اس طرح لوگ اپنی باہمی زندگی میں بھی ہر قسم کی زیادتی کے خوف سے بے نیاز ہو جائیں۔

۶۔ چھٹی آیت میں ارشاد فرمایا گیا:۔

وَلَا تَقْفُ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ ؕ اِنَّ السَّمْعَ وَالْبَصَرَ وَالْفُؤَادَ كُلُّ اُولٰٓئِكَ كَانَ عَنْهُ مَسْئُوْلًا

اور جس چیز کا تمہیں واثق علم نہ ہو۔ اس کے پیچھے نہ چلو، بیشک کان، آنکھ اور دل ہر ایک سے جواب طلبی ہوگی۔

(بنی اسرائیل، ۳۶)

اس آیت کے ذریعے توہم اور الزام و اتہام اور افواہوں کی پیروی کی ممانعت وارد ہوئی ہے۔ گویا اس امر کا بھی اہتمام کر دیا گیا ہے کہ کوئی کسی کے خلاف بے بنیاد اور جھوٹا پروپیگنڈا نہ کر سکے، کسی کی عزت کے خلاف الزام تراشی نہ کر سکے اور کسی کی شہرت کو نقصان پہنچانے کے لیے افواہوں کا سلسلہ جاری نہ رکھ سکے۔ اس طرح افرادِ معاشرہ کو ہر لحاظ سے الزام و اتہام اور ناجائز بے عزتی کے خوف سے محفوظ کر دیا گیا ہے تاکہ ہر شخص بلا خوف و خطر باعزت اور پُرسکون زندگی بسر کر سکے۔

۷۔ ساتویں آیت میں ارشاد فرمایا گیا۔

وَلَا تَمْشِ فِي الْاَرْضِ مَرَحًا ۚ اِنَّكَ لَنْ تَخْرِقَ الْاَرْضَ وَلَنْ تَبْلُغَ الْجِبَالَ طُوْلًا ۝

اور زمین پر اکڑ کر نہ چل، بے شک تو (جتنا بھی طاقتور ہو) زمین کو ہرگز نہ پھاڑ سکے گا اور نہ پہاڑوں کی لمبائی کو پہنچ

كُلُّ ذٰلِكَ كَانَ سَيِّئُهٗ عِنْدَ رَبِّكَ مَكْرُوْهًا — سکے گا، یہ سب بُری باتیں تیرے رب کے نزدیک ناپسندیدہ ہیں۔

(بنی اسرائیل، ۳۷، ۳۸)

اس آیت میں غرور، تکبّر اور نخوت و فرعونیت کی ممانعت وارد ہوئی ہے کہ اے انسان تو جتنا بھی طاقت ور اور بلند و بالا ہو جائے نہ تو زمین کو پھاڑ سکتا ہے اور نہ پہاڑوں سے بلند ہو سکتا ہے۔ گویا یہ تیری طاقت و وسعت کی حد بندی ہے۔ پھر تو کیوں اسی زمین پر اتراتا ہے؟ غرور و تکبّر اور نخوت و فرعونیت کے باعث کمزور اور ناتواں انسانوں سے ظلم اور زیادتی ایک یقینی امر ہے۔ اس لیے اس سے منع کر کے کمزور اور ناتواں انسانوں کو بھی طاقتوروں کے فتنہ و شر اور ظلم و جبر کے خوف سے نجات عطا کر دی گئی ہے۔

۸۔ آخر میں فرمایا گیا ہے کہ "یہ تمام بُری باتیں اللہ تعالیٰ کے نزدیک ناپسندیدہ ہیں"۔ یعنی ان سب سے پرہیز لازم ہے اور یہی ہمارا اجتماعی نصب العین ہے کہ معاشرتی سطح پر جدوجہد کا رُخ یہ ہو کہ وہ تمام اسباب و عوامل جن کے وجود سے انسانی زندگی خوف و غم کی پریشان کُن کیفیات سے ہمکنار رہتی ہے۔ ختم کر دیئے جائیں تاکہ پورا معاشرہ اور اس کا ایک ایک فرد اسلامی معیارِ عمل کے مطابق پُرسکون اور باعزّت زندگی بسر کر سکے اور اپنی تخلیقی و انقلابی جدوجہد کو بحال رکھ سکے۔

## ۵۔ غلبۂ حق کی خاطر باطل قوتوں کے خلاف غیر مصالحانہ انقلابی جنگ

وہ معاشرہ بین الاقوامی سطح پر غلبۂ حق کی خاطر داخلی اور خارجی محاذوں پر تمام باطل، طاغوتی، استحصالی اور منافقانہ قوتوں کے خلاف غیر مصالحانہ انقلابی جنگ

فیصلہ کن مرحلہ تک جاری رکھ سکے۔ اسلام جس انقلابی معاشرے کی تشکیل کو قومی نصب العین قرار دیتا ہے۔ اس کی یہ بنیادی خصوصیت ہے۔ یہ خصوصیت دراصل مقصدِ بعثتِ محمدی کی تکمیل سے عبارت ہے۔ نبی اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کے وصال کے بعد آپ کی بعثتِ سعیدہ کا مقصد بطور امانت و نیابت اُمتِ مصطفوی کو منتقل ہو گیا اور اسی کے حصول کی جدوجہد اسلامی معاشرے کی حقیقی زندگی ہے۔ قرآنِ مجید غلبۂ دینِ حق کی جدوجہد کو اُمتِ نبویؐ کا بنیادی فریضہ قرار دیتا ہے۔ ارشادِ باری ہے:۔

| | |
|---|---|
| ۱۔ وَقَاتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّيَكُوْنَ الدِّيْنُ كُلُّهٗ لِلّٰهِ (الانفال، ۳۹) | اور ان سے جنگ کرو حتیٰ کہ طاغوتی فتنہ ختم ہو جائے اور دین یعنی نظامِ حیات سارا کا سارا خالصۃً اللہ کے لیے ہو جائے۔ |

اس آیتِ کریمہ میں اللہ تعالٰے نے اہلِ ایمان پر باطل قوتوں کے خلاف انقلابی جنگ فیصلہ کن مرحلہ تک جاری رکھنے کا حکم دیا ہے۔ اس کی وضاحت ایک اور مقام پر یوں کی گئی ہے:۔

| | |
|---|---|
| ۲۔ اَلَّذِيْنَ يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ الطَّاغُوْتِ (النساء، ۷۶) | جو لوگ ایمان لائے وہ اللہ کے رستے میں جہاد کرتے ہیں اور جو کافر ہوتے وہ طاغوت کی راہ میں جنگ کرتے ہیں۔ |

قرآنِ حکیم باطل مقاصد کے لیے کی جانے والی ہر جنگ کو طاغوتی جنگ قرار دیتا ہے۔ ایسی ہر کاوش کے خلاف انقلابی جنگ اور جہاد اُمتِ مسلمہ کا فرضِ اولین ہے۔ باری تعالٰے کا یہ فیصلہ قرآنِ مجید میں اس طرح مذکور ہے:۔

| | |
|---|---|
| ۳۔ يُرِيْدُ اللّٰهُ اَنْ يُّحِقَّ الْحَقَّ | اللہ تعالیٰ کا یہ ارادہ ہے کہ اپنے وعدوں |

| | |
|---|---|
| بِكَلِمٰتِهٖ وَيَقْطَعَ دَابِرَ الْكٰفِرِيْنَ | کو سچا کر دکھائے اور کافروں (کی قوت) |
| لِيُحِقَّ الْحَقَّ وَيُبْطِلَ | کو جڑ سے کاٹ دے، تاکہ حق، حق اور |
| الْبَاطِلَ وَلَوْ كَرِهَ الْمُجْرِمُوْنَ | باطل، باطل ثابت ہو جائے، خواہ مجرم |
| (الانفال: ۷، ۸) | لوگ اس ارادۂ الٰہی کو ناپسند کرتے ہیں۔ |

۴۔ اسی طرح ایک اور مقام پر ارشادِ باری تعالیٰ ہے:۔

| | |
|---|---|
| فَقَاتِلُوْا اَوْلِيَآءَ الشَّيْطٰنِ | پس شیطان کے ساتھیوں سے جنگ |
| (النساء، ۷۶) | کرو۔ |

۵۔ غلبۂ حق کی خاطر باطل طاغوتی قوتوں کے خلاف اسی انقلابی جنگ کا حکم ایک اور مقام پر یوں دیا گیا ہے:۔

| | |
|---|---|
| فَلْيُقَاتِلْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ الَّذِيْنَ | بس چاہیے کہ راہِ حق میں ان لوگوں کے |
| يَشْرُوْنَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا | خلاف جنگ کی جائے جو دُنیوی زندگی |
| بِالْاٰخِرَةِ (النساء، ۷۴) | کو اُخروی زندگی کے عوض خرید لیتے ہیں |

۶۔ ایک اور مقام پر ارشاد فرمایا گیا ہے:۔

| | |
|---|---|
| وَقَاتِلُوْهُمْ يُعَذِّبْهُمُ اللّٰهُ | اور ان سے جنگ کرو، اللہ انہیں تمہارے |
| بِاَيْدِيْكُمْ وَيُخْزِهِمْ وَ | ہاتھ سے سزا دے گا اور انہیں ذلیل و |
| يَنْصُرْكُمْ عَلَيْهِمْ وَيَشْفِ | رسوا کرے گا اور تمہیں ان پر غلبہ دے گا |
| صُدُوْرَ قَوْمٍ مُّؤْمِنِيْنَ | اور (اس طرح) مخلص مومنین کی جماعت |
| (التوبۃ، ۱۵) | کو دلی تسکین عطا کرے گا۔ |

ان تمام آیات میں تمام باطل طاغوتی قوتوں کے خلاف فیصلہ کن مرحلہ تک انقلابی جنگ جاری رکھنے کا حکم دیا گیا ہے اور ساتھ ہی غلبۂ حق کا مژدۂ جانفزا سنایا گیا ہے۔

۷۔ اسی طرح قرآن میں ظالم، جابر، مستبد اور استحصالی قوتوں سے نبرد آزما

ہونے کا حکم بڑی شد و مد کے ساتھ دیا گیا ہے۔ جب صحابہ کرام میں سے بیشتر حضور علیہ السلام کے بعد مدینہ ہجرت کر گئے اور کچھ مسلمان مکہ میں ہی رہ گئے جو ہر وقت وہاں کی استحصالی اور ظالم طاقتوں کے دستِ تظلم کا شکار ہوتے تھے تو ان کی خاطر اہلِ مدینہ کو جھنجھوڑ کر حکم دیا گیا :-

| | |
|---|---|
| فَمَا لَكُمْ لَا تُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَالْمُسْتَضْعَفِيْنَ مِنَ الرِّجَالِ وَالنِّسَآءِ وَالْوِلْدَانِ الَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا اَخْرِجْنَا مِنْ هٰذِهِ الْقَرْيَةِ الظَّالِمِ اَهْلُهَا (النساء، ۷۵) | پس تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ تم خدا کے راستے میں جنگ نہیں کرتے حالانکہ کمزور اور ناتواں مرد، عورتیں اور بچے (پکار پکار کر) کہتے ہیں کہ اے ہمارے پروردگار ہمیں اس بستی سے نکال کر لے جا جہاں کے مکین (یعنی سردار اور حکمران) ظالم اور جابر ہیں۔ |

وہ معاشرہ قرآن کی نظر میں اسلامی نہیں جس کے افراد دوسرے مسلمانوں یا مظلوم انسانوں کی ہمدردی اور بہی خواہی کے جذبے سے خالی ہوں اور وہ اپنے حیطۂ اختیار کی حد تک ظالم کو انجام تک پہنچانے اور مظلوم کو ظلم و استبداد سے نجات دلانے کے لیے انقلابی جنگ نہ کریں۔ یہاں اس تصور کی نفی ہو جاتی ہے جو بعض مسلم مفکرین نے غیر مسلم زُعماء اور مستشرقین کے اس الزام کے جواب میں کہ "اسلام تلوار کے زور سے پھیلا ہے" معذرت خواہانہ انداز میں پیش کیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اسلام کی اشاعت کردار ہی کے زور سے ہوئی ہے۔ لیکن اسلام کی تلوار، اس کے کردار سے کبھی جدا نہیں رہی۔ جہاں بھی انسانیت پر ظلم ہوا، اسلام نے اس کے خاتمے اور استیصال کے لیے حسبِ ضرورت تلوار کے استعمال سے کبھی گریز نہیں کیا۔ لیکن فتنہ و شر کو سر کر لینے کے بعد جب اسلام کی تعلیمات کی اشاعت کا وقت آیا تو اسلام نے اپنی تلوار

کسی کے سر پر نہیں رکھی۔ اس طرح اسلام کے کردار اور "تلوار" کا چولی دامن کا ساتھ رہا ہے۔ تلوار کے اس تصور کو رد کرنا گویا اسلام کو محض "دفاعی مذہب" قرار دینے کے مترادف ہے اور یہ حقیقت ہے کہ محض دفاع کسی قوم کا مقصدِ حیات نہیں ہو سکتا۔ نظریاتی قومیں اپنے دفاع کے لیے نہیں بلکہ اپنے فکر کے عالمگیر فروغ کے لیے جیا کرتی ہیں۔ یہی اسلامی معاشرے کی خصوصیت اور اسلام کا قومی نصب العین ہے۔

۸۔ اسلام نہ صرف صریح باطل اور باغی قوتوں کے خلاف بلکہ معاشرے کے اندر موجود منافقانہ قوتوں کے خلاف بھی علمِ جہاد بلند کرنے کا حکم دیتا ہے۔ کیونکہ اسلام کسی سطح پر بھی کسی باطل طاقت سے سمجھوتہ گوارا نہیں کرتا۔ اس سلسلے میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے:۔

| | |
|---|---|
| يَٰٓأَيُّهَا ٱلنَّبِيُّ جَٰهِدِ ٱلْكُفَّارَ وَٱلْمُنَٰفِقِينَ وَٱغْلُظْ عَلَيْهِمْ (التوبۃ، ۷۳) | اے نبی! کافروں اور منافقوں (دونوں طبقوں) سے جہاد کیجیے اور ان پر سختی کیجیے۔ |

یہاں تمام منافق گروہوں سے جہاد اور انقلابی جنگ کا حکم صادر کیا گیا ہے۔ جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے کہ ان تمام باطل طبقات کے خلاف جنگ کا مقصد محض غلبۂ حق ہے نہ توسیع پسندی ہے اور نہ کوئی دیگر دنیوی مفاد۔ اسی لیے اس انقلابی جنگ کو فیصلہ کن مرحلے تک "غیر مصالحانہ انداز" سے جاری رکھنے کا حکم دیا گیا ہے۔

۹۔ اسی سلسلے میں ارشادِ ربانی ہے:۔

| | |
|---|---|
| فَلَا تَهِنُوا وَتَدْعُوٓا إِلَى ٱلسَّلْمِ وَأَنتُمُ ٱلْأَعْلَوْنَ وَٱللَّهُ مَعَكُمْ وَلَن يَتِرَكُمْ أَعْمَٰلَكُمْ (محمد، ۳۵) | پس پست ہمت نہ ہونا اور نہ (باطل، طاغوتی، استحصالی اور منافقانہ قوتوں سے) سمجھوتہ کرنا، کامیابی اور غلبہ تمہیں ہی نصیب ہوگا۔ اللہ تمہارے ساتھ ہے اور وہ تمہاری کوششوں کو بے نتیجہ نہیں جانے دیگا۔ |

قرآن حکیم نے نہایت صراحت کے ساتھ اسلامی نصب العین کے حصول کی جدوجہد میں کامیابی وکامرانی کی شرط بیان کردی ہے اور وہ یہ کہ کسی بھی سطح پر کسی باطل قوت کے ساتھ ایسا سمجھوتہ نہ کیا جائے جو غلبہ حق کی راہ میں رکاوٹ ہو۔ اگر اہلِ حق تمام طاغوتی طاقتوں کے خلاف غیر مصالحانہ طریقے سے اپنی انقلابی جنگ جاری رکھیں تو کوئی وجہ نہیں کہ انہیں باطل کے مقابلے میں فتح وکامیابی حاصل نہ ہو۔ اس لیے کہ جو اہلِ ایمان باطل کی جاہ وحشمت سے مرعوب نہیں ہوتے بلکہ صرف اور صرف اپنے رب پر توکل کرتے ہیں۔ رب تعالیٰ انہی کو اپنے خصوصی ساتھ سے نوازتا ہے اور اسی دنیا کے معرکہ حق وباطل میں کامیابی ان کے قدم چومتی ہے۔

۱۰۔ اسی امر کی تائید قرآنِ مجید میں یوں بھی کی گئی ہے:۔

| | |
|---|---|
| لَا تَهِنُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَ اَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ | تم پست ہمت نہ ہونا اور نہ گھبرانا، کامیابی تم ہی کو نصیب ہوگی۔ بشرطیکہ تم (اس پر) کامل ایمان رکھو۔ |

(آلِ عمران، ۳۹)

چنانچہ اسلام کا مہیا کردہ قومی نصب العین یہ ہے کہ غلبۂ دینِ حق کے لیے عالمگیر انقلاب کی خاطر ایسا مثالی معاشرہ وجود میں لایا جائے جو مذکورہ بالا پانچ تقاضوں کو پورا کرتا ہو۔ ان پانچ تقاضوں کی تکمیل پر مشتمل انقلابی جدوجہد ہی اسلام کے قومی نصب العین کے حصول کی جدوجہد ہے۔

باب نہم

# قومی نصب العین کے حصول کا لائحہ عمل

## عصرِ حاضر کا المیہ

یہ امر ذہن نشین رہنا چاہیئے کہ اسلام کا مہیا کردہ حقیقی نصب العین نہ کسی انفرادی مقصد سے عبارت ہے اور نہ قومی مقصد سے بلکہ وہ سراسر بین الاقوامی مقصد سے عبارت ہے۔ جو "عالمی سطح پر غلبۂ اسلام" پر منحصر ہے۔ انفرادی اور قومی زندگی کے نصب العین کا اسلام کے نصب العین کے ساتھ یہ تعلق ہے کہ انفرادی نصب العین، اسلام کے نصب العین کے حصول کا ذریعہ ہے اور قومی نصب العین عالمی نصب العین کے حصول کا۔

گویا ملّتِ اسلامیہ کی ہر سطح کی جدوجہد کا اصل مقصد "بین الاقوامی سطح پہ غلبۂ اسلام کا انقلاب" ہے اور قومی و انفرادی زندگی کے مقاصد سب بالترتیب اصل مقصد کے حصول کے ذرائع ہیں۔ یہ حقیقت ہے کہ ذریعے کی افادیت صرف اسی صورت میں باقی رہتی ہے۔ جب وہ حصولِ مقصد کے واسطے کے طور پر سامنے رہے۔ اگر اصل مقصد نظر سے اوجھل ہو جائے یا ذریعہ بذاتِ خود مقصد بن جائے تو ذریعہ کسی منفعت اور افادیت کا باعث نہیں رہتا۔ ذریعے اور مقصد، دونوں کی اہمیت کے ساتھ ساتھ ان کا امتیاز بھی پیشِ نظر رہنا چاہیئے۔ اگر ذریعے اور مقصد کے تعین میں ہی التباس یا اختلاط پیدا ہو جائے تو مخلصانہ جدوجہد کے باوجود مطلوبہ نتائج پیدا نہیں ہو سکتے۔ عصرِ حاضر میں عالمِ اسلام کے بعض مفکرین، قائدین اور مصلحین کا المیہ یہی ہے کہ ان کے پیشِ نظر ذریعے اور مقصد کا امتیاز باقی نہیں رہا۔ وہ اپنی جدوجہد میں

اصل نصب العین اور اس کے حصول کے ذرائع کو صحیح طور پر متعین نہیں کر سکے۔ بعض لوگ افراد کی نجی اصلاح کو ہی اصل نصب العین قرار دینے پر مُصر ہیں اور ان کی تمام تعلیمی و تبلیغی مساعی اسی نکتے پر مرکوز ہیں۔ جب کہ بعض افراد قومی سطح پر محض تبدیلی اقتدار کے انقلاب کو اصل نصب العین سمجھتے ہیں اور ان کی تمام سیاسی مساعی اسی مقصد کے حصول پر صرف ہو رہی ہیں۔ حالانکہ اصل صورتِ حال یہ ہے کہ افراد کی زندگی میں نجی اور قومی سطح کی تبدیلی اپنی اپنی جگہ نہایت اہم سہی لیکن بذاتِ خود مقصد نہیں ہے بلکہ اصل مقصد اور حقیقی نصب العین تو وہ عالمگیر انقلاب ہے جو بین الاقوامی سطح پر اسلام کے سیاسی غلبے کا ضامن ہو اور انفرادی و قومی سطح کی جدوجہد محض اس مقصد کے حصول کا ذریعہ تصور کرتے ہوئے، حصولِ مقصد کی شرائط اور تقاضوں کو پورا کرنے کی غرض سے کی جائے تو وہ بھی اپنی اپنی جگہ صحیح نتائج پیدا کرے گی۔ لیکن پہلی دونوں سطحوں کی جدوجہد کا رُخ اگر اصل مقصد کی طرف نہ ہو اور ان کے جواز و تفصیلات کو بھی اصل مقصد کے حوالے سے متعین نہ کیا جا رہا ہو تو عملی اور معروضی نتائج کے اعتبار سے وہ ناکام ہی رہے گی۔ یہ ناکامی اسلام کی نہیں بلکہ ان مصلحین اور مفکرین کے نا رسیدہ فکر کی ہوگی جنہوں نے ذریعے اور مقصد کے باہمی امتیاز اور تعلق کو فراموش کر دیا ہے۔

## لائحہ عمل کے مسئلے پر قیادتِ وقت کی بے یقینی

اسلام کی عطا کردہ ہدایت جامع اور ہمہ گیر ہدایت ہے۔ یہ ایک طرف مسلمانوں کو اگر ان کی قومی زندگی کے نصب العین سے آشنا کرتی ہے تو دوسری طرف اس نصب العین کے حصول کے واضح اور قطعی لائحہ عمل کی نشاندہی بھی اسی کی ذمہ داری ہے ورنہ اس ہدایت کو کامل ہدایت قرار نہیں دیا جا سکتا۔ آخر یہ بات عقلِ انسانی کے لیے کیسے قابلِ قبول ہو سکتی ہے کہ اسلام نے مسلمانوں کو ان کے مقصد اور نصب العین کی

نشاندہی تو کر دی ہو لیکن اس لائحہ عمل کو متعین نہ کیا ہو۔ جس کے ذریعے مقصد کو پایا جا سکے۔ اگر قرآن و سنت پر مشتمل ہدایت کی حالت یہی ہو تو اسے کسی صورت میں بھی جامع ہدایت تصور نہیں کیا جا سکتا۔ یہ ایک اٹل حقیقت ہے کہ اسلام عالم انسانیت کا سب سے آخری اور حتمی مذہب ہے۔ قرآن سب سے آخری کتاب ہے اور حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم سب سے آخری نبی اور رسولؐ ہیں۔ حضورؐ کی بعثت کے بعد انسانیت کو نئی پیغمبرانہ بعثت اور نئی آسمانی وحی سے ابدالآباد تک بے نیاز کر دیا گیا ہے۔ اب انسانیت کو اپنی جدوجہد ہمیشہ قرآنی وحی اور سنتِ مصطفویؐ سے حاصل شدہ ہدایت کی روشنی میں ہی کرنا ہوگی۔ اگر ملتِ اسلامیہ کے سامنے قرآن و سنت کے ذریعے "غلبۂ دینِ حق" کا واضح مقصد رکھ دیا گیا ہو اور انہیں اس مقصد کے حصول کی جدوجہد کا حکم بھی دے دیا گیا ہو لیکن حصولِ مقصد کے لیے واضح لائحہ عمل اور نتیجہ خیز پروگرام مہیا نہ کیا گیا ہو۔ اس معاملے میں مسلمان اپنی صوابدید سے کام لے کر ہر سطح پر باطل قوتوں کے خلاف معرکہ آرائی بھی کریں اور انہیں ہر محاذ پر شکست اور ذلت و رسوائی نصیب ہو اور باطل طاغوتی قوتوں کو فتح و عروج ملتا گیا (معاذ اللہ) اندریں صورت باری تعالےٰ کا یہ فیصلہ منصفانہ ہوگا؟ اگر مسلمانوں کے ذمے اپنی زندگی کے احوال سنوارنے اور باطل قوتوں پر غالب آنے کی محض جدوجہد کرنا ہی ہے۔ نہ اس دنیا کے معرکۂ حق و باطل میں کامیابی کی ضمانت ہو ———— اور نہ انہیں کامیابی کے لیے واضح لائحہ عمل دیا گیا ہو، تو اس جدوجہد کا مقصد (معاذ اللہ) مسلمانوں کو باطل قوتوں کے سامنے ذلیل و رسوا کروانے اور اسلام کی صداقت اور اثر انگیزی کے تصور کی نفی کروانے کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے؟ کیا اس سے اسلام کے نظامِ حیات، قرآن کی ہدایت، اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی پیغمبرانہ قیادت کی بے تاثیری مسلم نہیں ہو گی؟

یقیناً اسلام کے بارے میں ایسا غلط نقطہ نظر اسی نتیجے تک پہنچائے گا۔ اگر اسلام نے

اَلَآ اِنَّ حِزْبَ اللّٰهِ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ (المجادلہ ، ۲۲)

بے شک اہلِ حق کا گروہ ہی غالب اور فتح یاب ہونے والا ہے۔

کے اعلان کے ذریعے معرکۂ حق و باطل میں اہلِ حق کی کامیابی کی ضمانت فراہم کی ہے تو یقیناً اس کامیابی کے لیے کوئی واضح لائحہ عمل بھی دیا ہوگا۔ ورنہ اس کے بغیر نہ اس کا وعدہ سچا ہو سکتا ہے اور نہ اس کی ہدایت قابلِ التفات۔

آج انفرادی سطح سے لے کر بین الاقوامی سطح تک ملّتِ اسلامیہ ہمہ گیر زوال کا شکار ہے بلکہ زندگی کے ہر شعبے میں انحطاط کی کیفیت روز افزوں ہے۔ ہر طرف اصلاحِ احوال کی کوششیں بھی ہو رہی ہیں۔ انفرادی اور اجتماعی سطح پر کئی افراد اور کئی تنظیمیں فکری اور عملی زوال سے مسلمانوں کو نجات دلانے کی مساعی میں مصروف ہیں۔ لیکن سوائے ناکامی کے کچھ ہاتھ نہیں آ رہا۔ حالت دن بدن بگڑتی جا رہی ہے۔ حکومتیں پریشان ہیں۔ قیادتیں مضمحل ہیں اور عوام مایوس ہیں۔ آخر کیا وجہ ہے؟ کیا اسلام کے دامن میں ایسی صورتِ حال کو بدلنے کی کوئی موثر تدبیر نہیں ہے یا ہماری قیادتیں بوجوہ اس تدبیر سے صرفِ نظر کیے ہوئے ہیں؟ اگر یہ تسلیم کر لیا جائے کہ اسلام کے پاس ایسی زوال پذیر صورتِ حال سے نپٹنے کی کوئی نتیجہ خیز تدبیر ہی نہیں ہے تو پھر مسلمانوں سے کوئی شکوہ باقی نہیں رہتا۔ کیونکہ قرآن کا مہیا کردہ نظامِ ہدایت (معاذ اللہ) ناقص ہو تو مسلمان بیچارے کیا کریں۔ اس تصور کو قبول کر لینے سے کفر لازم آئے گا۔ مستزاد یہ کہ اس تصور سے عملاً مایوسی اور اسلام سے انحراف کے سوا اور کوئی راستہ باقی نہیں رہے گا۔ اس لیے ہمیں یہ تسلیم کرنا ہوگا کہ اسلام نے تو تبدیلیِ احوال کی موثر تدبیر زندگی میں غلبۂ حق کا واضح لائحہ عمل اور اس کشمکشِ حیات میں حصولِ نصب العین کا حتمی و قطعی طور پر نتیجہ خیز پروگرام عطا کیا ہے۔ لیکن ہم نے اپنے مفادات کی خاطر اس سے صرفِ نظر کر رکھا ہے۔ ہم اسلام کے

متعین کردہ پروگرام کے بجائے اپنے ذہنی تراشیدہ پروگراموں سے اپنی زندگی میں انقلاب لانا چاہتے ہیں۔ جس میں ہمیں کامیابی نہیں ہو رہی۔ ہم نے یا تو مقصد" اسلام سے اخذ کر کے اس کے حصول کا "لائحہ عمل" اپنی صوابدید سے وضع کر رکھا ہے یا اسلام سے متعین کردہ ذرائع کو ہی مقصد سمجھ کر ان کے حصول کے لیے مصروفِ جدوجہد ہیں۔
بہر حال دونوں صورتوں میں کوتاہ نظری، کج فہمی اور خطا ہماری ہے۔ اسلام کا کوئی قصور نہیں۔

## انبیاء علیہم السلام پر ناکامی کا الزام

قیادت و سیادت اور جاہ و منصب کی اجارہ داریوں کے مفادات نے ہمیں یہاں تک پہنچا دیا ہے کہ ہم پے در پے شکست اور ناکامی کے باوجود اپنے وضع کردہ لائحہ عمل کو قابلِ اصلاح اور لائقِ تجدید بھی نہیں سمجھتے بلکہ اپنی سوچ اور نظامِ عمل کو قرآن کی طرح حتمی و قطعی تصور کرتے ہیں۔ تاکہ ہماری فکری قیادت چھن کر کسی اور کے ہاتھ میں نہ جانے پائے۔ ہوائے نفس کی پوجا کا یہ عالم ہے کہ شکست و ناکامی پر بجائے اپنے طریقِ کار کی اصلاح کے ہمارے "مفکرینِ اسلام" نے اس "شکست کی" اسلامی توجیہہ" بھی تراش لی ہے۔ وہ یہ کہ "اسلام نے مسلمانوں پر محض باطل قوتوں کے مقابلے میں جہاد کا حکم دیا ہے۔ نتائج کے لحاظ سے اس دنیا میں حق کی کامیابی کی ضمانت نہیں دی۔ اصل کامیابی تو صرف آخرت کی کامیابی ہے۔ اگر ہماری جدوجہد سے نتائج پیدا نہیں ہوتے تو کوئی بات نہیں۔ اس دنیا کے معرکہ ہائے حق و باطل میں ہزاروں انبیاء کرام بھی جدوجہد کرتے رہے لیکن مطلوبہ نتائج پیدا نہ کر سکے اور ظاہراً (معاذ اللہ) ناکام ہو کر اپنے اللہ سے جا ملے۔ اس لیے جب انبیاء کرام جو اللہ کی طرف سے مبعوث ہوتے تھے۔ اپنی دعوت کے معروضی نتائج پیدا نہیں کر سکے تو ہم پر یہ ذمہ داری کیونکر عائد ہو سکتی ہے۔"

(معاذاللہ استغفراللہ) اس دنیا میں اسلام کی ہدایت کے بے نتیجہ ہونے اور انبیاء کرام کے ناکام و نامراد واپس لوٹنے کا یہ باطل مفروضہ محض اس لیے تراشا گیا کہ اپنی فکری قیادت پر حرف نہ آنے پائے۔ اگر قرآنی ہدایت کی نتیجہ خیزی اور انبیاء کی دعوت کی معروضی نتائج کے اعتبار سے کامیابی کو تسلیم کرلیا جاتا تو اس عقیدے سے ان کی قیادت کی ناکامی مسلّم (ESTABLISH) ہوتی جو انہیں کسی قیمت پر بھی گوارا نہ تھی۔ اس لیے انہوں نے خدا اور اس کے برگزیدہ رسولوں کو (معاذاللہ) باطل کے مقابلے میں ناکام اور شکست خوردہ تسلیم کرکے خود کو ناکامی کی خفت و ندامت سے بچالیا۔ اگر بنظر بصیرت قرآن کا مطالعہ کیا جائے تو اس باطل مفروضے کی تائید میں ایک حرف بھی میسّر نہیں آسکتا۔ ہم اس موضوع پر (انشاءاللہ) کسی مناسب موقع پر روشنی ڈالیں گے اس وقت صرف یہ واضح کرنا درکار ہے کہ نہ اس تصور کی تبلیغ سے اسلام کی حقیقی خدمت ممکن ہے اور نہ جدید نسل کو الحاد و دہریت کی یلغار کے مقابلے میں اسلام کی طرف راغب کیا جاسکتا ہے۔ جو دین ایک مقصد کے حصول کے لیے اپنے ماننے والوں پر جدوجہد کو تو فرض قرار دے۔ لیکن اس مقصد کے حصول کے لیے نتیجہ خیز لائحہ عمل مہیا نہ کرے۔ بلکہ اس جدوجہد میں نتائج کے لحاظ سے کامیابی کی ضمانت بھی نہ دے تو تجربی توثیق کی بنیاد پر فیصلہ کرنے والی عقل اس دین کی طرف کیسے راغب ہوسکتی ہے؟ اس طرح مذہبی قیادت ایک اعتبار سے یہ اعلان کررہی ہے کہ "اسلام اس دنیا میں کامیابی کی ضمانت تو نہیں دے سکتا البتہ آخرت کی کامیابی کی ضمانت دیتا ہے۔" گویا اس دنیا میں شیطان نے (معاذاللہ) خدا کو شکست دیدی ہے۔ رہ گئی آخرت تو اس کا معاملہ آخرت میں ہی دیکھا جائے گا۔ حالانکہ قرآن حکیم میں بڑی صراحت کے ساتھ یہ وعدۂ الٰہی مذکور ہے:۔

كَتَبَ اللّٰهُ لَاَغْلِبَنَّ (اللہ تعالیٰ نے یہ لکھ دیا یعنی طے کرلیا ہے)

آنا و رُسلِیْ — کہ بے شک (ہمیشہ) میں اور میرے رسول ہی (باطل کے مقابلے میں) غالب اور فتح یاب ہوں گے۔

(المجادلہ ، ۲۱)

اس ارشادِ قرآنی کے ہوتے ہوئے انبیاءِ کرام پر ظاہری ناکامی کا الزام اعلانِ خداوندی کی تکذیب نہیں تو اور کیا ہے؟ ایسا مزعومہ تصور باری تعالیٰ کو کمزور و عاجز تسلیم کرنے کے مترادف ہے کہ وہ اپنے انبیاء و رسل کو غالب و کامیاب کرنے کا وعدہ کرکے بھی ایسا نہیں کر سکا یا (معاذ اللہ) اگر اس نے اس پر قادر ہو کر بھی ایسا نہیں کیا تو یہ اپنے پیغمبروں سے مذاق تصور ہوگا کہ اس نے ہزاروں کی تعداد میں پیغمبر دعوتِ حق کے لیے اقوامِ عالم کے پاس بھیجے۔ پھر ان کی دعوت کے مقابلے میں باطل قوتوں کی مخالفت اور مزاحمت پیدا کی۔ مگر سارے کے سارے یا اکثر انبیاء (معاذ اللہ) پوری کوشش کے باوجود مطلوبہ نتائج پیدا نہ کر سکے اور ظاہراً کامیابی باطل قوتوں کو نصیب ہوتی رہی۔ اس اصول کو جاری رکھنے سے انبیاءِ کرام کا تمسخر اور دعوتِ حق کی عظمت و افادیت کی نفی نہیں تو اور کیا ثابت ہوتا ہے؟ کیا باری تعالیٰ نے اپنے ہزاروں انبیاء و رسل محض اس لیے بھیجے تھے کہ وہ پے در پے جدوجہد کریں اور بالآخر معروضی نتائج پیدا کیے بغیر ظاہراً نامراد واپس لوٹ آئیں؟ قرآن کی تحریفِ معنوی کے ذریعے ایسی جسارت صرف اپنی ناکام فکری قیادت کو بچانے کی خاطر کی گئی ہے۔ (اللہ تعالیٰ دینِ حق اور مضامینِ قرآن کا صحیح فہم عطا فرمائے، آمین) ورنہ تاریخِ انسانیت اور صفحاتِ قرآن شاہد ہیں کہ آج تک نہ کوئی نبی اور رسول بغیر واضح اور دو ٹوک کامیابی کے واپس لوٹا ہے اور نہ اسلام نے مسلمانوں کو واضح اور نتیجہ خیز لائحہ عمل کی ہدایت سے محروم رکھا ہے۔

# نصب العین اور لائحہ عمل کا لازم و ملزوم ہونا

یہ اسلام کی جامعیت اور صداقت و حقانیت کی واضح دلیل ہے کہ اس نے انسانوں کو بیک وقت نصب العین اور اس کے حصول کے حتمی لائحہ عمل، دونوں کی ہدایت فراہم کی ہے۔ نبی اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کی بعثت کا مقصد بیان کرتے ہوئے قرآن مجید میں ارشاد ہوتا ہے:۔

| | |
|---|---|
| هُوَ الَّذِيٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ | وہی ذات ہے جس نے اپنے رسول کو |
| بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ | ہدایت اور دینِ حق دے کر بھیجا تاکہ آپ |
| لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ | تمام ادیان پر غالب کر دے خواہ مشرک |
| وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ (الصف ۹) | اسے ناپسند کرتے رہیں۔ |

اس آیتِ کریمہ میں دو چیزیں عطا کر کے حضور علیہ السلام کے مبعوث کیے جانے کا ذکر ہے۔ ہدایت اور دین حق ——— بعد میں بعثت کا مقصد بیان کیا ہے کہ حضور علیہ السلام کو اس لیے مبعوث کیا گیا کہ دینِ حق کو تمام ادیان و مذاہب اور نظامہائے حیات پر غالب اور فتح یاب کیا جا سکے۔ آخری حصے (لیظهره علی الدین کله) میں صاف ظاہر ہے۔ وہ نصب العین بیان کیا گیا ہے جو عالمگیر انقلاب کے ذریعے غلبہ اسلام سے عبارت ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ "ہدایت" اور "دینِ حق" سے مراد کیا ہے؟ کیا دینِ حق کی اصطلاح جو اسلام کے مکمل ضابطہ حیات کے لیے مستعمل ہے۔ "ہدایت" کو شامل نہیں تھی کہ ہدایت کو دینِ حق سے جدا کر کے بیان کیا گیا؟ کیا ہدایت، دینِ حق اور دینِ حق، ہدایت نہیں ہے؟ اگر یہ حقیقت میں ایک ہی چیز ہیں تو انہیں دو عنوانات کے تحت واوِ عاطفہ کے ذریعے الگ الگ کیوں بیان کیا گیا ہے؟ یہی امر قابلِ غور ہے۔

حقیقت میں دینِ حق سے مراد اسلام کی وہ جملہ تعلیمات ہیں جو انسانی زندگی کے تمام

ظاہری و باطنی پہلوؤں کو محیط مکمل نظامِ حیات کے طور پر ہمیں عطا کی گئیں۔ فکر و عمل کے اسی جامع نظام کا نام "دینِ حق" ہے۔ اسی کو عالمی سطح پر غالب کرنا اور تمام باطل طاغوتی قوتوں کے مقابلے میں فتح یاب کرنا بعثتِ نبوی کا مقصد اور ملتِ اسلامیہ کا حقیقی نصب العین ہے۔ لیکن یہاں سوال یہ پیدا ہوتا تھا کہ دینِ حق تو حضور علیہ السلام کو عطا کر دیا گیا اور اس کے عالمگیر غلبے کے لیے انقلاب بپا کرنا بھی بطور نصب العین متعین کر دیا گیا۔ مگر اس کے غلبہ و تسلط کے حصول کا طریق کار کیا ہوگا؟ باطل قوتوں کے مقابلے میں اس انقلابی جدوجہد کو ساحلِ کامرانی تک پہنچانے کا لائحہ عمل اور حتمی پروگرام کا نام "ہدایت" ہے۔ جو دینِ حق کے ساتھ لازمۂ نبوت کے طور پر حضور علیہ السلام کو عطا کی گئی۔ اگر دینِ حق کو عالمِ کفر و شرک کی مزاحمت کے باوجود زندگی میں غالب کرنے کا لائحہ عمل نہ ہوتا تو نہ دینِ حق کی تعلیم کا کوئی فائدہ تھا اور نہ اسے غالب کرنے کے نصب العین کا۔ کیونکہ دینِ حق اس لیے تھا کہ اسے باطل نظامِ زندگی پر غالب کیا جائے اور باطل نظامِ زندگی پر دینِ حق کو غالب کرنے کا نصب العین تب ہی سود مند ہو سکتا تھا کہ اس کے لیے لائحہ عمل اور طریقِ کار بھی مہیا کیا جاتا۔ چنانچہ قرآن حکیم نے دو ٹوک انداز میں اعلان کیا کہ باری تعالیٰ نے حضور علیہ السلام کو عالمی سطح پر غلبۂ اسلام کا نصب العین اور اس میں حتمی کامیابی کے لیے واضح لائحہ عمل کی ہدایت عطا کر کے بھیجا ہے۔ اب اگر پورا عالمِ کفر و شرک اس مقصد کے حصول میں رکاوٹ بنتا رہے تب بھی پیغمبرانہ جدوجہد اپنے نتائج پیدا کر کے رہے گی اور اپنی منزلِ مقصود کو پا کر رہے گی۔ کیونکہ مقصد اور لائحہ عمل دونوں کی صحت و حقانیت اور اثر انگیزی کی ضمانت خود ربِ ذوالجلال نے فراہم کر دی ہے۔

بعثتِ نبوی کا مقصد تب ہی پورا ہو سکتا تھا کہ آپ کو دینِ حق کی تعلیمات اور اس کے غلبے کا لائحہ عمل دونوں چیزیں عطا کی جاتیں۔ اگر صرف تعلیماتِ اسلامی تمام و

تمام مہیا کر دی جائیں۔ لیکن باطل اقدارِ حیات کے مقابلے میں انہیں غالب کرنے نافذ کرنے کا طریقہ نہ بتایا جاتا تو مقصدِ بعثت پورا نہ ہو سکتا تھا۔ حصولِ نصب العین کی جدوجہد میں اصل کامیابی لائحہ عمل کی ہدایت پر منحصر تھی۔ اس لیے سب سے پہلے "الہدیٰ" کے ذریعے لائحہ عمل عطا کیے جانے کا ذکر کیا گیا اور بعد میں دینِ حق کا۔

یہ اسی ہدایتِ ربانی پر مشتمل پیغمبرانہ لائحہ عمل کا فیضان تھا کہ حضور علیہ السلام کی تئیس سالہ جدوجہد کے نتیجے میں عالمِ کفر و شرک کے مقابلے میں دینِ حق کو غلبہ نصیب ہو گیا۔ اور باطل اقدارِ حیات کے مقابلے میں اسلامی اقدار کو تمکن اور استحکام عطا ہو گیا جس پر قرآن نے یہ اعلان کیا:۔

| | |
|---|---|
| اَلْیَوْمَ یَئِسَ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا مِنْ دِیْنِکُمْ فَلَا تَخْشَوْهُمْ وَاخْشَوْنِ ؕ اَلْیَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِیْنَكُمْ وَ اَتْمَمْتُ عَلَیْكُمْ نِعْمَتِیْ وَ رَضِیْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِیْنًا (المائدۃ ، ۳) | آج کے دن وہ لوگ مایوس ہو گئے جنہوں نے تمہارے دین کا انکار کیا تھا۔ پس (اب) ان سے مت ڈرنا، مجھ سے ڈرنا، آج کے دن میں نے تمہارے لیے تمہارا دین مکمل کر دیا اور تم پر اپنی نعمت تمام کر دی اور تمہارے لیے اسلام کو بطور دین منتخب کر لیا۔ |

اب سوال یہ ہے کہ فتح مکہ کے بعد حجۃ الوداع کے موقع پر قرآنِ حکیم فخر و مباہات کے ساتھ اسلام اور انقلابِ محمدی کی جس کامیابی اور کفار کی ناکامی و مایوسی کا اعلان کر رہا ہے۔ کیا یہ محض ایک حادثہ اور تاریخی اتفاق تھا یا کسی باقاعدہ لائحہ عمل اور پروگرام کا نتیجہ تھا؟

اگر اسلام کی یہ کامیابی محض تاریخی اتفاق تھی تو اس میں نہ خدا کا کوئی کمال رہا، نہ رسولِ اکرم صلے اللہ علیہ و آلہ وسلم کی پیغمبرانہ قیادت کا اور نہ قرآن کی رہنمائی اور ہدایت کا،

چنانچہ اس امر کو اعلانِ فتح کے طور پر بیان کرنا شاعرانہ تعلّی کے سوا کوئی حیثیت نہیں رکھتا۔ صاف ظاہر ہے کہ اس تصور کو قبول نہیں کیا جا سکتا۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ اسلام کی یہ کامیابی ایک باقاعدہ لائحہ عمل اور پروگرام کا نتیجہ تھی۔ بلکہ بعثتِ محمدیؐ کے اس مقصد کی باضابطہ تکمیل تھی۔ جس کا اعلان روزِ اوّل سے کر دیا گیا تھا۔ یہی نقطہ اساسِ ایمان اور عظمتِ اسلام کا عکاس ہے۔

اب یہاں دوسرا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر کفر و طاغوت کے مقابلے میں اسلام کی یہ کامیابی ایک باقاعدہ قرآنی لائحہ عمل اور پیغمبرانہ پروگرام کا نتیجہ تھی تو کیا قرآنی ہدایت اور پیغمبرانہ قیادت کی وہ تاثیر صرف عہدِ رسالت اور عہدِ صحابہ کے لیے مخصوص تھی یا قیامت تک ملتِ اسلامیہ کے ہر دور کے لیے مفید اور نتیجہ خیز ہے؟

اگر قرآن اور سنتِ مصطفویؐ کا عطا کردہ لائحہ عمل اور اس کی تاثیر صرف اس دور کے لیے مختص تھی اور آج اس کی افادیت اور اثرانگیزی باقی نہیں رہی تو اس وقت اسلام سے تمسک اور اس پر اصرار کی آخر کیا ضرورت باقی رہتی ہے؟ یہ موقف اسلام ترک کرنے کا محرک بنے گا اور اگر آج بھی قرآنی ہدایت اور مصطفوی قیادت کی تاثیر اور نتیجہ خیزی اسی طرح زندہ و تابندہ ہے تو پھر وہ لائحہ عمل کہاں ہے جس نے قرونِ اولیٰ میں نتائج پیدا کیے تھے۔ اسی سے آج بھی غلبۂ حق کی آرزو پوری ہو سکتی ہے۔ وہی پروگرام آج بھی اسلام کی کامیابی اور کفر و شرک کی مایوسی کا باعث ہو سکتا ہے۔ اگر اسی قرآنی طریقِ انقلاب اور پیغمبرانہ لائحہ عمل کو آج بھی حصولِ مقصد کے لیے اپنا لیا جائے تو معرکۂ حق و باطل میں آج کا ہر یوم بھی "الیوم" ہو سکتا ہے۔ باطل اقدارِ حیات کو مٹا کر حق کی اقدار کو آج بھی غالب کیا جا سکتا ہے زوال و انحطاط کے احوال کو بدل کر آج بھی ――――― فتح و عروج سے ہمکنار ہوا جا سکتا ہے۔ نجی زندگی سے لے کر بین الاقوامی زندگی تک اسلام کو عملی تسلط آج بھی اسی طرح نصیب ہو سکتا ہے۔ جس طرح پہلے ادوار میں نصیب ہوا ہے۔ مستقبل سے مایوسی کفر ہے۔ ناکامی و نامرادی جس کا مشاہدہ ہم روز و شب کرتے ہیں۔

دراصل ہمارے اپنے وضع کردہ پروگراموں اور لائحہ ہائے عمل کی ناکامی ہے۔ جسے ہم نے حق کی ناکامی کا نام دے دیا ہے۔ ورنہ ہر دور میں حق، حق ہے اور اسی کا شیوہ غالب آنا ہے جیسا کہ قرآنِ مجید میں موعود ہے :۔

جَآءَ الْحَقُّ وَ زَهَقَ الْبَاطِلُ ؕ اِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوْقًا — حق آیا اور باطل بھاگ گیا، بیشک باطل ہی بھاگنے والا ہے۔

مذکورہ بالا آیت کی روشنی میں یہ حقیقت مترشح ہو چکی ہے کہ باری تعالےٰ نے اسلام کے ذریعے اُمتِ مصطفوی کو دو طرح ہدایت عطا فرمائی ہے۔ نصب العین کی ہدایت، اور نتیجہ خیز لائحہ عمل کی ہدایت۔ یہ دو ہدایتیں اسلام میں لازم و ملزوم ہیں۔ ان میں سے کسی کا تعین قرآن سے، اور کسی کا اپنی صوابدید سے، دراصل قرآن کے بعض حصے پر ایمان لانے اور بعض کا انکار کرنے کے مترادف ہے۔ قرآن مجید میں بڑی صراحت کے ساتھ بیان کیا گیا ہے :۔

لِكُلٍّ جَعَلْنَا مِنْكُمْ شِرْعَةً وَّ مِنْهَاجًا (المائدۃ ۴۸) — ہم نے تم میں سے ہر ایک کے لیے شریعت اور طریقِ کار مہیا کر دیا ہے۔

گویا یہ وعدۂ الٰہی ہے کہ ملّتِ اسلامیہ کے ہر فرد اور ہر طبقے کے لیے، ہر دور میں دو نعمتیں برقرار رہیں گی۔ ایک "شریعت" اور دوسری "منہاج" یعنی "نصب العین اور اس کے حصول کا لائحہ عمل"

"شریعت" سے مراد وہ راستہ اور لائحہ عمل یا طریقِ کار ہے۔ جس کے ذریعے غلبۂ حق کا مقصد حاصل ہو سکے: تاکہ شریعت کا نفاذ واقع ہو اور شر کے مقابلے میں خیر کو استحکام نصیب ہو۔ جب تک دنیا میں اسلام کی تعلیم اور قرآن کی ہدایت باقی ہے غلبۂ حق اور نفاذِ شریعت کا نصب العین قائم رہے گا اور جب تک امتِ مسلمہ کے لیے یہ "نصب العین" موجود ہے۔ اس کا "منہاج" یعنی "لائحہ عمل" بھی قائم رہے گا۔ دینِ اسلام

کہ یہ دونوں پہلو باہم لازم و ملزوم ہیں۔ ان میں سے کسی کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

## قومی نصب العین کے حصول کا لائحہ عمل کیا ہے؟

اس سے قبل ہم قومی نصب العین پر تفصیل گفتگو کر چکے ہیں اور لائحہ عمل کی اہمیت و ضرورت بھی واضح کر چکے ہیں۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ قومی نصب العین کے حصول کا قرآنی لائحہ عمل کیا ہے اور اس کی ہدایت ہمیں قرآن سے کس طرح ملتی ہے؟

معمولی تامل سے یہ بات سمجھ میں آجاتی ہے کہ قومی زندگی ہمیشہ تین بنیادی شعبوں پہ منقسم ہوتی ہے :-

۱۔ سیاسی شعبۂ زندگی
۲۔ معاشی شعبۂ زندگی
۳۔ معاشرتی شعبۂ زندگی

اگر یوں کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا کہ قومی زندگی اجتماعی زندگی کے ان تین شعبوں کے باہمی ربط و تعلق سے وجود میں آتی ہے۔ لہٰذا قومی سطح کا نصب العین حاصل کرنے کے لیے جو لائحۂ عمل مطلوب ہے۔ وہ بھی ان تین ہی پہلوؤں ان تین ہی پہلوؤں پر مشتمل ہوگا۔

- لائحۂ عمل کا سیاسی پہلو
- لائحۂ عمل کا معاشی پہلو
- لائحہ عمل کا معاشرتی پہلو

نصب العین غلبۂ حق کی خاطر عالمگیر انقلاب کے لیے ایک صالح معاشرے کا قیام ہے۔ لہٰذا اس سطح پر "معاشرتی صالحیت" وہ قومی مقصد ہے۔ جس کے حصول کی جدوجہد مطلوب ہے اور اس کا لائحہ عمل عبارت ہے۔ سیاسی ظلم اور جبر و استبداد

کے خاتمے سے، معاشی ناانصافی اور استحصال کے خاتمے سے اور معاشرتی ناہمواری اور عدم استحکام کے خاتمے سے۔"

جب تک سیاسی انقلاب کے ذریعے حقوق کی آزادی، معاشی انقلاب کے ذریعے تخلیقی جدوجہد کی بحالی اور سماجی انقلاب کے ذریعے عدل و انصاف اور مساوات کی فراوانی میسر نہ آئے۔ کسی بھی نظام کے نفاذ سے صالح اور مثالی معاشرہ وجود میں نہیں لایا جاسکتا۔ یہ وہ بنیادی لائحہ عمل ہے۔ جس کی نشاندہی قرآن نے کی ہے۔ اسے اپنائے بغیر قرآن و سنت کی تعلیم ہو یا فقہ و شریعت کے اوامر و نواہی کی تبلیغ، خطیبانہ وعظ و نصیحت ہو یا صوفیانہ ارشاد و تربیت، کسی طریق پر بھی معاشرے کو باطل نظامِ زندگی سے نجات نہیں دلائی جاسکتی۔ قوم کو صحیح تقویٰ و صالحیت سے آراستہ نہیں کیا جاسکتا اور غلبۂ حق کے نصب العین کے حصول کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا۔

## دورِ جدید کی اصلاحی تحریکات کا فکری المیہ

یہ مسئلہ کہ کسی معاشرے یا قوم میں انقلاب کس طرح بپا ہو۔ دورِ جدید کی اصلاحی تحریکات کے بانیوں میں مختلف فیہ رہا ہے۔ ان مسلم مفکرین نے اس سلسلے میں دو نقطہ ہائے نظر پیش کیے ہیں۔

ایک یہ کہ پہلے معاشرے میں تعلیم و تربیت کے ذریعے اخلاقی انقلاب بپا کیا جائے اور پھر جمہوری انداز سے "نتیجۃً" سیاسی انقلاب از خود بپا ہو جائے گا۔

دوسرے یہ کہ پہلے سیاسی انقلاب بپا کیا جائے اور اس کے نتیجہ میں معاشرہ اخلاقی انقلاب سے ہمکنار ہو سکے گا۔

● پہلا موقف پیش کرنے والوں کے نزدیک فی الواقع تبدیلیِ اقتدار ہی اصل مقصد تھا اور معاشرے کے اندر بزعمِ خویش اخلاقی انقلاب کو انہوں نے اس مقصد کے

حصول کا ذریعہ سمجھا۔ یہ نقطۂ نظر قطعی طور پر غلط اور قرآنی فلسفۂ انقلاب کے منافی تھا۔ کیونکہ باطل کے اقتدار کے ہوتے ہوئے تعلیم و تربیت اور جمہوری جدو جہد کے ذریعے معاشرے میں اخلاقی انقلاب بپا کرنے کی آرزو کرنا عبث ہے۔ پیغمبرانہ انقلاب کی پوری تاریخ اس امر کی تائید نہیں کرتی اور نہ قرآن و سنّت کی تعلیمات اس تصور کی حمایت کرتی ہیں۔ اس نقطۂ نظر کو پیش کرنے والے اپنی عملی جدو جہد میں بالآخر اس موقف پر قائم نہ رہ سکے۔ انہوں نے حصولِ اقتدار کے مقصد کی خاطر ہر راستے کو بطور ذریعہ اپنا لیا۔ ذریعے کے باب میں اخلاقی و غیر اخلاقی اور جائز و ناجائز کا کوئی امتیاز ان کے پیشِ نظر نہ رہا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ جس اخلاقی انقلاب کے تصور کو انھوں نے ابتداءً بطور ذریعہ اپنایا تھا۔ جب عملاً اس میں ناکامی ہوئی تو قوت و اقتدار کے حصول کی طلب اتنی شدید ہو گئی کہ ان کے پیشِ نظر ذریعے کا صحیح تعین بھی غیر ضروری ہو گیا۔ انہوں نے ہر سطح پر حصولِ قوت و اقتدار کے مقصد کی خاطر ہر ذریعے اور ہر طریقے کو اپنانا ضروری سمجھا اور اسی جدوجہد کا نام بزعمِ خویش "اسلامی انقلاب" رکھ دیا۔

انھوں نے اس نام نہاد "اسلامی انقلاب" کے نام پر ہر جور و استبداد اور ظلم و تشدد کو عین مقتضائے اسلام سمجھا، اسی کو حق کا نام دیا اور جو کوئی ان کے راستے میں مزاحم ہوا اسے کافر و ملحد اور لادین قرار دے دیا۔ اسلام کے نام پر ہونے والے اس ظلم کی مثال تاریخِ اسلام میں کم ملتی ہے۔ اس انداز کی جدو جہد کرنے والے شاید اس حقیقت کو فراموش کر چکے ہیں کہ اس سے ردّ عمل کے طور پر اسلام کے خلاف نفرت، سرکشی اور بغاوت جنم لے گی اور اس کے ذمہ دار وہ خود ہوں گے۔ اس طرح کی جدو جہد سے معاشرے کے اندر صالحین پیدا نہیں کیے جا سکتے۔

- دوسرا موقف جزوی طور پر درست تھا کہ معاشرے کے اندر اخلاقی انقلاب کے لیے پہلے سیاسی انقلاب ناگزیر ہے۔ لیکن یہ نقطۂ نظر چونکہ جامع اور ہمہ گیر نہ تھا۔

اس لیے اس لائحہ عمل سے بھی مطلوبہ "معاشرتی صالحیت" یا "اخلاقی انقلاب" کا حصول ممکن نہ رہا۔

مذکورہ بالا دونوں نظریات کے برعکس حصولِ مقصد کے لائحہ عمل کی جو ہدایت قرآن سے میسّر آتی ہے۔ وہ تین طرح کے انقلابات پر مشتمل ہے۔

سیاسی انقلاب، معاشی انقلاب، سماجی انقلاب

ان کے نتیجے کے طور پر ہی معاشرہ اس "اخلاقی انقلاب" یا "اجتماعی صالحیت" سے بہرہ ور ہو سکتا ہے۔ جو اسلام کے عالمی نصب العین کے حصول کی ضامن ہے۔

## لائحہ عمل کا قرآنی تصور

قرآن حکیم نے صحابہ کرام کی اجتماعی زندگی میں بپا ہونے والے اس اخلاقی انقلاب اور صالح مثالی معاشرے کے قیام کے اصول کی نشاندہی کی ہے۔ جو خاتم الانبیاء صلے اللہ علیہ وسلم کے زیرِ قیادت معرضِ وجود میں آیا تھا۔ قیامِ مدینہ کے دوران صحابہ کرام کو ان کی سابقہ مکی زندگی کی یاد دلاتے ہوئے ارشاد فرمایا گیا :۔

وَاذْكُرُوْٓا اِذْ اَنْتُمْ قَلِيْلٌ مُّسْتَضْعَفُوْنَ فِي الْاَرْضِ تَخَافُوْنَ اَنْ يَّتَخَطَّفَكُمُ النَّاسُ فَاٰوٰىكُمْ وَاَيَّدَكُمْ بِنَصْرِهٖ وَرَزَقَكُمْ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ

(الانفال، ۲۶)

اور یاد کرو جب تم تعداد میں تھوڑے تھے۔ معاشی طور پر کمزور اور غیر مستحکم تھے (اور) تم ڈرتے رہتے تھے کہ کہیں طاقتور لوگ تمہیں اُچک کر نہ لے جائیں پس اس نے تمہیں آزاد ٹھکانہ عطا کیا اور اپنی مدد سے تمہیں تقویت بخشی اور تمہیں پاکیزہ رزق عطا کیا تاکہ تم اس کے شکر گزار بندے بن سکو۔

اس آیت کریمہ میں تین حالتوں کی طرف اشارہ ہے:

۱۔ **قلیل**۔۔۔ تعداد میں تھوڑا ہونا "سیاسی اقلیت" پر دلالت کرتا ہے۔ لہٰذا اس لفظ کے ذریعے صحابہ کو کفار و مشرکین مکہ کے مقابلے میں سیاسی طور پر کمزور اور محکوم ہونے کی یاد دلائی جا رہی ہے۔

۲۔ **مستضعفون فی الارض** ۔۔۔ زمین میں کمزور ہونا معاشی عدم استحکام پر دلالت کرتا ہے۔ لہٰذا ان الفاظ کے ذریعے صحابہ کو مکی زندگی میں غیر مسلموں کے مقابلے میں معاشی طور پر کمزور، محتاج اور غیر مستحکم ہونے کی یاد دلائی جا رہی ہے۔

۳۔ **تخافون ان یتخطفکم الناس** ۔۔۔ طاقتور لوگوں کے اُچک لے جانے کا خوف معاشرتی طور پر کمزور اور غیر محفوظ ہونے پر دلالت کرتا ہے۔ لہٰذا ان الفاظ کے ذریعے صحابہ کو مکی معاشرے میں سیاسی اور معاشی کمزوری کے باعث سماجی عدم استحکام اور ظلم و استحصال کا شکار ہونے کی یاد دلائی گئی ہے۔

دراصل قیام مکہ کے دوران مسلمانوں کے سیاسی، معاشی اور معاشرتی عدم استحکام کا ذکر اس لیے کیا گیا ہے کہ انہیں یہ یقین دلایا جا سکے کہ اندریں صورت تم مطلوبہ انقلاب سے ہمکنار نہیں ہو سکتے تھے۔ غلبۂ حق اور نفاذِ دین کی منزل تک پہنچنا۔ ان حالات میں تمہارے لیے ہرگز ممکن نہ تھا۔ چنانچہ حصولِ مقصد کی خاطر باری تعالٰی نے جو لائحہ عمل اور راستہ تمہارے لیے منتخب فرمایا۔ وہ بھی ان تین حالتوں کے پیش نظر تین ہی پہلوؤں پر مشتمل تھا۔ اس لائحہ عمل کا ذکر قرآن مجید نے ان لفظوں میں کیا ہے:۔

۱۔ **فآوٰکم** ۔۔۔ تمہیں آزاد سماجی زندگی عطا کر دی۔ یعنی غیر محفوظ، غیر مستحکم اور ناہموار معاشرتی زندگی سے نجات دلا کر تمہیں الگ خطۂ زمین کی صورت میں آزاد ٹھکانہ عطا کیا تاکہ تم خوشگوار ماحول میں آزادانہ طریق پر اپنے حقوق بجا لا سکو۔ یہ

سماجی انقلاب" ہجرتِ مدینہ" کے نتیجے میں واقع ہوا۔

۲۔ وایّدکم بنصرہٖ ـــــ تمہیں اپنی مدد سے تقویت اور طاقت بخشی۔ یعنی تمہیں غلامی و محکومی اور جور و استبداد کی زندگی سے نجات دلا کر الگ اقتدار اور حکومت عطا کی۔ جس سے تمہیں سیاسی طور پر آزادی اور استحکام نصیب ہو گیا۔ یہ سیاسی انقلاب" میثاقِ مدینہ" کے نتیجے میں بپا ہوا۔ جس کے ذریعے حضور علیہ السلام اسلامی ریاستِ مدینہ کے سربراہ مقرر ہو گئے اور تمام غیر مسلم طبقات مسلمانوں کے سیاسی اقتدار کے تحت اقلیتیں قرار پا گئے۔

۳۔ ورزقکم من الطیّبٰت ـــــ تمہیں پاکیزہ رزق عطا کیا یعنی تمہیں معاشی کمزوری، ناانصافی اور استحصال سے نجات دلا کر ایسی مستحکم اور منصفانہ معاشی زندگی عطا کر دی کہ کوئی شخص بھی معاشی تعطل کا شکار نہ رہا۔ یہ معاشی انقلاب "مواخاتِ مدینہ" کے نتیجے میں بپا ہوا۔ جس کے ذریعے تمام اہلِ ثروت انصار نے مہاجرین صحابہ کو اپنے معاشی وسائل میں برابر کا شریک بنا لیا۔

قرآنِ حکیم نے ان تین پہلوؤں پر مشتمل انقلاب کا ذکر" لائحہ عمل" کے طور پر کیا ہے کیونکہ صحابہ کی قومی زندگی کے مذکورہ بالا تینوں شعبوں میں اس تبدیلی کا مقصد" لعلکم تشکرون " (تاکہ تم خدا کے شکر گزار بندے بن سکو) کے الفاظ میں بیان کیا گیا ہے انفرادی طور پر شکر گزاری کا وصف تو صاف ظاہر ہے۔ صحابہ کرام کو قبل از ہجرت بھی نصیب تھا۔ لیکن ضرورت اس امر کی تھی کہ" معاشرتی صالحیت" اور" اخلاقی انقلاب" سے بہرہ ور ہو کر ایسا صالح اور مثالی معاشرہ وجود میں لایا جائے جو عالمی سطح پر کلمہ حق کے غلبہ و اعلاء کا باعث ہو سکے۔ یہ مقصد اس لائحہ عمل کے بغیر پورا نہ ہو سکتا تھا۔ اگر معاشرے کو سیاسی، معاشی اور سماجی انقلاب کے بغیر محض احکامِ الٰہیہ اور حدودِ شرعیہ کی تبلیغ اور نفاذ کے ذریعے صحیح معنوں میں اسلامی، مثالی انقلابی معاشرہ بنایا

جا سکتا تو سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کبھی ہجرت نہ فرماتے بلکہ مکہ کی غیر مسلم سیاسی اور معاشی قیادت سے تعرض کئے بغیر اپنے پیروکاروں کو اسلام پر عمل پیرا ہونے کی تلقین فرماتے رہتے۔

حقیقت یہ ہے کہ آپؐ کو ہجرتِ مدینہ کا حکم اسی لیے دیا گیا تھا کہ باطل کے سیاسی و معاشی اقتدار میں اجتماعی صالحیت اور ملی سطح پر مطلوبہ انقلاب کا خواب شرمندۂ تعبیر نہیں ہو سکتا تھا۔ مسلمانوں کی ناگفتہ بہ سیاسی، معاشی اور سماجی حالت کے پیشِ نظر یہ ناممکن تھا کہ وہ اپنے قومی نصب العین کو پا سکیں۔ ان حالات کے قائم رہتے ہوئے شریعت کے اوامر و نواہی کے نفاذ سے مطلوبہ نتائج پیدا نہیں ہو سکتے تھے۔ اس لیے ہجرت کے بعد آنحضرت صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اوّلین توجہ مسلمانوں کے سیاسی اور معاشی استحکام کی طرف دی۔ "میثاقِ مدینہ" اور "مواخاتِ مدینہ" کے ذریعے انہیں سیاسی اور معاشی طور پر آزاد اور مستحکم کر دیا۔ ہر قسم کے ظلم و استبداد اور ناانصافی و استحصال کے امکانات ختم کر دیئے۔ ہر ایک کی زندگی میں تخلیقی جدوجہد کو بحال کیا۔ ہر کسی کو جینے اور ہر لحاظ سے فروغ پانے کے یکساں مواقع مہیا کیے۔ ہر شخص کو بلا امتیاز باعزت سماجی زندگی بسر کرنے کے قابل بنایا، معاشرے کی اجتماعی زندگی سے محرکاتِ جرم و معصیت کا خاتمہ کیا۔ آپؐ نے ان بنیادی تبدیلیوں کے ساتھ شریعت کے اوامر و نواہی کو باقاعدہ طور پر رائج کیا۔ اسلامی حدود کے نفاذ کی طرف قدم بڑھایا اور ہر شخص کو غلبۂ اسلام کی خاطر عظیم عالمی انقلاب کے لیے تیار کر دیا۔

یہ مقصد اجتماعی سطح پر سیاسی عدمِ استحکام، معاشی استحصال اور سماجی ناہمواری کو باقی رکھتے ہوئے حاصل نہیں ہو سکتا تھا۔ اس لیے قرآن نے سیاسی، معاشی اور سماجی انقلاب کو قومی نصب العین کے حصول کے لائحہ عمل کے طور پر بیان کیا ہے۔

# ایک مغالطے کا ازالہ

نبی اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کی تیرہ (۱۳) سالہ کی جدوجہد کے بعد ہجرتِ مدینہ کے فیصلے سے بعض ذہنوں کو یہ مغالطہ لاحق ہو سکتا ہے کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے مکہ میں تیرہ سال تک پیغمبرانہ دعوت و تبلیغ کے بعد یہ محسوس کیا کہ یہاں مطلوبہ نتائج پیدا نہیں ہو سکتے۔ اس لیے یہاں سے ہجرت کر جانا چاہیئے۔ گویا ہجرت کا فیصلہ تیرہ سالہ تجربہ کے نتیجے میں کیا گیا تھا۔ اس خیال سے یہ تصور پیدا ہوتا ہے کہ حضور علیہ السلام کی جدوجہد بھی (معاذ اللہ) اقدام و خطا (TRIAL & ERROR) کے انداز میں تھی۔ یہ نقطہ نظر اس لیے غلط اور گمراہ کن ہے کہ اس سے اس ہدایتِ ربانی کی سرپرستی اور وحی الٰہی کی نفی ہوتی ہے جو آپ کو اپنی جدوجہد کے دوران بحیثیت پیغمبر برحق ہر وقت حاصل تھی۔ اگر اس رہنمائی کے باوجود تیرہ سال کے تجربے نے اس نتیجے تک پہنچایا تھا تو پھر (معاذ اللہ) علمِ الٰہی اور پیغمبرانہ بصیرت دونوں عام انسانی علم کی طرح ناقص قرار پاتے ہیں۔ یہاں یہ امر ذہن نشین رہنا چاہیئے کہ ہجرتِ مدینہ کا فیصلہ حضور علیہ السلام نے اپنی رائے اور صوابدید سے نہیں بلکہ براہِ راست حکمِ الٰہی سے کیا تھا۔ اس لیے اقدام و خطا کی ذمہ داری (معاذ اللہ) نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر نہیں بلکہ خود باری تعالےٰ کی ذات پر عائد ہوتی ہے اور ایسا تصور صریح کفر ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ حضورؐ کی تیرہ سالہ کی جدوجہد عین منشاءِ ایزدی اور حکمِ الٰہی کے مطابق انقلابِ محمدیؐ کا پہلا مرحلہ تھا۔ اس مرحلے میں حضورؐ نے کفر و طاغوت کے خلاف عَلَمِ حق بلند کیا۔ دعوت و تبلیغِ اسلام کا آغاز کیا تو نتیجۃً سخت مخالفت و مزاحمت پیدا ہو گئی۔ جو لوگ مخالفت و مزاحمت کے اس شدید ترین ماحول میں ایمان لائے۔ ان پر مشتمل انقلابی جماعت تیار کی گئی۔ اس انقلابی جماعت

کی صحیح تربیت کے لیے اس قدر مخالفت اور مزاحم ماحول سے بہتر کوئی اور ماحول نہیں ہوسکتا تھا۔ جتنی سختی کفار و مشرکین کے رویتے اور ردِّ عمل میں تھی۔ اس سے کہیں زیادہ مضبوطی اور استحکام ان انقلابی اور جاں نثار صحابہ کی سیرتوں میں پیدا کرنا مقصود تھا۔ ورنہ ان کا وجود بھی باقی نہ رہ سکتا۔ اگر اس جاں گسل اور اذیت انگیز مکی ماحول میں رہ کر یہ جماعتِ صحابہ طرح طرح کے مصائب و آلام برداشت نہ کرتی تو یہ عظیم عالمی انقلاب کے دشوار گزار راستوں پر عزم و ہمت کے ساتھ قائم و دائم رہنے کے قابل نہ ہوتی۔ حضورؐ نے جس معاشرے کو اوّلاً انقلاب کے ذریعے بدلنا تھا اسی میں رہ کر اپنے جاں نثار رفقاء کا گروہ تیار کیا اور جب یہ محسوس فرمایا کہ اب اتنی جماعت تیار ہو چکی ہے۔ جس کے ذریعے ایک مثالی معاشرہ تشکیل دے کر غلبۂ حق کے لیے عالمی انقلاب کا آغاز کیا جا سکتا ہے تو حکمِ الٰہی سے مدینہ کی طرف ہجرت فرمائی، وہاں پہنچتے ہی اسلامی ریاست کا سنگِ بنیاد رکھا۔ انقلاب کے جملہ تقاضوں کو پورا کیا اور بالآخر حق و باطل کی مسلح کشمکش کا آغاز کر دیا۔

لہٰذا مکی دَور افراد کی انقلابی تربیت کا دَور تھا اور مدنی دَورِ انقلاب کے باقاعدہ آغاز کا جس کے پہلے مرحلے کی تکمیل "فتح مکہ" کی صورت میں ہوئی اور دوسرے مرحلے کا آغاز اس کے بعد ہوا۔ حقیقت یہ ہے کہ بے لوث اور جاں نثار رفقاء پر مشتمل مضبوط انقلابی جماعت کی تشکیل ہی زیادہ دیر طلب اور محنت طلب کام ہے۔ جس کے بعد دیگر مراحل آسان ہوتے چلے جاتے ہیں۔

## معیاری دین اور معمول بہ دین میں امتیاز

مذکورہ بالا بحث سے یہ امر مترشح ہوتا ہے کہ دینِ حق کی جدوجہد کے دو پہلو ہیں۔ ایک کا تعلق اس کے غلبہ و استعلاء سے ہے۔ جس کی رہنمائی براہِ راست قرآن و

سُنّت سے میسّر آتی ہے۔ یہ ہدایت کسی اور دینی علم یا فن سے اخذ نہیں کی جا سکتی۔ جب کہ معمول بہ دین جو شریعت، طریقت اور عقائد و مسالک کے بنیادی شعبوں میں منقسم ہے، کے فہم کے لیے ان متعدد علوم و فنون کا مطالعہ ضروری ہے۔ جن کی تعلیم مدارس و مکاتب میں دی جاتی ہے۔

لہٰذا کسی معاشرے میں قومی سطح پر یا عالمی سطح پر براہِ راست قرآن و سُنّت کی رہنمائی میں دینِ حق کے سیاسی غلبے کی بحالی کے لیے انقلابی جدوجہد کا نام معیاری دین[1] ہے۔ جب کہ شریعت، طریقت اور عقائد پر مشتمل مذہبی تعلیمات کا نام معمول بہ دین[2] ہے۔

"معمول بہ دین" یعنی شرعی احکام کا نفاذ، تعلیماتِ طریقت و تصوف کا فروغ اور عقائدِ اسلامیہ کا پرچار معاشرے میں تب ہی مطلوبہ نتائج پیدا کر سکتا ہے۔ اگر معیاری دین یعنی دینِ حق کا سیاسی غلبہ و استحکام صحیح طور پر بحال ہو۔

عقائد انسانی زندگی کی فکری و نظریاتی اقدار کی اصلاح سے بحث کرتے ہیں۔ جب کہ شریعت و طریقت انسانی زندگی کی ظاہری و باطنی، عملی اقدار کی اصلاح ہے۔ الغرض معمول بہ دین کا وظیفہ حیاتِ انسانی کی فکری و عملی اقدار اور اخلاقی و روحانی فضائل کی حفاظت، اصلاح اور فروغ ہے۔ لیکن اس حقیقت سے صرفِ نظر نہیں کیا جا سکتا کہ انسانی زندگی کے ان فضائل اور اقدار کی حفاظت تبھی ممکن ہے کہ وہ زندگی میں فی الواقع

---

[1] دینِ حق کے اس پہلو کے لیے معیاری دین کی اصطلاح اس لیے وضع کی گئی ہے کہ یہ اس جدوجہد پر مشتمل ہے جو بعثتِ محمدی صلے اللہ علیہ وسلم کے مقصد اور نزولِ قرآن کی غایت کی تکمیل سے عبارت ہے جس کا ذکر قرآن مجید میں "لیظہرہٗ علی الدین کلّہ" کے الفاظ کی صورت میں آیا ہے۔

[2] یہ اصطلاح اس لیے وضع کی گئی ہے کہ فی الواقع دینِ حق کا یہی پہلو ہے۔ جسے عملاً نافذ سمجھا جاتا ہے یا جس پر انفرادی اور اجتماعی زندگی میں عمل کیا جاتا ہے۔

موجود ہوں۔ اگر باطل قوتوں کے اثر و نفوذ کے باعث حیاتِ انسانی کے فضائل رذائل میں بدل چکے ہوں اور اخلاقی اقدار مٹ کر سرے سے ختم ہو چکی ہوں تو انہیں فقہ و طریقت کی تعلیم سے دوبارہ زندہ نہیں کیا جا سکتا۔ قانونِ شریعت کا وظیفہ اقدار کا تحفظ ہے احیاء نہیں۔ جب زندگی کے محرکات بدل جائیں۔ احوالِ زمانہ میں تغیر رونما ہو جائے۔ حق کی جگہ باطل، صدق کی جگہ کذب، حلال کی جگہ حرام، خیر کی جگہ شر، فضائل کی جگہ رذائل اور رُوحانیت کی جگہ مادیت نے لے لی ہو اور زندگی کے تقاضے قانون و شریعت کی اطاعت کے بجائے ان کی خلاف ورزی اور انحراف سے پورے ہو رہے ہوں تو اندریں صورت نہ احکامِ شرعی کے محض نفاذ سے زندگی میں انقلاب بپا ہو سکتا ہے اور نہ احکامِ فقہی میں اجتہاد سے۔ کیونکہ فقہ و شریعت کا کام زندگی میں موجود اقدار کی حفاظت ہے، مٹی ہوئی اقدار کی بحالی نہیں۔

جب معاشرے کی حالت اس حد تک بگڑ جائے کہ فضائلِ حیات ہی سرے سے مٹ کر ختم ہو چکے ہوں۔ تو ان کا احیاء محض دین کے نفاذ سے نہیں بلکہ صرف معیاری دین کی بحالی سے ہو سکتا ہے۔ تاریخِ اسلام شاہد ہے کہ جب تک دینِ حق کا سیاسی غلبہ بحال رہا اور معاشرے میں اقدارِ حیات بالفعل موجود رہیں۔ اس وقت تک احکامِ شریعت کا نفاذ، طریقت کی تعلیم اور عقائد کا پرچار صحیح نتائج پیدا کرتا رہا۔ جب سے ہمارے معاشرے میں معیاری دین مضمحل ہوا، اسلام کا سیاسی غلبہ و استعلاء باقی نہ رہا۔ معاشی آزادی اور استحکام معدوم ہو گیا اور معاشرتی وحدت اور انصاف کی بنیادیں قائم نہ رہیں تو اقدارِ حیات تہس نہس ہو گئیں۔ وہ دینی ادارے جن کے ذریعے شریعت، طریقت اور عقائد کی تعلیم و تربیت کا کام جو رہا تھا اپنی تمام تر کاوشوں کے باوجود بے اثر ہو کر رہ گئے۔ عقائد اوہام میں بدل گئے اور شریعت و طریقت مُردہ رسوم میں۔ عقائد اور احکام کا کوئی اثر باقی نہ رہا۔ عملی زندگی کا علاقہ

معمول بہ دین کی تعلیمات سے منقطع ہو گیا۔ چنانچہ ان کی صحت و ضرورت پر استدلال بجائے زندگی میں عملی نتائج کے حوالے سے، محض منطقی، فلسفیانہ اور متکلمانہ دلائل سے ہونے لگا۔ جس سے معاشرے کی عملی زندگی پر موت طاری ہو گئی۔ اگر اب بھی علماء و واعظین محض اسی انداز کی تبلیغ اور تعلیم سے معاشرے کے احوال بدلنا چاہیں تو یہ آرزو کیونکر ثمر آور ہو سکتی ہے؟ اس لیے اس وقت قومی زندگی کو ہمہ گیر انقلاب سے بہرہ یاب کرنے کے لیے پھر سے معیاری دین کی اس جدوجہد کی ضرورت ہے جس سے سیاسی قوت و اقتدار اہلِ حق کے ہاتھوں میں منتقل ہو اور قوم کی سیاسی زندگی مثبت انقلاب سے آشنا ہو سکے۔ معاشرے کے اندر ایسا معاشی انقلاب بپا ہو۔ جس سے ہر فرد کی زندگی معاشی تعطل سے پاک ہو اور اس کی تخلیقی جدوجہد بحال ہو سکے اور پھر معاشرہ ایسے سماجی انقلاب سے ہمکنار ہو کہ ہر قسم کا ظلم و استحصال اور ناانصافی و ناہمواری کلیتہً ختم ہو جائے۔ تاکہ افراد کو اپنے فرائض بجالانے اور دوسروں کے حقوق ادا کرنے کا محرک فراہم ہو جائے۔ اس لائحہ عمل کو اپنانے سے معاشرے کی اخلاقی اقدار بحال ہوں گی۔ اس کی زندگی میں پھر سے مطلوبہ فضائل پیدا ہوں گے اور تب معمول بہ دین کا نفاذ اپنا وظیفہ صحیح طور پر سرانجام دے سکے گا۔ اور فقہ و شریعت اور مسلک و طریقت کی تعلیمات کے صحیح نتائج سامنے آسکیں گے۔

## سیاسی انقلاب کا سماجی انقلاب پر مقدّم ہونا

قومی نصب العین کے حصول کے لیے جس لائحہ عمل کا تذکرہ ہم نے پہلے کیا ہے قرآنِ مجید متعدد مقامات پر اس کی شہادت مہیا کرتا ہے۔ دینِ حق کا سیاسی غلبہ و استحکام صحیح طور پر بحال کرائے بغیر معاشرے میں مطلوبہ اخلاقی انقلاب بپا نہیں کیا جا سکتا۔ جب تک سیاسی انقلاب کے ذریعے معیاری دین بحال نہ ہو۔ معمول بہ دین

کی برکات و ثمرات سے بہرہ ور نہیں ہوا جا سکتا۔

● اس سلسلے میں باری تعالیٰ انبیاء و رسل کی بعثت کا ذکر کرتے ہوئے ارشاد فرماتے ہیں:۔

۱۔ لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنٰتِ وَاَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتٰبَ وَالْمِيْزَانَ لِيَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ وَاَنْزَلْنَا الْحَدِيْدَ فِيْهِ بَاْسٌ شَدِيْدٌ وَّمَنَافِعُ لِلنَّاسِ وَلِيَعْلَمَ اللّٰهُ مَنْ يَّنْصُرُهٗ وَرُسُلَهٗ بِالْغَيْبِ اِنَّ اللّٰهَ قَوِيٌّ عَزِيْزٌ (الحدید، ۲۵)

بے شک ہم نے اپنے رسولوں کو دلائل کے ساتھ بھیجا اور ان کے ساتھ (نظامِ زندگی کی تعلیم دینے والی) کتاب اور (زندگی میں عدل و توازن قائم رکھنے والی) ترازو اُتاری، تاکہ لوگ (اعتدال اور) انصاف پر قائم رہیں۔ اور ہم نے لوہا اُتارا، اس میں سخت آنچ اور قوت ہے اور لوگوں کے لیے کئی منافع ہیں (کہ اس سے باطل قوتوں کو زیر کرنے کے لیے آلاتِ جنگ اور دیگر مصنوعات بنائی جاتی ہیں) اور یہ اس لیے کہ اللہ تعالےٰ دیکھے، کہ کون بغیر دیکھے اس کی اور اس کے رسولوں کی (یعنی استیصالِ باطل اور غلبہ و استحکامِ حق کی خاطر جہاد کے مشن کی) مدد کرتا ہے۔ بے شک اللہ تعالےٰ (خود ہی) قوت والا (اور) غالب و فائق ہے۔

اس آیتِ کریمہ میں انبیاء و رسل کی بعثت کے ساتھ تین چیزوں کے نازل کیے جانے کا ذکر ہے۔ **کتاب**، میزان اور حدید

۱۔ نزولِ کتاب کا مقصد اور غرض و غایت بنی نوعِ انسان کو راہِ ہدایت سے آشنا کرنا ہے۔ تاکہ وہ گمراہی و ضلالت کی زندگی سے نجات پا کر صراطِ مستقیم پر

گامزن ہو سکیں۔ اس مقصد کے لیے کتاب دنیوی اور اُخروی دونوں قسم کی ہدایت کا سامان مہیا کرتی ہے۔

(ii) نزولِ میزان کا مقصد بھی واضح ہے بلکہ قرآن نے خود اسے "لِيَقُومَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ" (تاکہ لوگ اعتدال و توازن اور عدل و انصاف کے ساتھ قائم رہ سکیں) کے الفاظ کی صورت میں بیان کر دیا ہے۔ لہٰذا "ترازو" اس امر کی نشاندہی کرتا ہے کہ لوگ اپنی زندگی کے جملہ معاملات میں خواہ وہ عبادات سے متعلق ہوں یا معاملات سے دنیا سے متعلق ہوں یا آخرت سے۔ ہر لحاظ سے معتدل اور متوازن زندگی بسر کریں۔ کسی بھی معاملے میں انتہاپسندی اور تشدد سے کتاب کی تعلیمات کا مقصد فوت ہو جاتا ہے۔ جس طرح کچھ لوگوں نے دنیوی متاع و دولت کی خاطر آخرت کو کلیۃً فراموش کر دیا اور قرآنِ مجید نے کہا۔

يَشْرُونَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا بِالْآخِرَةِ (النساء ۷۴) — وہ دنیوی زندگی کو آخرت کے بدلے میں خرید لیتے ہیں۔

یہ وطیرہ بھی انتہاپسندی تھا جو دنیوی شغف اور انہماک کی صورت میں اپنا لیا گیا۔ اس کے برعکس کچھ لوگوں نے آخرت کی خاطر دنیا کو بالکل چھوڑ دیا اور راہبانہ زندگی اپنالی۔ یہ وطیرہ بھی انتہاپسندی تھا جو اُخروی شغف اور انہماک کی صورت میں اپنایا گیا۔ میزان (ترازو) عطا کیے جانے کا مقصد یہی تھا کہ لوگوں میں دین پر عمل پیرا ہوتے ہوئے اعتدال اور توازن قائم رہے۔ نہ دنیا کے شغف میں اس قدر محو ہو جائیں کہ آخرت یاد نہ رہے اور نہ ہی آخرت میں محو ہونے کی یہ صورت ہو کہ دنیا ہی ترک ہو جائے۔ مذہبی اور دنیوی دونوں فرائض منصفانہ طریق پر اس طرح ادا ہونے چاہئیں کہ انسانی زندگی اعتدال و توازن کے باعث صحیح حُسن کا مرقع نظر آئے۔

(iii) نزولِ حدید کا مقصد بھی قرآنِ مجید نے خود واضح کر دیا ہے کہ اس میں

آنچ اور قوت ہے ۔ لوگوں کے لیے منافع ہیں اور نازل اس غرض سے کیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ یہ دیکھنا چاہتے ہیں کہ کون خدا ورسول کی مدد کرتا ہے ۔ یعنی خدا ورسول کے دین کے غلبہ و استحکام کے لیے باطل قوتوں کے ساتھ جہاد کرتا ہے ۔ یہ لوہا چونکہ آلاتِ جنگ میں استعمال ہوتا ہے اور جو جنگ خدا اور رسول کے لیے لڑی جاتی ہے اس کا واضح مقصد دینِ حق کا غلبہ ہوتا ہے ۔ جسے اصطلاح میں معیاری دین کی بحالی کا نام دیا گیا ہے اس لحاظ سے لوہا اور اس کی شدت و قوت دینِ حق کے غلبہ و اقتدار سے استعارہ ہے ۔

چنانچہ تیسری چیز جو رب ذوالجلال نے اپنے بعض انبیاء و رسل کو (جن کا ذکر اس آیت مبارکہ میں ہے) عطا کی، وہ "دینِ حق کا سیاسی غلبہ و استحکام" تھا ۔ کیونکہ اس کے بغیر نہ کتابِ الٰہی کی تعلیمات کی کوئی عملی افادیت ممکن تھی اور نہ عدل و انصاف پر مشتمل نظام کی ۔ "کتاب اور میزان" دونوں سے معمول بہ دین تشکیل پاتا ہے اور حدید (قوت و اقتدار) سے معیاری دین کی بحالی ہوتی ہے ۔ اگر یہ مدعا پیشِ نظر نہ ہو تو لوہے کی بطور دھات کیا خصوصیت تھی کہ قرآن انبیاء علیہم السلام کے لیے اس کے نزول کا ذکر فرماتا ۔ اگر قرآن "لوہے" کے نازل ہونے کا ذکر کرتا ہے تو صاف ظاہر ہے کہ اس لفظ کی کوئی دینی فضیلت ہوگی اور وہ دینی فضیلت یہی ہے جسے اوپر بیان کر دیا گیا ہے ۔

اس آیتِ کریمہ سے یہ حقیقت ثابت ہو گئی کہ سیاسی انقلاب کے ذریعے دینِ حق کا غلبہ و استحکام صحیح طور پر بحال کیے بغیر کتاب و سنت کی تعلیمات کا محض پرچار اور تبلیغ مطلوبہ نتائج پیدا نہیں کر سکتی ۔

- ایک اور مقام پر یہی تصور مزید صراحت کے ساتھ مذکور ہے ۔ ارشاد ہوتا ہے ۔

| | |
|---|---|
| ٢۔ وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا | اللہ تعالیٰ نے وعدہ کیا ہے ۔ ان لوگوں سے |
| مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ | جو تم میں سے ایمان لائے اور انہوں نے |
| لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ | اچھے اعمال کیے کہ ضرور بالضرور انہیں |

كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِيْنَهُمُ الَّذِي ارْتَضٰى لَهُمْ وَلَيُبَدِّلَنَّهُمْ مِّنْ بَعْدِ خَوْفِهِمْ اَمْنًا ط

(النور، ۵۵)

زمین میں خلافت (یعنی سیاسی قوت و اقتدار) عطا کرے گا۔ جیسے ان سے پہلے لوگوں کو عطا کی تھی اور یقیناً (اس قوت و اقتدار کے باعث) ان کا وہ دین جو اس نے ان کے لیے پسند فرمایا ہے مستحکم کر دے گا اور (اس طرح) یقیناً وہ ان کے سابقہ خوف و غم کو امن و سلامتی سے بدل دے گا۔

اس آیت میں صالح مسلمانوں کو زمین میں خلافت یعنی حکومت و سلطنت اور قوت و اقتدار عطا کیے جانے کا ذکر ہے۔ اس کا مقصد یہی بیان کیا گیا ہے کہ اس کے ذریعے دینِ حق کو استحکام اور موثر نفاذ کا ماحول میسر آئے۔ کیونکہ سیاسی اقتدار کے بغیر دین کا استحکام اور نفاذ ممکن ہی نہیں۔ اسی طرح یہ بھی واضح کر دیا گیا ہے کہ سیاسی انقلاب کے بعد ہی معاشرے سے خوف و غم کی حالت کو بدلا جا سکتا ہے اور اس کی جگہ امن و سلامتی کا ماحول پیدا کیا جا سکتا ہے۔ دین کا تمکن اور استحکام درحقیقت اخلاقی انقلاب ہے اور معاشرے کا خوف و غم کے محرکات سے نجات پا کر امن و آشتی کے ماحول سے ہمکنار ہو جانا مطلوبہ سماجی انقلاب۔ یہ اخلاقی اور سماجی انقلاب فی الواقع سیاسی انقلاب کے بعد ہی بپا ہو سکتے ہیں۔ جیسا کہ قرآنِ حکیم کی اس آیت سے صراحتاً ثابت ہے کہ خلافتِ ارضی کے حصول کے بعد ہی زمین میں دینی استحکام اور معاشرتی امن بحال ہو سکتا ہے ورنہ ؂

باطل کے اقتدار میں تقویٰ کی آرزو
ہے کیا حسین فریب جو کھاتے ہوئے ہیں ہم

● قرآنِ مجید نے اس امر کو مزید دو ٹوک انداز میں یوں واضح کیا ہے:-

۳- وَلَوْلَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لَّهُدِّمَتْ صَوَامِعُ وَبِيَعٌ وَّصَلَوٰتٌ وَّمَسٰجِدُ يُذْكَرُ فِيْهَا اسْمُ اللّٰهِ كَثِيْرًا ۗ وَلَيَنْصُرَنَّ اللّٰهُ مَنْ يَّنْصُرُهٗ ۗ اِنَّ اللّٰهَ لَقَوِيٌّ عَزِيْزٌ ۝ اَلَّذِيْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِي الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ ۗ وَلِلّٰهِ عَاقِبَةُ الْاُمُوْرِ

(الحج ۲۲: ۴۰، ۴۱)

اور اگر اللہ تعالیٰ لوگوں میں سے بعض کو بعض کے ذریعے دفع نہ فرماتے یعنی لوگ انقلابی جدوجہد کے ذریعے ایک دوسرے کو سیاسی طور پر نیست و نابود نہ کرتے تو یقیناً وہ خانقاہیں، گرجے، کلیسے اور مسجدیں برباد ہو جاتیں جن میں بکثرت اللہ کا نام لیا جاتا ہے اور یقیناً اللہ تعالیٰ اس کی مدد فرمائے گا جو اس کے دین کی مدد کرتا ہے۔ بیشک اللہ تعالیٰ قدرت والا غالب ہے۔ وہ لوگ کہ اگر ہم انہیں زمین میں اقتدار دیں تو وہ نماز قائم کریں اور زکوٰۃ دیں اور بھلائی کا حکم (دے کر اسے عام) کریں اور (لوگوں کو) برائی سے روکیں اور سب کاموں کا انجام اللہ ہی کے ہاتھ میں ہے۔

پہلی آیت میں "بعض لوگوں کا بعض کے ذریعے نیست و نابود کیا جانا" درحقیقت اس انقلابی جدوجہد اور سیاسی جنگ کی طرف اشارہ ہے جو باطل کے استیصال اور حق کے غلبہ و استعلاء سے عبارت ہو۔ چنانچہ قانونِ قدرت کے مطابق اسی کے نتیجہ میں سیاسی قوت اور اقتدار بعض طبقات سے چھن کر بعض طبقات کو منتقل ہوتا رہتا ہے۔ قرآنِ حکیم اس آفاقی حقیقت کی توجیہہ یہ بیان کر رہا ہے کہ اگر

سیاسی غلبہ واقتدار کی منتقلی کا یہ نظام روئے زمین پر مروّج نہ ہوتا تو خانقاہیں، گرجے، کلیسے اور مسجدیں الغرض وہ مذہبی اور روحانی مراکز جن سے دین آباد ہے تباہ و برباد اور ویران ہو جائیں۔ گویا مذہب اور روحانیت کا وجود محض دینِ حق کے سیاسی غلبہ و استحکام کا مرہونِ منت ہے۔ اگر سیاسی قوت اور اقتدار باطل قوتوں کے پاس رہے۔ اہلِ حق سیاسی اور انقلابی جنگ کے ذریعے ان کے اثر و نفوذ کو ختم نہ کر سکیں تو زمین پر خدا کا نام لینا بھی دشوار ہو جائے۔

اگر روئے زمین پر مختلف مرکزوں میں خدا کا نام لیا جاتا ہے تو اس کی وجہ یہی ہے کہ وقتاً فوقتاً اقتدار اور سیاسی قوت اہلِ باطل سے اہلِ حق کو منتقل ہوتی رہتی ہے اس کے بعد یہ اعلان کیا گیا کہ جو شخص دینِ حق کی مدد کرے گا۔ یعنی اس کے غلبہ واستحکام کی خاطر باطل قوتوں سے ٹکرائے گا۔ اللہ تعالےٰ بھی یقیناً اس کی مدد کریں گے۔

دوسری آیت میں اسی حقیقت کو دہراتے ہوئے کہا جا رہا ہے کہ اہلِ حق اگر دینِ اسلام کے غلبہ و استحکام کو بحال کرالیں۔ یعنی ان کو سیاسی قوت و اقتدار نصیب ہو جائے تو پھر بہر صورت نماز اور زکوٰۃ کا نظام بپا ہو جائے گا۔ نیکی کو فروغ ملے گا اور بدی دب جائے گی۔ اسی تبدیلی کا نام اخلاقی اور معاشرتی انقلاب ہے جو مقصودِ جد و جہد ہے۔ لیکن یہ منزل باقاعدہ منظم سیاسی انقلاب کے بغیر حاصل نہیں ہو سکتی۔

- قرآنِ مجید حضرت موسیٰ علیہ السلام اور فرعون کے ذکر میں یوں بیان کرتا ہے کہ مصر کا سیاسی اقتدار فرعون کے پاس تھا۔ ہر سمت اس کا حکم چلتا تھا۔ اندریں صورت یہ ممکن نہ تھا کہ موسیٰ علیہ السلام کی محض دعوت و تبلیغ سے مطلوبہ انقلاب بپا ہو۔ لوگ کھلے بندوں آپ پہ ایمان لے آتے اور دینِ حق کو فروغ ملتا۔ اسی صورتِ حال کے بارے میں ارشاد ہوتا ہے:۔

۴۔ فَمَآ اٰمَنَ لِمُوْسٰىٓ اِلَّا　　　پس موسیٰؑ پر ایمان نہ لائے مگر ان کی قوم

| | |
|---|---|
| ذُرِّيَّةٌ مِّنْ قَوْمِهٖ عَلٰى خَوْفٍ مِّنْ فِرْعَوْنَ وَ مَلَا۟ئِهِمْ اَنْ يَّفْتِنَهُمْ ؕ وَ اِنَّ فِرْعَوْنَ لَعَالٍ فِي الْاَرْضِ ۚ وَ اِنَّهٗ لَمِنَ الْمُسْرِفِيْنَ (یونس، ۸۳) | کی اولاد میں سے کچھ لوگ، وہ فرعون اور اس کے درباریوں سے خوفزدہ تھے کہ کہیں وہ (ان کے ایمان لانے کی صورت میں) انہیں کسی مصیبت میں مُبتلا نہ کردیں۔ کیونکہ فرعون زمین پر صاحبِ قوّت و اقتدار تھا اور وہ بیشک (اپنے ظلم و استبداد میں) حد سے گزر چکا تھا۔ |

اس آیت کریمہ نے مذکرہ بالا حقیقت پر مہرِ تصدیق ثبت کردی ہے کہ باطل طاغوتی قوّت و اقتدار کے ہوتے ہوئے حق کو قبولِ عام اور فروغِ تام ملنا دُشوار تھا لوگ صاحبِ اقتدار کے ظلم و تشدد کے خوف سے اسلام کے دائرے میں داخل ہونے کے لیے تیار نہ تھے۔ اندریں صورت وہاں بھی پہلے سیاسی انقلاب مطلوب تھا۔ جس سے دینِ حق کو قبول و استحکام نصیب ہو اور اس کے بعد ہی مطلوبہ اخلاقی انقلاب بپا ہو سکتا تھا۔ بنی اسرائیل کو فرعون کے دستِ تظلم سے نجات دلائے بغیر بعثتِ موسوی کا مقصد پایۂ تکمیل کو نہ پہنچ سکتا تھا۔

چنانچہ آپ کو حکم دیا گیا کہ سب سے پہلے دربارِ فرعون میں جاکر دعوتِ حق دیں۔ اگر ایوانِ اقتدار میں انقلاب بپا ہوگیا تو پوری قوم کے لیے سیدھی راہ پر چلنا آسان ہو جائے گا۔ باری تعالٰے نے موسیٰ علیہ السلام کو ارشاد فرمایا:۔

| | |
|---|---|
| ۵۔ اِذْهَبْ اِلٰى فِرْعَوْنَ اِنَّهٗ طَغٰى (طٰہٰ، ۲۴) | اے موسیٰؑ! تو فرعون کے پاس جا، وہ سرکشی اور بغاوت کا مرتکب ہو چکا ہے۔ |

جب اس کام کے لیے موسیٰؑ کی درخواست پر آپ کے بھائی ہارونؑ کو آپ کا وزیر اور شریکِ کار بنا دیا گیا تو پھر دونوں کو حکم ہوا:۔

۶۔ اِذۡهَبَآ اِلٰی فِرۡعَوۡنَ اِنَّهٗ طَغٰی (طٰہٰ، ۴۳) — تم دونوں فرعون کے پاس جاؤ، وہ سرکش و باغی ہو چکا ہے۔

اس کے بعد انہیں یہ بھی بتایا گیا کہ نہیں ایوانِ اقتدار میں پیغامِ حق پہنچا کر بنی اسرائیل کی سیاسی آزادی کا مطالبہ کرنا ہے:۔

۷۔ فَاۡتِيٰهُ فَقُوۡلَاۤ اِنَّا رَسُوۡلَا رَبِّكَ فَاَرۡسِلۡ مَعَنَا بَنِىۡۤ اِسۡرَآءِيۡلَ وَلَا تُعَذِّبۡهُمۡ (طٰہٰ، ۴۷) — اس کے پاس جاؤ اور کہو ہم تیرے رب کے رسول ہیں تو ہمارے ساتھ بنی اسرائیل کو (آزاد کر کے) روانہ کر دے اور انہیں اپنے جبر و استبداد کا شکار نہ بنا۔

حضرت موسیٰؑ نے قومی آزادی کا نہ صرف مطالبہ کیا بلکہ بالآخر بصورتِ ہجرت اپنی قوم کو سیاسی آزادی کی دولت سے بہرہ ور بھی کیا۔ کیونکہ اس کے بغیر ان کی جدوجہد اپنے اتمام کو نہیں پہنچ سکتی تھی۔

● قرآنِ مجید میں حضرت یوسف علیہ السلام کی نسبت مذکور ہے کہ انہوں نے فرعونِ مصر کے دربار میں معتمد اور معزز تسلیم ہو جانے کے بعد یہ مطالبہ کیا کہ " مجھے زمین میں تصرف اور اقتدار دیا جائے تا کہ وہ ہدایتِ ربانی کے مطابق اصلاحِ احوال کی مؤثر اور نتیجہ خیز کوشش کر سکیں " ارشاد ہوتا ہے:۔

۸۔ قَالَ اجۡعَلۡنِىۡ عَلٰى خَزَآئِنِ الۡاَرۡضِ‌ۚ اِنِّىۡ حَفِيۡظٌ عَلِيۡمٌ ۝ وَكَذٰلِكَ مَكَّنَّا لِيُوۡسُفَ فِى الۡاَرۡضِ‌ۚ يَتَبَوَّاُ مِنۡهَا حَيۡثُ يَشَآءُ‌ ؕ نُصِيۡبُ بِرَحۡمَتِنَا مَنۡ نَّشَآءُ — یوسفؑ نے کہا۔ مجھے زمین کے خزائن پر متصرف اور مقتدر کر دے۔ بلاشک میں حفاظت کرنے والا اور علم و حکمت والا ثابت ہوں گا اور اسی طرح ہم نے یوسفؑ کو اس ملک پر اقتدار بخشا اس میں جہاں چاہے ٹھکانہ کرے۔ ہم جسے

وَلَا نُضِيعُ أَجْرَ الْمُحْسِنِينَ
(یوسف، ۵۵، ۵۶)

جانتے ہیں اپنی رحمت سے نوازتے ہیں اور نیک لوگوں کا اجر ضائع نہیں کرتے یعنی ان کی تگ و دو کو بے نتیجہ نہیں جانے دیتے۔

یوسفؑ کا پیغمبر ہو کر سیاسی قوت و اقتدار کو طلب کرنا اور منصبِ حکومت پر فائز ہونا اس امر پر دلالت کرتا ہے کہ اس ذریعے کو اپنائے بغیر ان کا مقصدِ بعثت پورا نہیں ہو سکتا تھا۔ ورنہ وہ کسی قسم کی جاہ و حشمت اور عہدہ و منصب کے خواہشمند نہ تھے اور نہ ہی ان کے لیے سیاسی اقتدار مقصود بالذات تھا

● خود آنحضرت صلے اللہ علیہ کو یہ دعا تلقین کی گئی ہے:۔

۹۔ وَقُلْ رَّبِّ أَدْخِلْنِي مُدْخَلَ صِدْقٍ وَّأَخْرِجْنِي مُخْرَجَ صِدْقٍ وَّاجْعَلْ لِّي مِنْ لَّدُنْكَ سُلْطَانًا نَّصِيرًا
(بنی اسرائیل، ۸۰)

اور یوں عرض کر کہ اے میرے رب مجھے (مقصدِ بعثت کی جدوجہد میں) سچائی اور عزت کے ساتھ داخل کر اور اس میں سے سچائی اور عزت کے ساتھ (عہدہ برآ فرما کر) باہر لے جا اور مجھے اپنی طرف سے مددگار اقتدار عطا فرما۔

باری تعالیٰ کی طرف سے نبی اکرمؐ کو اس دعا کی تعلیم اس حقیقت کی غمازی کرتی ہے کہ غلبۂ حق کا وہ عالمگیر مشن جو حضورؐ کو مقصدِ بعثت کے طور پر عطا کیا گیا تھا ایک ہمہ گیر سیاسی انقلاب اور اس کے نتیجے میں ایک موثر سیاسی اقتدار کی تائید و حمایت کے بغیر تکمیل پذیر نہیں ہو سکتا تھا۔ اسی لیے آپؐ نے اس امر کی دعا فرمائی۔ اور اسی راستے پر جدوجہد جاری رکھی۔ حتیٰ کہ مدینے کی اسلامی ریاست کے قیام آپؐ کی سربراہی مملکت کے انعقاد اور عالمِ کفر کے مقابلے میں اسلام کی سیاسی فتوحات

کے ذریعے دو جداجدا ہے، تمام کو پہنچی۔ سیاسی انقلاب کے تقاضے کو پورا کرنے سے ہی حق کا غلبہ اور باطل کی شکست مسلم ہو سکتی تھی۔ چنانچہ مذکورہ بالا دعائیہ کلمات کے بعد یہ اعلان کیا گیا:۔

۱۰۔ وَقُلْ جَآءَ الْحَقُّ وَ زَهَقَ الْبَاطِلُ ۚ إِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوقًا (بنی اسرائیل ۸۱)

اور فرما دیجیے کہ حق آیا اور باطل مٹ گیا۔ بے شک باطل کو مٹنا ہی تھا۔

مذکورہ بالا تمام آیات سے اس امر پر روشنی پڑتی ہے کہ قرآنی شہادت کے مطابق یہ ایک اٹل حقیقت ہے کہ معیاری دین یعنی اسلام کا سیاسی غلبہ و استحکام اور انقلابی قوت و اقتدار صحیح طور پر بحال کرائے بغیر معاشرتی اور اخلاقی انقلاب بپا کرنا ناممکن ہے۔ اس امر کا بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ سیاسی انقلاب کی پائیداری معاشی استحکام کے بغیر ممکن نہیں۔ کیونکہ معاشی انقلاب ہی سیاسی انقلاب کے مقاصد اور نتائج کو محفوظ رکھ سکتا ہے۔ لہٰذا سیاسی اور معاشی انقلاب ہی کی راہ ایسی راہ ہے جس کے ذریعے معاشرہ، اخلاقی و سماجی انقلاب سے ہمکنار ہوتا ہے اور دینِ اسلام کے نفاذ کو تاثیر اور نتیجہ خیزی میسر آتی ہے۔ ورنہ عبادات و معاملاتِ شریعت کا پرچار ہو یا اخلاق و روحانیت کی تعلیم، حدودِ شریعت کا نفاذ ہو یا دیگر تعلیماتِ اسلامی کی تبلیغ، قوم اجتماعی طور پر منزلِ مقصود تک نہیں پہنچ سکتی۔ قوم کے منزلِ مراد تک پہنچنے کا لائحہ عمل صرف سیاسی اور معاشی انقلاب ہی ہے جو اپنے نتیجے کے طور پر سماجی اور اخلاقی انقلاب کو جنم دیتا ہے اور ایک ایسے مثالی معاشرے کی تشکیل وجود میں آتی ہے جو عالمی سطح پر غلبہ اسلام کی خاطر انقلاب کی ضامن ہو۔

## قومی زندگی کے اصلاح طلب پہلو

جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے کہ قومی زندگی تین بنیادی شعبوں پر مشتمل ہے۔

سیاسی، معاشی اور معاشرتی۔ یہ تینوں شعبے اطاعت اور انحراف کے تضاد پر مبنی ہیں۔ ان میں سے ہر ایک مخصوص نوعیت کے بگاڑ سے ہمکنار ہے جس کو صحیح طور پر متعین کیے بغیر مطلوبہ اصلاح نہیں ہو سکتی۔

# سیاسی زندگی کا بگاڑ اور اس کی اصلاح

## (سیاسی لائحہ عمل)

قومی سطح پر سیاسی زندگی کا بگاڑ "ہوسِ اقتدار" ہے۔ یہ اس حد تک غالب ہوتی ہے کہ حاکم خود کو ہر قانون، ضابطہ و اصول اور جوابدہی کے تصورات بالاتر سمجھتا ہے۔ اس آمرانہ ذہن کے نتیجے میں اقتدار قانون کا ہونے کے بجائے بذات خود حاکم کا ہو جاتا ہے۔ اس طرح حاکم اور محکوم دونوں کے مفادات جدا جدا ہو جاتے ہیں اور ان میں تصادم شروع ہو جاتا ہے۔ اس تصادم کے نتیجے میں حاکم کی طرف سے جور و استبداد کا آغاز ہوتا ہے اور بالآخر پوری قومی زندگی لاقانونیت کا شکار ہو جاتی ہے۔ جو انجام کار تباہی و ہلاکت پر منتج ہوتی ہے۔ اس پہلو کا ذکر قرآنِ مجید میں اس طرح آیا ہے :۔

| | |
|---|---|
| وَاِذَآ اَرَدْنَآ اَنْ نُّهْلِكَ قَرْيَةً اَمَرْنَا مُتْرَفِيْهَا فَفَسَقُوْا فِيْهَا فَحَقَّ عَلَيْهَا الْقَوْلُ فَدَمَّرْنٰهَا تَدْمِيْرًا (بنی اسرائیل ۱۶) | جب ہم کسی قوم کو ہلاک کرنا چاہتے ہیں اس کے سرداروں اور حاکموں پر احکام بھیجتے ہیں۔ پھر وہ ان سے انحراف کرتے ہیں تو اس پر حجت تمام ہو جاتی ہے پھر ہم اسے تباہ و برباد کر دیتے ہیں۔ |

اس آیتِ مبارکہ کے بیان سے یہ امر پایۂ ثبوت کو پہنچ گیا کہ قوموں کا سیاسی طور

پر تباہ و برباد ہونا حکام کے انحراف کی بنا پر ہوتا ہے جو ہوسِ اقتدار کے باعث معرضِ وجود میں آتا ہے۔

اس پہلو کی اصلاح یوں ممکن ہے کہ حاکم و محکوم دونوں یکساں طور پر منزل من اللہ قانون کے تابع ہوں اور حکام کو عوام کی بہی خواہی کے جذبے سے ضبط و انقیاد کا ایسا پابند بنایا جائے کہ پوری قوم ایک موثر سیاسی قوت بن کر ہر قسم کے اندرونی و بیرونی موجباتِ خوف و غم کا تدارک کر سکے۔

سیاسی زندگی کی اصلاح کے لیے قرآنی ضابطہ ان دو آیات میں مندرج ہے:

إِنَّ اللّٰهَ يَأْمُرُكُمْ أَنْ تُؤَدُّوا الْأَمٰنٰتِ إِلٰىٓ أَهْلِهَا وَإِذَا حَكَمْتُمْ بَيْنَ النَّاسِ أَنْ تَحْكُمُوا بِالْعَدْلِ ۚ إِنَّ اللّٰهَ نِعِمَّا يَعِظُكُمْ بِهٖ ۗ إِنَّ اللّٰهَ كَانَ سَمِيْعًا بَصِيْرًا ۝ يٰٓأَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا أَطِيْعُوا اللّٰهَ وَأَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَأُولِي الْأَمْرِ مِنْكُمْ ۚ فَإِنْ تَنَازَعْتُمْ فِيْ شَيْءٍ فَرُدُّوْهُ إِلَى اللّٰهِ وَالرَّسُوْلِ إِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ۚ ذٰلِكَ خَيْرٌ وَّأَحْسَنُ تَأْوِيْلًا

(النساء: ۵۸، ۵۹)

بے شک اللہ تعالیٰ تمہیں حکم دیتے ہیں کہ تم (ہر قسم کی) امانتیں ان لوگوں کے سپرد کر دو جو ان کے اہل اور حقدار ہیں اور (اے حاکمو) جب تم لوگوں کے درمیان فیصلے کرو تو عدل و انصاف سے کرو۔ بیشک اللہ تمہیں کیا ہی خوب نصیحت فرماتے ہیں بیشک اللہ سنتا دیکھتا ہے اے ایمان والو! اللہ کی اطاعت کرو اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کرو اور جو تم میں سے مناصبِ حکومت پر فائز ہیں۔ پس اگر تمہارے درمیان (یعنی تمہارے اور حکام کے درمیان) کسی بات پر نزاع ہو جائے تو اسے اللہ اور رسول کی طرف حتمی فیصلے کے لیے لوٹا دو۔ اگر تم اللہ اور قیامت

پر ایمان رکھتے ہو تو یہ بہتر ہے اور اس کا
انجام کا سب سے اچھا ہے۔

- پہلی آیت میں اقتدار اور مناصب حکومت کو سراسر امانت قرار دیا گیا ہے اور اس امانت کا حامل بھی اصلاً عوام کو قرار دیا گیا ہے اور انھیں یہ تلقین کی گئی ہے کہ یہ امانتیں صرف ان لوگوں کے سپرد کرو جو ان کے اہل اور صحیح حقدار ہیں۔ یعنی قیامِ اقتدار کے لیے حقِ رائے دہی استعمال کرتے ہوئے یہ امر ملحوظ رہنا چاہیے کہ صرف اہل اور مستحق افراد ہی امانتِ اقتدار کو سنبھالنے کے لیے منتخب کیے جائیں۔ علمی اور عملی طور پر نااہل اور غیر مستحق افراد نہ امانتِ اقتدار کو سنبھالنے کے لیے خود کو پیش کر سکتے ہیں اور نہ انہیں منتخب کیا جا سکتا ہے۔ یہ بات لوگوں کو حکمِ الٰہی کے طور پر کہی جا رہی ہے جس میں کسی قسم کی رعایت کی کوئی گنجائش نہیں۔ ان آیات کے مضامین پر تفصیلی روشنی تو انشاء اللہ ان کی تفسیر کے موقع پر ڈالی جائے گی۔ یہاں سیاسی بگاڑ کے لیے جو ضابطہ مندرج ہوا ہے، اختصار کے ساتھ عرض کیا جاتا ہے۔ اس ضابطے کے اہم نکات درج ذیل ہیں:-

(۱) اقتدار اور مناصبِ حکومت سراسر امانت ہیں۔ کسی کی ملکیت یا وراثت نہیں۔

(۲) امانتِ اقتدار کے اصل حامل عوام ہیں حکام نہیں۔ یہ امانت، حقِ رائے کی صورت میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے عوام کو عطا کی گئی ہے۔

(۳) قیامِ اقتدار بلا استثنیٰ تمام لوگوں (یعنی حاملانِ امانت) کے حقِ رائے دہی کے استعمال سے عمل میں آنا چاہیے۔ کیونکہ امانتیں سپرد کرنے کا حکم عوام کو دیا گیا ہے۔ اس لیے یہ انہی کا حق ہے کہ کس کو منصبِ حکومت کے لیے منتخب کریں۔ کوئی شخص عوام سے خدا کا یہ عطا کردہ حق غصب نہیں کر سکتا۔ اس لحاظ سے اسلامی حکومت کا صحیح معنوں میں "نمائندہ اور منتخبہ حکومت" ہونا اشد ضروری ہے۔

(۴) مسندِ حکومت کے لیے صرف اہل اور حقدار افراد کو ہی منتخب کیا جا سکتا ہے۔

ہر کس و ناکس اور بے علم و بے عمل شخص قیام اقتدار کے لئے عاقل و بالغ ہونے کی بنا، پر اپنا ووٹ تو استعمال کر سکتا ہے لیکن بطور نمائندہ منتخب نہیں ہو سکتا۔ گویا نمائندے (Candidate) کے لئے علم و عمل کے لحاظ سے اہلیت و قابلیت کی شرط ناگزیر ہے

(۵) قیامِ اقتدار عوام اور نمائندوں کے درمیان ایک قابلِ تنسیخ معاہدہ ہے۔ جس کی شرائط کا پورا کرنا فریقین پر فرض ہے۔

(۶) منصبِ حکومت پر فائز ہونے کے بعد حکام کے ذمے عدل و انصاف کا قائم کرنا لازم آتا ہے۔ جس کی خلاف ورزی سے وہ امانتِ اقتدار کو سنبھالے رکھنے کے اہل نہیں رہتے۔

(۷) جو لوگ حکام کو امانتِ اقتدار سنبھالنے کے لیے منتخب کرتے ہیں وہی انہیں انحراف کی صورت میں منصب سے معزول بھی کر سکتے ہیں۔

حاکم اور محکوم دونوں خدا و رسول کے قانون کے یکساں طور پر تابع ہونے چاہئیں۔

(۹) حکام کی اطاعت مشروط ہوتی ہے۔ اگر وہ خود خدا و رسول کے احکام کے تابع نہ رہیں تو عوام پر ان کی اطاعت فرض نہیں رہتی۔

(۱۰) عوام کو حکام سے اختلاف کرنے بلکہ نزاع کرنے کا بھی حق حاصل ہے۔ عوام کو تنقید اور مواخذے کے حق سے محروم نہیں کیا جا سکتا۔ ان کو اس حق سے محروم کرنا سب سے بڑا سیاسی ظلم اور احکامِ قرآنی کی صریح خلاف ورزی ہے۔

(۱۱) عوام اور حکام کے درمیان اختلاف کی صورت میں کسی کی رائے بھی خصوصی طور پر رعایت یافتہ یا فائق نہیں ہوتی۔

(۱۲) ہر نزاعی معاملے میں آخری سند خدا و رسول کا حکم ہوتا ہے۔ یعنی قرآن و سنت کو آئینی اور دستوری طور پر حتمی و قطعی ہونے کا درجہ حاصل ہے اور ہر کوئی اسی کا

پابند ہے۔ ملا قرآن و سُنّت کی حیثیت ریاستی دستور سے بالاتر ہوتی ہے۔

(۱۳) قرآن و سُنّت پر مبنی فیصلہ صادر کرنے والی عدلیہ آئینی طور پر ریاست کی مقننہ اور انتظامیہ سے مکمل طور پر آزاد، فائق اور بالاتر ہونی چاہیئے تاکہ وہ حکام کے غلط فیصلوں کو کالعدم قرار دے سکے۔

(۱۴) ہوسِ اقتدار اور ہوسِ آمریت پر مبنی نظامِ حکومت انجام کار تباہی کا باعث ہوتا ہے۔ جب کہ مذکورہ بالا "سیاسی اور دستوری ضابطہ" ہی اجتماعی بہتری اور قومی اصلاح و فلاح کا ضامن ہے۔

اگر قومی سطح پر سیاسی زندگی کی اصلاح مذکورۃ الصدر لائحہ عمل اور سیاسی و دستوری ضابطے کے مطابق کی جائے تو کوئی وجہ نہیں کہ قومی زندگی شاندار سیاسی انقلاب سے ہمکنار نہ ہو۔

## معاشی زندگی کا بگاڑ اور اس کی اِصلاح

## (معاشی لائحہ عمل)

قومی سطح پر معاشی زندگی کا بگاڑ "استحصال" خودغرضانہ اور مفاد پرستانہ طرز عمل ہے۔ انسانی عمل پر حرص و لالچ، بخل و اکتناز اور خودغرضی و مفاد پرستی اس حد تک غالب ہوتی ہے کہ اجتماعی مفاد کی خاطر ایثار و انفاق اور عام نفع بخشی و فیض رسانی کا وطیرہ مفقود ہو جاتا ہے۔ جس کے نتیجے میں ایک طرف ارتکازِ زر اور دوسری طرف معاشی تعطل پیدا ہو جاتا ہے۔ چنانچہ معاشرتی زندگی میں یہ غیر فطری حد تک اقتصادی تفاوت ہر سمت سے مجرمانہ اور معصیانہ طرز عمل کو جنم دیتا ہے خود غرضی اور مفاد پرستی کے طرز عمل سے غیر عادلانہ معیشت وجود میں آتی ہے۔ اس کے نتیجے میں اخلاقِ رذیلہ، بزدلی، مایوسی، اجتماعی حاجتمندی، عزتِ نفس سے

تصور سے محرومی اور بالآخر محکومی و غلامی جیسی صورتِ حال کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اس بگاڑ کی اصلاح یوں ممکن ہے کہ افرادِ معاشرہ کے دل و دماغ سے خوف، فلاس کو رفع کر کے معاشی تعطل اور غیر فطری اقتصادی تفاوت کے خاتمے کا ایسا موثر نظام وضع کیا جائے کہ ہر شخص کی تخلیقی جد و جہد بحال ہو سکے۔

یہ اصلاح اس وقت تک ممکن نہیں جب تک سرمایہ دارانہ اور استحصالی تصورِ ملکیت کو اسلام کے انقلابی تصورِ ملکیت سے نہیں بدل دیا جاتا۔ کیونکہ تمام مفاد پرست، دسیسہ کار اور اجارہ کار قوتیں اس معاشی انقلاب کے راستے میں مزاحم ہوں گی۔

اسلام کا حقیقی تصورِ ملکیت جو قرآن و سنّت کی نصوص سے ثابت ہے۔ وضاحت کے ساتھ ہماری کتاب "اسلام کا تصورِ ملکیت" میں ملاحظہ فرمائیں۔ یہاں اس کی تلخیص چند لفظوں میں پیشِ خدمت ہے۔

**ملکیت** حقیقت میں دو بنیادی حقوق کا نام ہے:۔

حقِ تملک اور حقِ انتفاع

حقِ تملک سے مراد کسی چیز پر ظاہری قبضہ و تصرف کا قانونی حق ہے۔ اس چیز کو آگے فروخت کرنا، ہبہ کرنا یا اس میں مزید کسی قسم کا تصرف اسی حقِ تملک کی وجہ سے واقع ہوتا ہے۔ ملکیت کا حقِ تملک کے اعتبار سے انفرادی حد تک مختص ہونا جائز ہے۔ اس حق میں دوسروں کا شریک ہونا یا نہ ہونا دونوں صورتیں صحیح ہیں۔ حقِ انتفاع سے مراد کسی مقبوضہ چیز سے نفع حاصل کرنے کا حق ہے جو منافع اور مفادات اس چیز سے حاصل ہو سکتے ہیں۔ ان سے خود کو فائدہ پہنچانا اسی حق کی بناء پر جائز تصور ہوتا ہے۔ حقِ انتفاع کے اعتبار سے ملکیت کو محض انفرادی حد تک مختص رکھنا جائز نہیں۔ اشیاء سے نفع اٹھانے کے حق میں دوسروں

کو بھی شریک کرنے کا برابر حکم ہے۔ حقِ تملک اور اس کے لوازمات یعنی قبضہ و تصرف میں انفرادی ملکیت کے اختصاص کی طرح حقِ انتفاع کو بھی صرف انفرادی اور نجی حد تک مخصوص رکھنا شریعتِ اسلامیہ کی رو سے دسیسہ کاری، بخل اور ارتکاز و اکتناز ہے اور یہ حرام ہے۔

قرآنِ حکیم نے اس مفاد پرستانہ تصور کی اصلاح اس انقلابی تصور کے ذریعے کی ہے:۔

| | |
|---|---|
| وَفِیْٓ اَمْوَالِهِمْ حَقٌّ لِّلسَّآئِلِ وَالْمَحْرُوْمِ (ذاریت، ۱۹) | اور تمام مال داروں کے اموال و ذرائع میں سوال کرنے والوں اور ضرورتمندوں کا حق ہے۔ |

حق وہی ہوتا ہے جسے قانون تسلیم کرے، جو ہر حال میں لیا جاسکے۔ دوسرا شخص جس کے ادا کرنے کا پابند ہو اور اس کی عدم ادائیگی صریح جرم ہے۔ اس قرآنی آیت کا اطلاق صاف ظاہر ہے۔ تملک یعنی قبضہ و تصرف کے حق پر نہیں ہوسکتا۔ کیونکہ وہ تو صرف کسی نہ کسی چیز کے عوض میں ہی میسّر آتا ہے۔ بغیر معاوضے یا کسی مخصوص عمل یا محنت کے یہ حق میسر نہیں آسکتا۔ اس لیے اس آیت کا اطلاق بلا اختلاف حقِ انتفاع پر ہی ہوتا ہے یعنی کسی شے سے نفع حاصل کرنے کے حق میں دوسرے بھی شریک ہوتے ہیں۔ انہیں اس حق سے اس بناء پر محروم نہیں کیا جاسکتا کہ وہ چیز، جس سے وہ نفع اٹھانا چاہتے ہیں۔ ان کی مقبوضہ یا ملکیتی نہیں۔ کیونکہ حقِ انتفاع کے لحاظ سے ملکیت مشترکہ ہوتی ہے اور حقِ تملک کے لحاظ سے مخصوص۔ مگر لوگ مغالطے کی وجہ سے صرف قبضہ و تصرف کے حق کو ہی ملکیت تصور کر بیٹھتے ہیں۔ اگر صورتِ حال یہی ہوتی، حقِ تملک اور حقِ انتفاع میں کوئی فرق نہ ہوتا اور ملکیت دونوں اعتبارات سے یکساں اور مخصوص ہوتی تو قرآن "وَیَمْنَعُوْنَ الْمَاعُوْنَ" کا حکم دے کر

گھر کی برتنے کی چیزوں کو دوسروں سے روک رکھنے کی مذمت نہ کرتا بلکہ لوگوں کو اپنی اشیائے صرف کے منافع کو صرف اپنی ذات پر استعمال کرنے پر "دین کا جھٹلانے والا" قرار نہ دیتا۔ ہر شخص اپنے جملہ اموال و ذرائع کا قبضہ و تصرف اپنے پاس ہی رکھے، لیکن ایک مخصوص حد تک دوسروں کو ان اموال کے منافع اور مفادات میں اس طرح شریک کرے کہ اس کے حیطۂ کفالت میں رہنے والے کسی شخص پر بھی معاشی تعطل باقی نہ رہے اور ہر ایک کی تخلیقی جد و جہد کی بحالی کی ضمانت میسر آجائے۔ اس انداز کی نفع بخشی کو صرف اخلاقی قوت سے ہی نہیں بلکہ قانون کی قوتِ نافذہ کے ذریعے محفوظ کیا جا سکتا ہے۔ حیطۂ کفالت کے اندر حقِ انتفاع میں مقدم و موخر کون ہے۔ اس کے لیے ترجیحات مقرر ہیں۔ اس لیے کوئی الجھن یا التباس پیدا نہیں ہو سکتا۔

اگر سوسائٹی کے پورے معاشی ڈھانچے اور اقتصادی نظام کو ملکیت کے اس انقلابی تصور کی بنیاد پر استوار کیا جائے تو نہ ارتکازِ زر کا اندیشہ باقی رہے، نہ کسی کے معاشی تعطل کا اور نہ غیر فطری اقتصادی تفاوت کا۔ ہر شخص کی تخلیقی جد و جہد کے بحال ہو جانے سے اقتصادی زندگی کا بگاڑ ختم ہو جائے گا اور ایسا معاشی انقلاب بپا ہو گا جو معاشرتی زندگی میں فیصلہ کن تبدیلی کا ضامن ہو گا۔

# معاشرتی زندگی کا بگاڑ اور اس کی اِصلاح

## (معاشرتی لائحہ عمل)

معاشرتی زندگی کا بگاڑ چار نوعیت کا ہے۔ جنہیں قرآنِ مجید کی زبان میں درج ذیل اصطلاحات کے ذریعے واضح کیا جا سکتا ہے:۔

۱۔ حمیۃ الجاھلیۃ ——— (دورِ جاہلیت کی طرح محدود حمیت و عصبیت مثلاً وطنی، علاقائی، نسلی، لسانی اور طبقاتی و گروہی عصبیتیں)

اسی عصبیت کے باعث اپنی وفاداریوں اور مفادات کو محدود پیمانوں پر متعین کرنا خود کو ایک ہمہ گیر وحدت میں منسلک کرنے کے بجائے مختلف طبقات میں منقسم کر لینا اور ان ہی محدود وفاداریوں کو اپنی معاشرت کی بنیاد تصور کرنا۔ بلکہ ان ہی کو وجہ شرف اور بنائے تفاخر قرار دینا حمیۃ الجاہلیۃ ہے اور اسلام اس کو کلیۃً نیست و نابود کر دینا چاہتا ہے۔

**۲۔ ظن الجاھلیۃ** ———— (دورِ جاہلیت کی طرح غیر اسلامی افکار و نظریات اور توہمات و تصورات) وہ تمام مذہبی، سیاسی، معاشی، معاشرتی اور تہذیبی تصورات جو غیر اسلامی فکر سے جنم لیتے ہیں، ظن الجاہلیۃ ہیں۔ ان کی وجہ سے پوری معاشرتی زندگی براہِ راست متاثر ہوتی ہے۔ کیونکہ ہر شعبۂ زندگی کسی نہ کسی باقاعدہ تصور اور نظریہ سے تشکیل پاتا ہے اور اسی تصور کے باعث زندگی کے ہر عمل کی صحت و عدم اور نوعیت متعین ہوتی ہے۔

**۳۔ تبرج الجاھلیۃ** ———— (دورِ جاہلیت کی طرح نمائشِ حسن، عریانی، آبرو باختگی اور اظہارِ جمال کی مختلف صورتیں) نمود و نمائش اور زندگی کے مصنوعی وقار اور حسن و جمال کی خاطر طرح طرح کے فیشن اور بے جا مصارف، جو بالخصوص عورتوں کی زیب و زینت کی نذر ہوتے ہیں۔ تبرج الجاہلیۃ کے ضمن میں آتے ہیں۔ ان کی وجہ سے معاشرتی اور عائلی زندگی نہ صرف ناروا بوجھ تلے دب جاتی ہے۔ بلکہ پوری زندگی تصنع اور بناوٹ کی آئینہ دار ہو جاتی ہے۔ سادگی اور حقیقت و اصلیت ناپید ہو جاتی ہے اور رفتہ رفتہ "تبرج" کی مختلف صورتیں ضروریاتِ زندگی یا تقاضہ ہائے عزت کے طور پر اس طرح ناگزیر ہو جاتی ہیں کہ بالآخر انسان ان کی خاطر نہ صرف پائی پائی کا محتاج ہو جاتا ہے بلکہ اخلاقی فضائل اور مذہبی اقدار کا بھی دیوالیہ ہو جاتا ہے۔ یہ نمائش معاشرے میں گناہ و معصیت کی زندگی کو بھی رواج دیتی ہے۔

## ۴۔ حکم الجاھلیۃ

(دورِ جاہلیت کی طرح غیراسلامی طاغوتی قوانین) کسی معاشرے کا وہ قانونی ڈھانچہ جو اپنی اصل یا ہیئت کے لحاظ سے غیراسلامی ہو اور اخلاقی زندگی کا صحیح تحفظ کرنے کی صلاحیت نہ رکھتا ہو، نظام الجاہلیہ کہلاتا ہے۔

سوسائٹی کے وہ تمام قوانین جو قرآن و سنّت سے انحراف پر مبنی ہوتے ہیں۔ ان کی ناروا پیچیدگیاں اور مخصوص ضابطے انسانی زندگی میں بجائے سہولت و آسائش مہیا کرنے کے دشواریاں پیدا کرتے ہیں اور ان کی ساخت میں انسانی ذہن کے تراشیدہ ہونے کی وجہ سے جو خامیاں ہوتی ہیں، غیر اخلاقی زندگی جنم دیتی ہیں۔ اس بگاڑ کی اصلاح بھی حسبِ ترتیب چار زعیت کے اقدامات سے ممکن ہے۔

**ایک** یہ کہ تمام محدود گروہی وفاداریوں اور عصبیتوں کو قانوناً ممنوع قرار دے دیا جاتے بلکہ ایسی عصبیتوں کو ہوا دینے کی کوشش قومی وحدت اور سالمیت کے خلاف سازش تصور کرتے ہوئے قوت سے دبا دی جائے اور اس کے برعکس پوری معاشرتی زندگی کو ایک وحدت میں بدلنے کے لیے مؤثر جدوجہد کی جائے۔

**دوسرے** یہ کہ تمام غیر اسلامی، منفی اور تخریبی افکار و نظریات کا قلع قمع کیا جائے تاکہ معاشرے کی اجتماعی زندگی نظریاتی خالصیت سے بہرہ ور ہو اور ہر عمل کو صحیح فکر کی راہنمائی حاصل ہو۔

**تیسرے** یہ کہ سادہ اور باعصمت زندگی کے منافی نمود و نمائش اور تعیش و سفلہ نوازی کی تمام صورتیں یکسر ختم کر دی جائیں بلکہ سادہ زندگی کا نظام قانوناً اس طرح جاری ہو کہ کسی کو بھی تبرج یعنی بے جا زیب و زینت کی ادنیٰ سے ادنیٰ صورت کی بھی اجازت نہ ہو سکے۔

**چوتھے** یہ کہ مذکورہ بالا سیاسی، معاشی اور معاشرتی مقاصد کے حصول

کے لیے قرآن و سنت پر مبنی نظامِ قانون نافذ کیا جائے۔ اگر قانون نافذ کرنے والی ایجنسیوں اور طاقتوں کے پیشِ نظر سرے سے مذکورہ بالا مقاصد ہی نہ ہوں جن کی خاطر قانونی ڈھانچہ بدلنا درکار ہے تو بغیر انقلابی مقاصد اور منصوبہ بندی کے شریعت کے جزوی احکام نافذ کرنے سے کیا فائدہ ہو سکتا ہے؟

مذکورہ بالا بگاڑ چونکہ قومی سطح پر واقع ہوتا ہے۔ اس لیے اس کی اصلاح کی جدوجہد بھی اسی سطح پر ہونی چاہیے۔ اگر ان حقائق کو نظرانداز کر کے نفاذِ شریعت کی مخلصانہ کوشش بھی کی جائے تب بھی مطلوبہ منزل کا حصول ممکن نہیں۔

یہ وہ لائحہ عمل ہے۔ جس کے ذریعے قومی نصب العین کا حاصل کرنا نہ صرف ممکن بلکہ واقع ہو سکتا ہے کہ جدوجہد کا آغاز مذکورہ بالا تصور کے مطابق سیاسی انقلاب سے ہو۔ اس کے سیاسی انقلاب کے نتائج کو معاشی انقلاب کے ذریعے محفوظ کیا جائے اور معاشی انقلاب کی تکمیل کے بعد معاشرتی انقلاب کی طرف متوجہ ہوا جائے۔ کیونکہ یہ مرحلہ دائمی طور پر جدوجہد جاری رکھنے کا ہے۔ اسی طریق کو اپنا کر ہی مطلوبہ اخلاقی انقلاب بپا ہو سکتا ہے۔

# اشاریہ

# آیاتِ طیّبات

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

| صفحۂ کتاب | حوالہ | ابتداء الآیۃ | نمبر شمار[1] |
|---|---|---|---|
| ۲۷، ۲۸ | الفاتحہ، | اِهۡدِنَا الصِّرَاطَ الۡمُسۡتَقِيۡمَ ۙ | ۱- |
| ۹۱، ۱۲۵ | ۵ — ۷ | صِرَاطَ الَّذِيۡنَ اَنۡعَمۡتَ عَلَيۡهِمۡ ۙ | |
| | | غَيۡرِ الۡمَغۡضُوۡبِ عَلَيۡهِمۡ | |
| | | وَلَا الضَّآلِّيۡنَ ۙ | |
| ۱۴۱، ۱۶۴ | البقرۃ، ۳ | اَلَّذِيۡنَ يُؤۡمِنُوۡنَ بِالۡغَيۡبِ ..... | ۲- |
| | | وَمِمَّا رَزَقۡنٰهُمۡ يُنۡفِقُوۡنَ | |
| ۳۰۱ | البقرۃ، | قُلۡنَا اهۡبِطُوۡا مِنۡهَا جَمِيۡعًا | ۳- |
| | ۳۸ | فَاِمَّا يَاۡتِيَنَّكُمۡ مِّنِّىۡ هُدًى | |
| | | فَمَنۡ تَبِعَ هُدَاىَ | |
| ۲۲۸ | البقرۃ، | رَبَّنَا وَابۡعَثۡ فِيۡهِمۡ رَسُوۡلًا | ۴- |
| | ۱۲۹ | مِّنۡهُمۡ يَتۡلُوۡا عَلَيۡهِمۡ اٰيٰتِكَ | |
| ۲۸۲ | البقرۃ، | قَدۡ نَرٰى تَقَلُّبَ وَجۡهِكَ | ۵- |
| | ۱۴۴ | فِى السَّمَآءِ ۚ فَلَنُوَلِّيَنَّكَ قِبۡلَةً | |
| | | تَرۡضٰهَا | |
| ۹۴ | البقرۃ، ۱۵۱ | كَمَآ اَرۡسَلۡنَا فِيۡكُمۡ رَسُوۡلًا | ۶- |

[1] قرآن آیات کا اشاریہ ترتیب تلاوت کے اعتبار سے مرتب کیا گیا ہے۔

| نمبر شمار | ابتداء الآیۃ | حوالہ | صفحہ کتاب |
|---|---|---|---|
| ۷- | لَيْسَ الْبِرَّ اَنْ تُوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَ الْمَغْرِبِ ۔۔۔ | البقرۃ، ۱۷۷ | ۴۸، ۱۲۲ |
| ۸- | وَ اَنْفِقُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۔۔۔۔۔۔ وَ اَحْسِنُوْا اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ | البقرۃ، ۱۹۵ | ۱۱۹ |
| ۹- | وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّشْرِيْ نَفْسَهُ ابْتِغَآءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ ؕ | البقرۃ، ۲۰۷ | ۷۳ |
| ۱۰- | يٰاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا ادْخُلُوْا فِي السِّلْمِ كَآفَّةً ۔۔۔۔۔۔ | البقرۃ، ۲۰۸ | ۲۹۸ |
| ۱۱- | يَسْئَلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ ؕ قُلْ مَآ اَنْفَقْتُمْ مِّنْ خَيْرٍ ۔۔۔۔۔ | البقرۃ، ۲۱۵ | ۱۴۳ |
| ۱۲- | يَسْئَلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ قُلِ الْعَفْوَ ۔۔۔۔۔۔ | البقرۃ، ۲۱۹ | ۱۴۳، ۲۱۷ |
| ۱۳- | ذٰلِكُمْ اَزْكٰى لَكُمْ وَاَطْهَرُ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ وَ اَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ۔۔۔۔ | البقرۃ، ۲۳۲ | ۹۳ |
| ۱۴- | تِلْكَ الرُّسُلُ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ م | البقرۃ، ۲۵۳ | ۱۹۵ |
| ۱۵- | يٰاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا اَنْفِقُوْا مِمَّا رَزَقْنٰكُمْ مِّنْ قَبْلِ اَنْ يَّاْتِيَ يَوْمٌ ۔۔۔۔۔ | البقرۃ، ۲۵۴ | ۱۴۱، ۱۴۲ |

| نمبر شمار | ابتداء الآیہ | حوالہ | صفحہ کتاب |
|---|---|---|---|
| ۱۶- | يٰاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْفِقُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا كَسَبْتُمْ..... | البقرۃ، ۲۶۷ | ۱۳۲ |
| ۱۷- | وَمَثَلُ الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمُ ابْتِغَآءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ.... | البقرۃ، ۲۶۵ | ۱۸۱ |
| ۱۸- | لَيْسَ عَلَيْكَ هُدٰىهُمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ..... | البقرۃ، ۲۷۲ | ۱۳۶ |
| ۱۹- | لِلْفُقَرَآءِ الَّذِيْنَ اُحْصِرُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ ضَرْبًا فِي الْاَرْضِ ..... | البقرۃ، ۲۷۳ | ۱۳۷ |
| ۲۰- | اَلَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ بِالَّيْلِ وَالنَّهَارِ سِرًّا وَّعَلَانِيَةً | البقرۃ، ۲۷۴ | ۱۳۷ |
| ۲۱- | زُيِّنَ لِلنَّاسِ حُبُّ الشَّهَوٰتِ مِنَ النِّسَآءِ وَالْبَنِيْنَ ..... | اٰلِ عمران، ۱۴ | ۱۰۲ |
| ۲۲- | فَكَيْفَ اِذَا جَمَعْنٰهُمْ لِيَوْمٍ لَّا رَيْبَ فِيْهِ وَوُفِّيَتْ كُلُّ نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ ۝ | اٰلِ عمران، ۲۵ | ۱۰۰ |
| ۲۳- | قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ وَ يَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ..... | اٰلِ عمران، ۳۱ | ۸۳ |
| ۲۴- | وَاِذْ اَخَذَ اللّٰهُ مِيْثَاقَ النَّبِيّٖنَ | اٰلِ عمران، ۱۰۳ | ۲۰۱ |

| نمبر شمار | ابتداء الآیۃ | حوالہ | صفحہ کتاب |
|---|---|---|---|
| | لَمَآ اٰتَیْتُکُمْ مِّنْ کِتٰبٍ وَّ حِکْمَةٍ ...... | اٰلِ عمران ۸۱ | |
| ۲۵- | لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰى تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ ؕ | اٰلِ عمران، ۹۲ | ۱۶۱، ۲۵۰ |
| ۲۶- | وَاذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ كُنْتُمْ اَعْدَآءً فَاَلَّفَ بَيْنَ قُلُوْبِكُمْ | اٰلِ عمران ۱۰۳ | ۲۲۹، ۲۳۰ |
| ۲۷- | كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ | اٰلِ عمران ۱۱۰ | ۲۹۹ |
| ۲۸- | وَسَارِعُوْٓا اِلٰى مَغْفِرَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَجَنَّةٍ عَرْضُهَا السَّمٰوٰتُ | اٰلِ عمران ۱۳۳ | ۱۶۴ |
| ۲۹- | اَلَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ فِي السَّرَّآءِ وَالضَّرَّآءِ | اٰلِ عمران ۱۳۴ | ۱۵۱ |
| ۳۰- | هٰذَا بَيَانٌ لِّلنَّاسِ وَهُدًى وَّمَوْعِظَةٌ لِّلْمُتَّقِيْنَ | اٰلِ عمران ۱۳۸ | |
| ۳۱- | وَلَا تَهِنُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَاَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ | اٰلِ عمران ۱۳۹ | ۳۱۳ |
| ۳۲- | لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ بَعَثَ فِيْهِمْ رَسُوْلًا | اٰلِ عمران ۱۶۴ | ۲۲۸ |
| ۳۳- | فَانْقَلَبُوْا بِنِعْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ وَفَضْلٍ لَّمْ | اٰلِ عمران ۱۷۴ | ۷۴ |

| نمبر شمار | ابتدا الآیۃ | حوالہ | صفحہ کتاب |
|---|---|---|---|
| | يَمْسَسْهُمْ سُوْٓءٌ..... | آل عمران ۱۷۴ | |
| ۳۴- | اَلَّذِيْنَ يَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ قِيَامًا وَّقُعُوْدًا وَّعَلٰى جُنُوْبِهِمْ وَيَتَفَكَّرُوْنَ فِيْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ | آل عمران، ۱۹۱ | ۵۹ |
| ۳۵- | يٰاَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمُ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ | النساء، ۱ | ۲۷۲ |
| ۳۶- | فَكَيْفَ اِذَا جِئْنَا مِنْ كُلِّ اُمَّةٍۭ بِشَهِيْدٍ وَّجِئْنَا بِكَ | النساء، ۴۱ | ۱۹۶ |
| ۳۷- | اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ يُزَكُّوْنَ اَنْفُسَهُمْ ؕ بَلِ اللّٰهُ يُزَكِّيْ مَنْ يَّشَآءُ | النساء، ۴۹ | ۹۴ |
| ۳۸- | اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُكُمْ اَنْ تُؤَدُّوا الْاَمٰنٰتِ اِلٰٓى اَهْلِهَا | النساء، ۵۸ | ۳۵۲ |
| ۳۹- | يٰاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِي الْاَمْرِ مِنْكُمْ فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِيْ شَيْءٍ | النساء، ۵۹ | ۳۵۲ |

| نمبر شمار | ابتداء الآیۃ | حوالہ | صفحہ کتاب |
|---|---|---|---|
| ۴۰- | وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا لِيُطَاعَ بِاِذْنِ اللّٰهِ | النساء، ۶۴ | ۱۹۵ |
| ۴۱- | فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُوْنَ حَتّٰى يُحَكِّمُوْكَ فِيْمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ | النساء، ۶۵ | ۲۸۶ |
| ۴۲- | وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ فَاُولٰٓئِكَ مَعَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنَ النَّبِيّٖنَ | النساء، ۶۹ | ۱۹۱ |
| ۴۳- | فَلْيُقَاتِلْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ الَّذِيْنَ يَشْرُوْنَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا بِالْاٰخِرَةِ | النساء، ۷۴ | ۳۱۰ |
| ۴۴- | وَمَا لَكُمْ لَا تُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَالْمُسْتَضْعَفِيْنَ مِنَ الرِّجَالِ وَالنِّسَآءِ | النساء، ۷۵ | ۳۱۱ |
| ۴۵- | اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۚ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا | النساء، ۷۶ | ۳۰۹ |
| ۴۶- | مَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ ۚ | النساء، ۸۰ | ۲۰۲ |

| نمبر شمار | ابتداء الآیۃ | حوالہ | صفحہ کتاب |
|---|---|---|---|
| ۴۷- | لَا خَيْرَ فِي كَثِيرٍ مِّن نَّجْوَاهُمْ إِلَّا مَنْ أَمَرَ بِصَدَقَةٍ ـ وَمَنْ يَفْعَلْ ذَٰلِكَ ابْتِغَاءَ | النساء، ۱۱۴ | ۷۴ |
| ۴۸- | وَمَن يُشَاقِقِ الرَّسُولَ مِن بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُ الْهُدَىٰ | النساء، ۱۱۵ | ۱۹۳ |
| ۴۹- | اَلْيَوْمَ أَكْمَلْتُ لَكُمْ دِينَكُمْ وَأَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِي | المائدہ، ۳ | ۳۲۶ |
| ۵۰- | قَدْ جَاءَكُم مِّنَ اللَّهِ نُورٌ وَكِتَابٌ مُّبِينٌ | المائدہ، ۱۵ | ۸۶ |
| ۵۱- | يَهْدِي بِهِ اللَّهُ مَنِ اتَّبَعَ رِضْوَانَهُ سُبُلَ السَّلَامِ | المائدہ، ۱۶ | ۸۶ |
| ۵۲- | مَن قَتَلَ نَفْسًا بِغَيْرِ نَفْسٍ أَوْ فَسَادٍ فِي الْأَرْضِ | المائدہ، ۳۲ | ۲۷۶ |
| ۵۳- | وَأَنزَلْنَا إِلَيْكَ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ ...... لِكُلٍّ جَعَلْنَا مِنكُمْ شِرْعَةً وَمِنْهَاجًا | المائدہ، ۴۸ | ۳۲۸ |
| ۵۴- | يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا مَن يَرْتَدَّ مِنكُمْ عَن دِينِهِ ..... فَسَوْفَ | المائدہ، ۵۴ | ۱۱۶ |

| نمبر شمار | ابتداء الآیۃ | حوالہ | صفحہ کتاب |
|---|---|---|---|
| | یاتی اللّٰہ بقوم | | |
| ۵۵۔ | لیس علی الذین اٰمنوا وعملوا الصّٰلحٰت جناح فیما طعموا ۔۔ ثم اتقوا واٰمنوا ثم اتقوا واحسنوا۔۔۔۔ | المائدہ، ۹۳ | ۱۱۹ |
| ۵۶۔ | ولا تطرد الذین یدعون ربھم بالغداوۃ والعشی یریدون وجھہ | الانعام، ۵۲ | ۸۵ |
| ۵۷۔ | ووھبنا لہ اسحٰق ویعقوب کلا ھدینا ونوحا ھدینا من قبل | الانعام، ۸۵ | ۱۲۴ |
| ۵۸۔ | وزکریا ویحیی وعیسٰی والیاس | الانعام، ۸۶ | ۱۲۶ |
| ۵۹۔ | واسمٰعیل والیسع ویونس ولوطا | الانعام، ۸۷ | ۱۲۶ |
| ۶۰۔ | ومن اٰبائھم وذریٰتھم واخوانھم | الانعام، ۸۸ | ۱۲۶ |
| ۶۱۔ | ذالک ھدی اللّٰہ یھدی بہ من یشاء | الانعام، ۸۹ | ۱۲۶ |

| صفحہ کتاب | حوالہ | ابتداء الآیۃ | نمبر شمار |
|---|---|---|---|
| ۱۲۷ | الانعام، ۹۱ | اُولٰٓئِكَ الَّذِیْنَ هَدَى اللّٰهُ فَبِهُدٰىهُمُ اقْتَدِهْ | ۶۲- |
| ۲۷۳ | الانعام، ۹۹ | وَ هُوَ الَّذِیْٓ اَنْشَاَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ.... | ۶۳- |
| ۳۹ | الاعراف، ۱۶ | قَالَ فَبِمَآ اَغْوَیْتَنِیْ لَاَقْعُدَنَّ لَهُمْ صِرَاطَكَ الْمُسْتَقِیْمَ | ۶۴- |
| ۱۱۹ | الاعراف، ۵۶ | اِنَّ رَحْمَتَ اللّٰهِ قَرِیْبٌ مِّنَ الْمُحْسِنِیْنَ | ۶۵- |
| ۹۸ | الاعراف، ۱۷۲ | وَاِذْ اَخَذَ رَبُّكَ مِنْ بَنِیْٓ اٰدَمَ.... اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ | ۶۶- |
| ۲۷۴ | الاعراف، ۱۸۹ | هُوَ الَّذِیْ خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ | ۶۷- |
| ۳۰۹ | الانفال، ۷۰ | وَاِذْ یَعِدُكُمُ اللّٰهُ اِحْدَى الطَّآئِفَتَیْنِ اَنَّهَا لَكُمْ | ۶۸- |
| ۳۱۰ | الانفال، ۸ | وَیُرِیْدُ اللّٰهُ اَنْ یُّحِقَّ الْحَقَّ بِكَلِمٰتِهٖ لِیُحِقَّ الْحَقَّ وَیُبْطِلَ الْبَاطِلَ وَلَوْ كَرِهَ الْمُجْرِمُوْنَ | ۶۹- |
| ۳۲۲ | الانفال، ۲۶ | وَاذْكُرُوْٓا اِذْ اَنْتُمْ قَلِیْلٌ مُّسْتَضْعَفُوْنَ فِی الْاَرْضِ.... | ۷۰- |

| نمبر شمار | ابتداء الآیۃ | حوالہ | صفحہ کتاب |
|---|---|---|---|
| ۷۱- | وَقَاتِلُوهُمْ حَتّٰى لَا تَكُونَ فِتْنَةٌ وَّيَكُونَ الدِّينُ كُلُّهُ لِلّٰهِ | الانفال، (۳۹) | ۳۰۹ |
| ۷۲- | قَاتِلُوهُمْ يُعَذِّبْهُمُ اللّٰهُ بِاَيْدِيكُمْ وَيُخْزِهِمْ .... | التوبۃ، ۱۴ | ۳۱۰ |
| ۷۳- | اَلَّذِينَ اٰمَنُوا وَهَاجَرُوا وَ جٰهَدُوا فِي سَبِيلِ اللّٰهِ | التوبۃ، ۲۰ | ۴۲ |
| ۷۴- | يُبَشِّرُهُمْ رَبُّهُمْ بِرَحْمَةٍ مِّنْهُ وَرِضْوَانٍ | التوبۃ، ۲۱ | ۴۲ |
| ۷۵- | هُوَ الَّذِي اَرْسَلَ رَسُولَهُ بِالْهُدٰى وَدِينِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهُ عَلَى الدِّينِ | التوبۃ، ۳۳ الصف، ۹ | ۳۲۲ |
| ۷۶- | وَعَدَ اللّٰهُ الْمُؤْمِنِينَ وَالْمُؤْمِنٰتِ... وَرِضْوَانٌ مِّنَ اللّٰهِ اَكْبَرُ... | التوبۃ، ۷۲ | ۴۲ |
| ۷۷- | يَا اَيُّهَا النَّبِيُّ جَاهِدِ الْكُفَّارَ | التوبۃ، ۷۳ | ۳۱۲ |
| ۷۸- | وَمِنَ الْاَعْرَابِ مَنْ يُّؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ | التوبۃ، ۹۹ | ۱۸۲ |
| ۷۹- | وَالسّٰبِقُونَ الْاَوَّلُونَ مِنَ الْمُهٰجِرِينَ وَالْاَنْصَارِ | التوبۃ، ۱۰۰ | ۱۸۳ |
| ۸۰- | خُذْ مِنْ اَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً | التوبۃ، ۱۰۳ | ۱۵۳ |

| نمبر شمار | ابتداء الآیہ | حوالہ | صفحہ کتاب |
|---|---|---|---|
| | تطہرہم وتزکیہم بہا | | |
| ۸۱۔ | الم یعلموا ان اللہ ہو یقبل التوبۃ عن عبادہ | التوبۃ، ۱۰۴ | ۱۵۷ |
| ۸۲۔ | وقل اعملوا فسیری اللہ عملکم ورسولہ | التوبۃ، ۱۰۵ | ۱۵۷ |
| ۸۳۔ | یایہا الذین امنوا اتقوا اللہ وکونوا مع الصدقین | التوبۃ، ۱۱۹ | ۸۵ |
| ۸۴۔ | ان اللہ لا یضیع اجر المحسنین | التوبۃ، ۱۲۰ | ۱۱۹ |
| ۸۵۔ | فما امن لموسی الا ذریۃ من قومہ علی خوف من فرعون وملائہم | یونس، ۸۳ | ۳۲۶ |
| ۸۶۔ | ام یقولون افترہ ..... فعلی اجرامی وانا بری | ہود، ۳۵ | ۱۲۰ |
| ۸۷۔ | یقوم لا اسئلکم علیہ اجرا ان اجری الا علی الذی | ہود، ۵۱ | ۱۳۱ |
| ۸۸۔ | ولما بلغ اشدہ اتینہ حکما وعلما | یوسف، ۲۲ | ۱۲۸ |
| ۸۹۔ | وما ابری نفسی ان النفس لامارۃ بالسوء | یوسف، ۵۳ | ۱۰۶ |
| ۹۰۔ | قال اجعلنی علی خزائن الارض | یوسف، ۵۵ | ۳۲۸ |

| نمبر شمار | ابتداء الآیۃ | حوالہ | صفحہ کتاب |
| --- | --- | --- | --- |
| | إِنِّي حَفِيظٌ عَلِيمٌ | | |
| ۹۱- | نُصِيبُ بِرَحْمَتِنَا مَنْ نَشَاءُ | یوسف، ۵۶ | ۳۴۹ |
| ۹۲- | الٓرٰ كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ اِلَيْكَ لِتُخْرِجَ النَّاسَ مِنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ .... | ابراهیم، ۲ ، ۱ | ۵۸ |
| ۹۳- | لَاُغْوِيَنَّهُمْ اَجْمَعِيْنَ | الحجر ۳۹، ص ۸۲ | ۵۲ |
| ۹۴- | اِلَّا عِبَادَكَ مِنْهُمُ الْمُخْلَصِيْنَ ۝ | الحجر ۴۰، ص ۸۳ | ۵۲ |
| ۹۵- | اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ وَاِيْتَآئِ ذِي الْقُرْبٰى | النحل، ۹۰ | ۱۱۱ |
| ۹۶- | وَضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا قَرْيَةً كَانَتْ اٰمِنَةً مُّطْمَئِنَّةً يَّاْتِيْهَا رِزْقُهَا رَغَدًا | النحل، ۱۱۲ | ۳۰۲ |
| ۹۷- | اِنَّ هٰذَا الْقُرْاٰنَ يَهْدِيْ لِلَّتِيْ هِيَ اَقْوَمُ | بنی اسرائیل، ۹ | ۶۹ |
| ۹۸- | وَاِذَآ اَرَدْنَآ اَنْ نُّهْلِكَ قَرْيَةً اَمَرْنَا مُتْرَفِيْهَا | بنی اسرائیل، ۱۶ | ۳۵۱ |
| ۹۹- | وَلَا تَقْتُلُوْٓا اَوْلَادَكُمْ | بنی اسرائیل، ۳۱ | ۳۰۲ |

| نمبر شمار | ابتداء الآیۃ | حوالہ | صفحہ کتاب |
|---|---|---|---|
| | خَشْیَۃَ اِمْلَاقٍ .... | | |
| ۱۰۰- | وَلَا تَقْرَبُوا الزِّنٰٓی اِنَّہٗ کَانَ فَاحِشَۃً وَّ سَاۗءَ سَبِیْلًا ۝ | بنی اسرائیل، ۳۲ | ۳۰۴ |
| ۱۰۱- | وَلَا تَقْرَبُوْا مَالَ الْیَتِیْمِ اِلَّا بِالَّتِیْ ھِیَ اَحْسَنُ | بنی اسرائیل، ۳۴ | ۳۰۵ |
| ۱۰۲- | وَاَوْفُوا الْکَیْلَ اِذَا کِلْتُمْ وَزِنُوْا بِالْقِسْطَاسِ الْمُسْتَقِیْمِ | بنی اسرائیل، ۳۵ | ۱۰۶ |
| ۱۰۳- | وَلَا تَقْفُ مَا لَیْسَ لَکَ بِہٖ عِلْمٌ ۭ اِنَّ السَّمْعَ وَالْبَصَرَ | بنی اسرائیل، ۳۶ | ۳۰۷ |
| ۱۰۴- | وَلَا تَمْشِ فِی الْاَرْضِ مَرَحًا ۚ اِنَّکَ لَنْ تَخْرِقَ الْاَرْضَ | بنی اسرائیل، ۳۷ | ۳۰۷ |
| ۱۰۵- | کُلُّ ذٰلِکَ کَانَ سَیِّئُہٗ عِنْدَ رَبِّکَ مَکْرُوْھًا ۝ | بنی اسرائیل، ۳۸ | ۳۰۸ |
| ۱۰۶- | وَمِنَ الَّیْلِ فَتَھَجَّدْ بِہٖ ..... عَسٰٓی اَنْ یَّبْعَثَکَ | بنی اسرائیل، ۷۹ | ۱۹۹ |
| ۱۰۷- | وَلَقَدْ کَرَّمْنَا بَنِیْٓ اٰدَمَ وَ حَمَلْنٰھُمْ فِی الْبَرِّ | بنی اسرائیل، ۷۰ | ۲۷۵ |
| ۱۰۸- | وَقُلْ رَّبِّ اَدْخِلْنِیْ مُدْخَلَ صِدْقٍ وَّاَخْرِجْنِیْ مُخْرَجَ | بنی اسرائیل، ۸۰ | ۲۴۹ |

| نمبر شمار | ابتداء الآیۃ | حوالہ | صفحہ کتاب |
|---|---|---|---|
| ۱۰۹- | وَقُلْ جَآءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ | بنی اسرائیل، ۸۱ | ۳۲۸ |
| ۱۱۰- | وَاصْبِرْ نَفْسَكَ مَعَ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَدٰوةِ وَالْعَشِيِّ | کہف، ۲۸ | ۸۵ |
| ۱۱۱- | فَانْطَلَقَا حَتّٰى اِذَا لَقِيَا غُلٰمًا فَقَتَلَهٗ قَالَ اَقَتَلْتَ نَفْسًا | کہف، ۷۴ | ۹۳ |
| ۱۱۲- | قَالَ اِنَّمَا اَنَا رَسُوْلُ رَبِّكِ لِاَهَبَ لَكِ غُلٰمًا زَكِيًّا | مریم، ۱۹ | ۹۳ |
| ۱۱۳- | اِذْهَبْ اِلٰى فِرْعَوْنَ اِنَّهٗ طَغٰى | طٰہٰ، ۲۴ | ۳۴۶ |
| ۱۱۴- | اِذْهَبَا اِلٰى فِرْعَوْنَ اِنَّهٗ طَغٰى | طٰہٰ، ۴۳ | ۳۴۸ |
| ۱۱۵- | فَاْتِيٰهُ فَقُوْلَآ اِنَّا رَسُوْلَا رَبِّكَ | طٰہٰ، ۴۷ | ۳۴۸ |
| ۱۱۶- | وَمَا خَلَقْنَا السَّمَآءَ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا لٰعِبِيْنَ | الانبیآء، ۱۶ | ۶۰ |
| ۱۱۷- | اِنَّ هٰذِهٖٓ اُمَّتُكُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً وَّاَنَا رَبُّكُمْ | الانبیآء، ۹۲ | ۲۷۳ |

| نمبر شمار | ابتداء الآیہ | حوالہ | صفحہ کتاب |
|---|---|---|---|
| | فَاعْبُدُوْنِ | | |
| ۱۱۸- | اَلَّذِیْنَ اُخْرِجُوْا مِنْ دِیَارِهِمْ ............ وَلَوْلَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ | الحج، ۴۰ | ۳۴۵ |
| ۱۱۹- | اَلَّذِیْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِی الْاَرْضِ | الحج، ۴۱ | ۳۴۵ |
| ۱۲۰- | اِنَّ هٰذِهٖۤ اُمَّتُكُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً وَّاَنَا رَبُّكُمْ فَاتَّقُوْنِ | المومنون، ۵۲ | ۲۷۳ |
| ۱۲۱- | رِجَالٌ لَّا تُلْهِیْهِمْ تِجَارَةٌ وَّلَا بَیْعٌ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ وَ اِقَامِ الصَّلٰوةِ | النور، ۳۷ | ۸۲ |
| ۱۲۲- | وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَیَسْتَخْلِفَنَّهُمْ | النور، ۵۵ | ۳۴۳ |
| ۱۲۳- | فَتَبَسَّمَ ضَاحِكًا مِّنْ قَوْلِهَا وَقَالَ رَبِّ اَوْزِعْنِیْۤ اَنْ اَشْكُرَ | النمل، ۱۹ | ۷۶ |
| ۱۲۴- | وَلَمَّا بَلَغَ اَشُدَّهٗ وَاسْتَوٰۤى اٰتَیْنٰهُ حُكْمًا وَّعِلْمًا | القصص، ۱۴ | ۱۲۸ |
| ۱۲۵- | وَالَّذِیْنَ جٰهَدُوْا فِیْنَا | عنکبوت، ۶۹ | ۱۲۰ |

| نمبر شمار | ابتداء الآیۃ | حوالہ | صفحہ کتاب |
|---|---|---|---|
| | لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا | | |
| ۱۲۶- | لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللّٰهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ | الاحزاب، ۲۱ | ۲۰۲ |
| ۱۲۷- | وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَّلَا مُؤْمِنَةٍ إِذَا قَضَى اللّٰهُ وَرَسُولُهٗ أَمْرًا | الاحزاب، ۳۶ | ۲۸۱ |
| ۱۲۸- | مَا كَانَ مُحَمَّدٌ أَبَا أَحَدٍ مِّنْ رِّجَالِكُمْ وَلٰكِنْ رَّسُولَ اللّٰهِ | الاحزاب، ۴۰ | ۲۸۳ |
| ۱۲۹- | وَمَنْ تَزَكّٰى فَإِنَّمَا يَتَزَكّٰى لِنَفْسِهٖ | فاطر، ۱۸ | ۹۳ |
| ۱۳۰- | سَلٰمٌ عَلٰى نُوحٍ فِي الْعٰلَمِينَ | الصّٰفّٰت، ۷۹ | ۱۲۸ |
| ۱۳۱- | إِنَّا كَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِينَ | الصّٰفّٰت، ۸۰ | ۱۲۸ |
| ۱۳۲- | إِنَّهٗ مِنْ عِبَادِنَا الْمُؤْمِنِينَ | الصّٰفّٰت، ۸۱ | ۱۲۹ |
| ۱۳۳- | وَنَادَيْنٰهُ أَنْ يّٰإِبْرٰهِيمُ قَدْ صَدَّقْتَ الرُّؤْيَا إِنَّا كَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِينَ ۝ | الصّٰفّٰت، ۱۰۴، ۱۰۵ | ۲۹ |
| ۱۳۴- | وَمَا خَلَقْنَا السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا لٰعِبِينَ | الدخان، ۳۸ | ۶۰ |
| ۱۳۵- | مَا خَلَقْنٰهُمَا إِلَّا بِالْحَقِّ | الدخان، ۳۹ | |
| ۱۳۶- | اَللّٰهُ يَجْتَبِيٓ إِلَيْهِ مَنْ يَّشَاءُ وَيَهْدِيٓ | الشوریٰ، ۱۳ | ۸۳ |

| نمبر شمار | ابتداء الآیہ | حوالہ | صفحہ کتاب |
|---|---|---|---|
| ۱۳۷ | وَاِنَّهٗ لَذِكْرٌ لَّكَ وَلِقَوْمِكَ | الزخرف، ۴۴ | ۲۶۱ |
| ۱۳۸ | وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَاٰمَنُوْا بِمَا نُزِّلَ عَلٰى مُحَمَّدٍ | محمّد، ۲ | ۲۸۳ |
| ۱۳۹ | فَلَا تَهِنُوْا وَتَدْعُوْٓا اِلَى السَّلْمِ | محمّد، ۳۵ | ۳۱۲ |
| ۱۴۰ | لَقَدْ رَضِيَ اللّٰهُ عَنِ الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ يُبَايِعُوْنَكَ | الفتح، ۱۸ | ۷۵ |
| ۱۴۱ | مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗٓ اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ | الفتح، ۲۹ | ۸۰ |
| ۱۴۲ | يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ وَّاُنْثٰى | الحجرات، ۱۳ | ۲۷۴ |
| ۱۴۳ | وَفِيْٓ اَمْوَالِهِمْ حَقٌّ لِّلسَّآئِلِ وَالْمَحْرُوْمِ ۝ | الذّٰریٰت، ۱۹ | ۱۷۱ |
| ۱۴۴ | وَذَكِّرْ فَاِنَّ الذِّكْرٰى تَنْفَعُ الْمُؤْمِنِيْنَ | الذّٰریٰت، ۵۵ | ۶۵ |
| ۱۴۵ | وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ | الذّٰریٰت، ۵۶ | ۶۵ |
| ۱۴۶ | مَآ اُرِيْدُ مِنْهُمْ مِّنْ رِّزْقٍ وَّمَآ اُرِيْدُ اَنْ يُّطْعِمُوْنِ ۝ | الذّٰریٰت، ۵۷ | ۶۵ |
| ۱۴۷ | اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الرَّزَّاقُ ذُو الْقُوَّةِ الْمَتِيْنُ | الذّٰریٰت، ۵۸ | ۶۵ |

| نمبر شمار | ابتدا الآیۃ | حوالہ | صفحہ کتاب |
|---|---|---|---|
| ۱۴۸ | فَلَا تُزَكُّوْٓا اَنْفُسَكُمْ ط هُوَ اَعْلَمُ بِمَنِ اتَّقٰى ۝ | النجم، ۳۲ | ۹۱ |
| ۱۴۹ | هَلْ جَزَآءُ الْاِحْسَانِ اِلَّا الْاِحْسَانُ ۝ | الرحمٰن، ۶۰ | ۱۱۸ |
| ۱۵۰ | لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنٰتِ وَاَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتٰبَ | الحدید، ۲۵ | ۳۴۱ |
| ۱۵۱ | ثُمَّ قَفَّيْنَا عَلٰٓى اٰثَارِهِمْ بِرُسُلِنَا وَقَفَّيْنَا بِعِيْسَى ابْنِ مَرْيَمَ | الحدید، ۲۷ | ۷۸ |
| ۱۵۲ | كَتَبَ اللّٰهُ لَاَغْلِبَنَّ اَنَا وَرُسُلِيْ | المجادلۃ، ۲۱ | ۳۲۲ |
| ۱۵۳ | لَا تَجِدُ قَوْمًا.... اُولٰٓئِكَ حِزْبُ اللّٰهِ اَلَآ اِنَّ حِزْبَ اللّٰهِ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ | المجادلۃ، ۲۲ | ۳۲۰ |
| ۱۵۴ | فَاعْتَبِرُوْا يٰٓاُولِي الْاَبْصَارِ | الحشر، ۲ | ۱۸۴ |
| ۱۵۵ | مَآ اَفَآءَ اللّٰهُ عَلٰى ... وَمَآ اٰتٰىكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ وَمَا نَهٰىكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا | الحشر، ۷ | ۳۳۶ |
| ۱۵۶ | لِلْفُقَرَآءِ الْمُهٰجِرِيْنَ الَّذِيْنَ اُخْرِجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ وَاَمْوَالِهِمْ | الحشر، ۸ | ۲۳۴ |

| نمبر شمار | ابتداء الآیۃ | حوالہ | صفحہ کتاب |
|---|---|---|---|
| ۱۵۷ | وَالَّذِيْنَ تَبَوَّؤُ الدَّارَ وَالْاِيْمَانَ مِنْ قَبْلِهِمْ | اَلحشر، ۹ | ۲۲۳ |
| ۱۵۸ | قَدْ كَانَتْ لَكُمْ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ فِيْٓ اِبْرَاهِيْمَ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗ | الممتحنہ، ۴ | ۱۹۱ |
| ۱۵۹ | وَاَنْفِقُوْا مِمَّا رَزَقْنٰكُمْ مِّنْ قَبْلِ اَنْ يَّاْتِيَ اَحَدَكُمُ الْمَوْتُ | اَلْمُنَافقون، ۱۰ | ۱۴۲ |
| ۱۶۰ | يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَا تَعْتَذِرُوا الْيَوْمَ اِنَّمَا تُجْزَوْنَ مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ | التحریم، ۷ | ۱۰۰ |
| ۱۶۱ | اَلَّذِيْ خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَيٰوةَ | الملک، ۲ | ۷۰ |
| ۱۶۲ | وَالَّذِيْنَ فِيْٓ اَمْوَالِهِمْ حَقٌّ مَّعْلُوْمٌ لِّلسَّآئِلِ وَالْمَحْرُوْمِ | المعارج، ۲۴/۲۵ | ۲۱۹ |
| ۱۶۳ | اِنَّ هٰذِهٖ تَذْكِرَةٌ | المزمّل، ۱۹ | ۲۵۹ |
| ۱۶۴ | بَلِ الْاِنْسَانُ عَلٰى نَفْسِهٖ بَصِيْرَةٌ | القیامۃ، ۱۴ | ۱۰۰ |
| ۱۶۵ | يُوْفُوْنَ بِالنَّذْرِ وَيَخَافُوْنَ يَوْمًا كَانَ شَرُّهٗ مُسْتَطِيْرًا | الدھر، ۷ | ۲۳۷ |
| ۱۶۶ | وَيُطْعِمُوْنَ الطَّعَامَ عَلٰى حُبِّهٖ مِسْكِيْنًا | الدھر، ۸ | ۲۳۶ |
| ۱۶۷ | اِنَّمَا نُطْعِمُكُمْ لِوَجْهِ اللّٰهِ | الدھر، ۹ | ۲۳۶ |

| نمبر شمار | ابتداء الآیۃ | حوالہ | صفحہ کتاب |
|---|---|---|---|
| | لَا نُرِيدُ مِنكُمْ | | |
| ۱۶۸ | إِنَّا نَخَافُ مِن رَّبِّنَا يَوْمًا | الدھر، ۱۰ | ۱۶۹ |
| ۱۶۹ | قَدْ أَفْلَحَ مَن تَزَكَّىٰ | الاعلیٰ، ۱۴ | ۹۶ |
| ۱۷۰ | وَذَكَرَ اسْمَ رَبِّهِ فَصَلَّىٰ | الاعلیٰ، ۱۵ | ۹۶ |
| ۱۷۱ | كَلَّا بَل لَّا تُكْرِمُونَ الْيَتِيمَ | الفجر، ۱۷ | ۱۷۹ |
| ۱۷۲ | وَلَا تَحَاضُّونَ عَلَىٰ طَعَامِ الْمِسْكِينِ | الفجر، ۱۸ | ۱۷۹ |
| ۱۷۳ | وَتَأْكُلُونَ التُّرَاثَ أَكْلًا لَّمًّا | الفجر، ۱۹ | ۱۷۹ |
| ۱۷۴ | وَتُحِبُّونَ الْمَالَ حُبًّا جَمًّا | الفجر، ۲۰ | ۱۷۹ |
| ۱۷۵ | يَا أَيَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ | الفجر، ۲۷ | ۷۲ |
| ۱۷۶ | ارْجِعِي إِلَىٰ رَبِّكِ رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً | الفجر، ۲۸ | ۷۲ |
| ۱۷۷ | فَادْخُلِي فِي عِبَادِي | الفجر، ۲۹ | ۷۲ |
| ۱۷۸ | وَادْخُلِي جَنَّتِي | الفجر، ۳۰ | ۷۲ |
| ۱۷۹ | وَهَدَيْنَاهُ النَّجْدَيْنِ | البلد، ۱۰ | ۹۹ |
| ۱۸۰ | فَلَا اقْتَحَمَ الْعَقَبَةَ ۝ وَمَا أَدْرَاكَ مَا الْعَقَبَةُ ۝ فَكُّ رَقَبَةٍ ۝ أَوْ مِسْكِينًا ذَا مَتْرَبَةٍ | البلد، ۱۱، ۱۲، ۱۶ | ۱۷۹ |
| ۱۸۱ | فَأَلْهَمَهَا فُجُورَهَا وَتَقْوَاهَا | الشمس، ۸ | ۹۹ |

| نمبر شمار | ابتداءِ آیہ | حوالہ | صفحہ نمبر |
|---|---|---|---|
| ۱۸۲ | قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰىهَا | الشمس ، ۹ | ۹۵ |
| ۱۸۳ | وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰىهَا | الشمس ، ۱۰ | ۵ |
| ۱۸۴ | وَالَّيْلِ اِذَا يَغْشٰى | اللیل ، ۱ | ۹۶ |
| ۱۸۵ | وَالنَّهَارِ اِذَا تَجَلّٰى | اللیل ، ۲ | ۹۳ |
| ۱۸۶ | وَمَا خَلَقَ الذَّكَرَ وَالْاُنْثٰٓى | اللیل ، ۳ | ۹۲ |
| ۱۸۷ | اِنَّ سَعْيَكُمْ لَشَتّٰى | اللیل ، ۴ | ۱۶۷ |
| ۱۸۸ | فَاَمَّا مَنْ اَعْطٰى وَاتَّقٰى | اللیل ، ۵ | ۱۶۷ |
| ۱۸۹ | وَصَدَّقَ بِالْحُسْنٰى | اللیل ، ۶ | ۱۶۷ |
| ۱۹۰ | فَسَنُيَسِّرُهٗ لِلْيُسْرٰى | اللیل ، ۷ | ۱۶۷ |
| ۱۹۱ | وَاَمَّا مَنْ بَخِلَ وَاسْتَغْنٰى | اللیل ، ۸ | ۱۶۷ |
| ۱۹۲ | وَكَذَّبَ بِالْحُسْنٰى | اللیل ، ۹ | ۱۶۷ |
| ۱۹۳ | فَسَنُيَسِّرُهٗ لِلْعُسْرٰى | اللیل ، ۱۰ | ۱۶۷ |
| ۱۹۴ | وَسَيُجَنَّبُهَا الْاَتْقَى | اللیل ، ۱۷ | ۱۶۷ / |
| ۱۹۵ | الَّذِىْ يُؤْتِىْ مَالَهٗ يَتَزَكّٰى | اللیل ، ۱۸ | ۱۶۷ |
| ۱۹۶ | وَمَا لِاَحَدٍ عِنْدَهٗ مِنْ نِّعْمَةٍ تُجْزٰٓى | اللیل ، ۱۹ | ۱۶۷ |
| ۱۹۷ | اِلَّا ابْتِغَآءَ وَجْهِ رَبِّهِ الْاَعْلٰى | اللیل ، ۲۰ | ۲۲۳ |
| ۱۹۸ | وَلَسَوْفَ يَرْضٰى | اللیل ، ۲۱ | ۱۶۵ |
| ۱۹۹ | وَلَسَوْفَ يُعْطِيْكَ رَبُّكَ فَتَرْضٰى | الضحیٰ ، ۵ | ۲۸۳ |
| ۲۰۰ | وَوَجَدَكَ عَآئِلًا فَاَغْنٰى | الضحیٰ ، ۸ | ۲۱۶ |

| صفحہ کتاب | حوالہ | ابتداء الآیہ | نمبر شمار |
|---|---|---|---|
| ۲۰۶ | الضحیٰ، ۹ | فَاَمَّا الْيَتِيْمَ فَلَا تَقْهَرْ | ۲۰۱ |
| ۲۰۶ | الضحیٰ، ۱۰ | وَاَمَّا السَّآئِلَ فَلَا تَنْهَرْ | ۲۰۲ |
| ۲۱۵ | الضحیٰ، ۱۱ | وَاَمَّا بِنِعْمَةِ رَبِّكَ فَحَدِّثْ | ۲۰۳ |
| ۱۶۹ | الماعون، ۱ | اَرَءَيْتَ الَّذِىْ يُكَذِّبُ بِالدِّيْنِ | ۲۰۴ |
| ۱۶۹ | الماعون، ۲ | فَذٰلِكَ الَّذِىْ يَدُعُّ الْيَتِيْمَ | ۲۰۵ |
| ۱۶۹ | الماعون، ۳ | وَلَا يَحُضُّ عَلٰى طَعَامِ الْمِسْكِيْنِ | ۲۰۶ |
| ۱۶۹ | الماعون، ۴ | فَوَيْلٌ لِّلْمُصَلِّيْنَ | ۲۰۷ |
| ۱۶۹ | الماعون، ۵ | اَلَّذِيْنَ هُمْ عَنْ صَلَاتِهِمْ سَاهُوْنَ ۝ | ۲۰۸ |
| ۱۶۹ | الماعون، ۶–۷ | اَلَّذِيْنَ هُمْ يُرَآءُوْنَ ۝ وَ يَمْنَعُوْنَ الْمَاعُوْنَ | ۲۰۹ |

# اَحادیثِ مُبارکہ

| نمبر شمار | ابتداء الحدیث | حوالہ | صفحۂ کتاب |
| --- | --- | --- | --- |
| ۱ | انّ الیہ تسعون الف درہم فوضعت علی حصیر فما ردّ سائلًا | ترمذی، الوفا باحوالِ المصطفٰی ۲ : ۳۳۲، مطبوعہ لاہور | |
| ۲ | اُذکر الحال الّتی فارق عَلَیھا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وَاللہ ما شبع من خبزٍ وّلحمٍ مرّتین | الترمذی، ۲ : ۵۸ | |
| ۳ | اُرسلت اِلیَ الخلق کافّۃً و خُتم بھا النبیّون | مسلم، ۱ : ۱۹۹<br>مشکوٰۃ، ۵۱۲ | |
| ۴ | اَلَا اُنبّئکُم بخیارکم قالوا بلیٰ یا رسُول اللہ قال خیارکُم الّذین اِذَا رُءُوا ذکر اللہ | ابن ماجہ، مشکوٰۃ ۳۲۶ | |
| ۵ | اَلَسْتُمْ فِی طَعَامٍ وّشَرَابٍ ما شِئْتُم لَقَد رَأَیتُ نبیّکُم صلی اللہ عَلَیہِ وَسلم ما یجد من الدّقل ما | ترمذی، ۲ : ۹۰ | |

| نمبر شمار | ابتداء الحدیث | حوالہ | صفحہ کتاب |
|---|---|---|---|
| | يملاء بطنه | | |
| ۶ | اَمَرَنَا رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَنْ نتصدق ووافق عِنْدِي مَالًا | ترمذی، ۲: ۲۰۸ | |
| ۷ | اَنَا اوّل النّاس خروجًا اذا بعثوا وَاَنَا قائدهم اذا وفدوا وانا خطيبهم اذا اَنصتوا | ترمذی، ۲: ۲۰۱، مشکوٰۃ، ۵۱۳ | |
| ۸ | اَنَا وَكافل اليتيم فِي الجنّةِ هٰكذا | ابوداؤد، ۲: ۳۳۵، مشکوٰۃ، ۴۲۲، مسلم، ۲: ۴۱۱ | |
| ۹ | اِنَّ اَبَا بَكْرٍ يَوْمَ اَسْلَمَ لَهُ اربعون الف دينارٍ فانفقها على رسول الله صلى الله عليه وسلم | ابن عساکر بحوالہ تاریخ الخلفاء، ۳۹ | |
| ۱۰ | اِنَّا كُنَّا آل محمد نمكث شهرًا مانستوقد بنارٍ ان هُوَ الا التمر والماء | شمائل ترمذی: ۳۱، ابن ماجہ: ۳۱۵ | |
| ۱۱ | اِنَّ دِمَاءَكُم وَاموالكم واعراضكم حرامٌ عليكم كحرمةِ يومكم هٰذا | بخاری، ۱: ۱۶ | |
| ۱۲ | اِنَّ اللّٰهَ اِذَا اَحَبَّ عَبْدًا دعا | مسلم، ۲: ۳۳۱، مشکوٰۃ، ۴۲۵ | |

| نمبر شمار | ابتداء الآیۃ | حوالہ | صفحہ کتاب |
|---|---|---|---|
| | جِبْرِیْلَ فَقَالَ اِنِّیْ اُحِبُّ فُلَانًا فَاحِبَّہٗ | | |
| ۱۳ | اِنَّ اللّٰہَ یَقْرَءُ عَلَیْکَ السَّلَامَ وَیَقُوْلُ قُلْ لَہٗ اَرَاضٍ اَنْتَ عَنِّیْ فِیْ فَقْرِکَ ھٰذَا اَمْ سَاخِطٌ | ابونعیم، بغوی، ابن عساکر بحوالہ تاریخ الخلفاء، ۳۹ | |
| ۱۴ | اِنَّمَا اَنَا قَاسِمٌ وَاللّٰہُ یُعْطِیْ | بخاری، ۱: ۱۶ | |
| ۱۵ | اِنَّمَا الاعمال بالنیات | بخاری، ۱: ۲ | |
| ۱۶ | اَنَّہٗ سُئِلَ عَنِ الْجَارِ فَقَالَ اَرْبَعِیْنَ خلقہ | الادب المفرد، ۳۸ | |
| ۱۷ | بعثت بجوامع الکلم ونصرت بالرعب وبینا انا نائم رأیتنی اُتیت بمفاتیح خزائن الارض | بخاری، ۲: ۱۰۸۰ | |
| ۱۸ | جَاءَ عثمان اِلَی النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بالف دینار فرأیت النبی یقلبہا | ترمذی، ۲: ۲۱۱ | |
| ۱۹ | جُعِلَتْ قُرَّۃُ عَیْنِیْ فِی الصَّلٰوۃ | مسند احمد، نسائی ۲: ۹۳<br>مشکوٰۃ، ۴۴۹ | |

| نمبر شمار | ابتداء الحدیث | حوالہ | صفحہ کتاب |
| --- | --- | --- | --- |
| ۲۰ | المحبّ فِی اللہ والبغض فِی اللہ | ابوداؤد بحوالہ مشکوٰۃ کتاب الایمان : ۱۵ | |
| ۲۱ | خَرَجَ النَّبِیُّ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وَسَلَّمَ مِنَ الدّنیا ولم یشبع من خبز الشَّعِیر | بخاری، ۲ : ۸۱۵ | |
| ۲۲ | خَرَجَ النّبی صلی اللہ علیہ وسلم مِن الدّنیا ولم یشبع هُوَ وَ اهل بیتہ من خبز الشعیر | البخاری<br>الشفاء، ص ۸۳ | |
| ۲۳ | خیر الصَّدَقَۃ مَا کانَ عَن ظَهْرِ غِنیٰ | ابوداؤد، ۱ : ۲۳۶<br>مشکوٰۃ، ۱۷۰ | |
| ۲۴ | السّاعی علی الارملۃ وَالمِسکین کالمجاھد فی سبیل اللہ | بخاری، ۲ : ۸۸۸<br>مسلم، ۲ : ۴۱۱ | |
| ۲۵ | شکونا الیٰ رَسُوْلِ اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم من الجوع فرفعنا (عن بطونھا) عن حجرٍ حجرٍ فَرَفَعَ رسول اللہ صَلّی اللہ علیہ وَسَلم عن بطنہٖ عن حجرین | ترمذی، ۲ : ۶۰ | |

| نمبر شمار | ابتداء الحدیث | حوالہ | صفحہ کتب |
|---|---|---|---|
| ٢٦ | صَلُّوا كَمَا رَأَيْتُمُونِي أُصَلِّي | مشکوٰۃ، کتاب الصلوٰۃ ٦٦<br>بخاری، ٢ : ٨٨٨ | |
| ٢٧ | ضحایاکم لا یصبح أحدکم<br>بعد ثالثۃٍ و فی بیتہ منہ شیٌ | الادب المفرد،<br>١٣٨ | |
| ٢٨ | فانا رأیتُ رسُول اللہ علیہ وسلم<br>ینزل عن المنبر وھو یقول ما<br>علیٰ عثمان ما عمل بعد ھٰذہٖ | ترمذی، ٢١١،<br>مشکوٰۃ، ٥٦١ | |
| ٢٩ | فَاِنَّ خیر الحَدِیث کِتٰبُ اللہ<br>وَخَیرُ الھُدی ھدی مُحَمَّدٍ | مشکوٰۃ، ١٩ | |
| ٣٠ | فبکیٰ ابوبکرٍ وقال ھل اَنَا<br>وَمَالِی اِلَّا لکَ یارَسول اللہ | مسند احمد بن حنبل،<br>بحوالہ تاریخ الخلفاء ٢٨ | |
| ٣١ | فَقَال مَا ظَنّ نبیُّ اللہ لو لَقِیَ<br>عَزَّ وَجَلَّ و ھٰذہٖ عِنْدَہٗ | مسند احمد،<br>مشکوٰۃ، ترمذی | |
| ٣٢ | فَلَمَّا فَتَحَ اللہ علیہ الفتوح قام<br>فقال انا اولیٰ بالمؤمِنِینَ مِنْ<br>انفُسِھِمْ | بخاری، ١ : ١٣٨ | |
| ٣٣ | فَلَمَّا نزلت ھٰذہِ الآیۃ<br>لن تنالوا البِرَّ.... قام ابوطلحہ | بخاری، ٢ : ٢٥٣ | |
| ٣٤ | الا لا فضل لِعَرَبِیٍّ علیٰ عجمِیٍّ<br>ولا لعجمِیٍّ علیٰ عَرَبِیٍّ ولا لاحمر | مسند احمد،<br>٥ : ٤١١ | |

| نمبر شمار | ابتداء الحدیث | حوالہ | صفحۂ کتاب |
|---|---|---|---|
| | علی اسود ولا اسود علی احمر | | |
| ۳۵ | فَمَنْ اَطَاعَ مُحَمَّدًا فَقَدْ اَطَاعَ اللہ وَمَنْ عَصٰی مُحَمَّدًا فَقَدْ عَصَی اللہ محمد فرق بین النَّاس | بخاری، ۲: ۱۰۸۱ | |
| ۳۶ | فَوَاللہ لو اَنَّ اللہ لم یفرجھا ما ترکت اھل بیت المسلمین لھم سعۃ | الادب المفرد، ۱۴۷ | |
| ۳۷ | قَالَ رئیت رسول اللہ یطوف بالکعبۃ ویقول | ابن ماجہ، ۲۹۰ | |
| ۳۸ | قَالَ خطّ لَنَا رَسُوْلُ اللہ صَلَّی اللہ علیہ وَسَلَّم | مسند احمد، الدارمی، النسائی بحوالہ مشکوٰۃ، ۳۰ | |
| ۳۹ | قد سمعت کلامکم وعجبکم انَّ ابراھیم خلیل اللہ وَھُوَ کذالک | ترمذی، ۲: ۲۰۲<br>مشکوٰۃ، ۵۱۳ | |
| ۴۰ | کَانَ ابن عمر لا یاکل حَتّٰی یُؤتیٰ بمسکین یاکل معہٗ | البخاری، ۲: ۸۱۲ | |
| ۴۱ | کَانَ رَسُوْلُ اللہ صلی اللہ علیہ وَ اٰلِہٖ وَسَلَّم یقضی فِیْ مَالِ اَبِیْ بکرٍ کما یقضِیْ فِیْ مالِہٖ | مسند ابی یعلی بحوالہ تاریخ الخلفاء: ۳۸ | |

| نمبر شمار | ابتداء الحدیث | حوالہ | صفحہ کتاب |
|---|---|---|---|
| ۴۲ | کان کلّ نبيّ يبعث إلىٰ قومه خاصّة و بعثت الى كلّ احمر و اسود | مسلم، ۱: ۱۹۹ | |
| ۴۳ | كان النبيّ لا يدخر شيئاً لغد | ترمذی، ۲: ۵۹<br>الوفا باحوال المصطفٰے، ۲، ۲۳۲ | |
| ۴۴ | کان یاتی علی آل محمد الشهر لم یری فی بیت من بیوته | ابن ماجہ، ۳۱۵ | |
| ۴۵ | کان رسول الله صلی الله علیه وسلم یبیت اللیالی المتتابعة طاویاً | ترمذی، ۲: ۵۹ | |
| ۴۶ | کل المسلم علی المسلم حرام دمهٗ و مالهٗ و عرضهٗ | مشکوٰۃ، ۴۲۲ | |
| ۴۷ | کل مولود یولد علی الفطرة | ابوداؤد، ۲: ۲۹۲ | |
| ۴۸ | کنّا نعدّ الماعون علیٰ عهد رسول الله عاریة الدلو والقدر | ابوداؤد، ۱، ۲۳۴ | |
| ۴۹ | لا إسلامَ إلّا بالجماعة ولا جماعةَ إلّا بالإمارة | قولِ عمر، جامع العلم، ۱: ۶۲ | |

| نمبر شمار | ابتداء الحدیث | حوالہ | صفحہ کتاب |
| --- | --- | --- | --- |
| ۵۰ | لَا یُؤْمِنُ احدُکُم حَتّٰی یَکُوْنَ هَوٰ یٰهُ تَبعًا لِمَا جِئْتُ بِهٖ | شرح السنۃ بحوالہ مشکوٰۃ : ۳۱ | |
| ۵۱ | لقد اُخفت فی اللهِ وَمَا یُخَاف احدٌ ولقد اُوْذِیتُ فی الله | ترمذی، ۲ : ۷۰ مشکوٰۃ، ۴۴۸ | |
| | لَوکانَ لی مثل احدٍ الذَّهبَ | | |
| ۵۲ | تَسُرَّنِی ان لَّا یمرَّ علیّ ثلاث لیالٍ وَّعندی مِنه شیءٌ | بخاری، ۲ : ۹۵۴ | |
| ۵۳ | لَیس الْغِنٰی عن کثرة الْعَرَضِ وَلکِنَّ الغِنٰی غنَی النفس | ترمذی، ۲ : ۶۰ بخاری، ۲ : ۹۵۴ | |
| ۵۴ | لَیس لابن اٰدم حق فی سوای هٰذه الخصال بیتٌ یسکنهٗ | ترمذی، ۲ : ۵۷ | |
| ۵۵ | لیس المؤمن بالّذی یشبع وجاره جائعٌ اِلٰی جنبه | البیهقی، مشکوٰۃ: ۴۲۴ | |
| ۵۶ | مَا اَبقیتَ لاهلك قَال ابقیت لهم الله وَرَسُولهٗ | ترمذی، ۲ : ۲۰۸، مشکوٰۃ : ۵۵۶ | |
| ۵۷ | مَا الاِحْسَان ؟ قَالَ ان تعبد الله کانّكَ تراهُ فان لَّم تکُن تراهُ فانّهٗ یراك | بخاری، ۱ : ۱۲ | |
| ۵۸ | مَارَاَیتُ احدًا قَطّ بعدَ رَسُول الله من حین قبض کان اجدّ | بخاری، ۲ : ۵۲۱ | |

| صفحہ کتاب | حوالہ | ابتداء الحدیث | نمبر شمار |
|---|---|---|---|
| | شمائل ترمذی، ٣١ | مَا جَآءَ بِكَ يَا اَبَابَكْرٍ فَقَالَ خَرَجْتُ اَلقى رَسُوْلَ الله صلی اللہ علیہ وَسلم | ٥٩ |
| | مسلم، ٢ : ٢٥٣ | مَا سُئِلَ رسولُ الله صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم شيئاً قَطُّ فَقَالَ لَا | ٦٠ |
| | شمائل ترمذی، ١٠، مشکوٰۃ، ٤٤٦ | مَا شَبِعَ آلُ محمّدٍ مِن خُبزِ الشَّعِيرِ يومَينِ مُتَتَابِعَين حتّٰى قبضَ | ٦١ |
| | ترمذی، ٢ : ٥٩ | مَا شَبِعَ رَسُوْلُ الله صَلّى الله عليه وَسَلم واهلهٗ ثلاثًا تباعاً مِن خُبزِ البُرّ حتّٰى فارق الدنيا | ٦٢ |
| | ترمذی، ٢ : ٢٠٦ | مَالِاَحدٍ عندنا يدٌ اِلَّا وقد كافيناهُ ماخلا ابا بكرٍ | ٦٣ |
| | مسلم، ٢ : ٣٣٦ | مَا مِن مَولودٍ اِلَّا يُولَدُ عَلَى الفطرة .... فابواهُ يهوّدانه | ٦٤ |
| | مسلم، ٢ : ٣٢١ | مثل المؤمنين فِي توادّهم وَ تراحمهم وَ تعاطفهم كمثل الجسد الواحد | ٦٥ |
| | ابوداؤد، ١ : ٢٣٤ | مَن كَانَ عندهٗ فضلُ ظهرٍ | ٦٦ |

| نمبر شمار | ابتداء الحدیث | حوالہ | صفحہ کتاب |
|---|---|---|---|
| | فلیعد بهٖ علیٰ مَنْ لَا ظَهرَ لَهٗ | ابوداؤد، ١ : ٢٣٤ | |
| ٦٧ | من کان فِی حاجةِ اخیه کانَ اللہ فی حاجته | ابوداؤد، ٢ : ٣١٤ | |
| ٦٨ | من کان لِلّٰهِ کانَ اللہ لهٗ | احیاء علوم الدین، | |
| ٦٩ | من لا یرحم لا یرحم | مسلم، ٢ : ٢٥٤، بخاری ٢ : ٨٨٩ | |
| ٧٠ | المؤمن من امنه النّاس علی اموالهم وانفسهم | الترمذی، مشکوٰة، کتاب الایمان: ١٥، حدیث ٢٩ نسائی، ٢ : ٢٣٠ | |
| ٧١ | المؤمنون کرجلٍ وّاحدٍ ان اشتکٰی عینهٗ اشتکٰی کُلّه | مسلم، ٢ : ٣٢١ | |
| ٧٢ | وَالّذِی نَفْسِی بیدہٖ لَا یُؤمِن عَبْدٌ (او احدکم) حتّٰی یُحِبَّ لاخیهِ مَا یُحِبُّ لنفسهٖ | بخاری، ١ : ٦، مشکوٰة، ٤٢٢ | |
| ٧٣ | یابن آدم ان تبذل الفضل خیرٌ لک وان تمسکه شرٌّ لک | ترمذی، ٢ : ٥٧ | |
| ٧٤ | یارسول اللہ اصبت هٰذہٖ من معدن فخذها فهی صَدَقة | ابوداؤد، ١ : ٢٣٦ | |
| ٧٥ | یا عائشة لا تردی المساکین ولو بشقِ تمرة یا عائشة احبی المساکین | ترمذی، ٢ : ٥٨، مشکوٰة، ٤٤٧ | |